تاریکیاں

بھیشم ساہنی

ہندوستانی کتابوں کا سلسلہ

تاریکیاں

تاریکیاں

از

بھیشم ساہنی

مترجم

شہلا نقوی

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

بلراج جی کے لیے

دیباچہ

بھیشم ساہنی سماجی شعور کی روایت کے کہانی کار ہیں "پریکشا گورو" سے یہ روایت شروع ہوتی ہے اور پریم چند کے افسانوی ادب میں زیادہ واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ سماجی شعور ادبی تخلیق کو سماج کے لیے مفید اور بامقصد بناتا ہے اور تخلیق کو وسیع تر معنویت اور ہمہ گیری عطا کرتا ہے۔ شعور اور حقیقت کا امتزاج فنکارانہ صلاحیت کو ابھارتا اور فنکار کی بصیرت میں اضافہ کرتا ہے۔ پریم چند نے خارجی حقائق اور داخلی کیفیت کو باہم سمو کر ایسی فنی دنیا کی تعمیر کی تھی جو قرینِ قیاس اور حقیقت سے زیادہ قریب معلوم ہوتی تھی۔ یہ دنیا اپنے ارد گرد کی زندہ اشیاء پر مبنی ہونے کے سبب زیادہ پرکشش ہوگئی ہے۔ یہ ہمیں اپنی ہی دنیا معلوم ہوتی ہے۔ پریم چند کے تصور کی یہ دنیا عالمی سطح کی ہے یا نہیں اور اس کی فنکارانہ ساخت اعلیٰ درجے کی ہے یا نہیں، یہ سوال بجائے خود اتنا اہم نہیں جتنا یہ سوال کہ پریم چند کی یہ دنیا ہماری اپنی دنیا ہے یا نہیں۔ اور یہ بات کسی پس وپیش کے بغیر کہی جاسکتی ہے کہ وہ ہماری اپنی ہی دنیا ہے۔ اس کی فنکارانہ خوبی اس کی پچی کاری میں نہیں بلکہ اس بات میں ہے کہ اس وسیع وعریض دنیا کو اس کے فطری انداز میں منعکس و مصوّر کیا گیا ہے۔ اس کی منظرکشی ایک وسیع مرغزار کی تصویر کشی ہے کسی چھوٹے سے باغیچے کی عکاسی نہیں۔

پریم چند کے فکر و شعور کی یہ روایت ان کے بعد بھی جاری رہی "نفسیاتی" کہے جانے والے ناولوں کی فراوانی کے باوجود پریم چند کا سماجی شعور کا دھارا اپنی رو میں بہتا رہا۔ یش پال، اشک، امرت لال ناگر، امرت رائے، بھگوتی چرن ورما، بھیرو پرشاد گپتا وغیرہ اپنی اپنی اہلیت اور بصیرت کے مطابق مختلف و متفرق سماجی موضوعات سے اپنی فکری دنیا کی تعمیر کرتے رہے اور قاری کو اپنے وقت کے ساتھ جوڑتے رہے۔ آزادی کے بعد کے زمانے میں متعدد ناول دیہی عوام کی زندگی کو ایک پس منظر کے طور پر استعمال کر کے ہندوستانی گاؤں کے وسیع حقائق کی تصویر کشی کرنے لگے۔ ساتھ ہی سماجی بیداری کے چند علمبردار مصنف شہر کی مجلسی زندگی کو موضوع بنا کر اس زندگی سے متعلق فنکارانہ دستاویز پیش کرنے لگے۔ سماجی زندگی اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود اپنی بقا کے لیے چند اخلاقی اقدار کی طرف راغب رہتی ہے اس لیے سماجی بیداری کے علمبردار کہانی کار یا مجموعی

طور پر تمام فنکار اپنی حقیقت نگاری کے لیے انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے رشتہ جوڑتے ہیں چاہے یہ عمل مروجہ رنگ میں ہو یا غیر مقبول یا اجنبی رنگ میں۔

بھیشم ساہنی، پریم چند کی قائم کردہ روایت کے امین ہیں اور "تمس" (تاریکیاں) اسی روایت پر مبنی ایک اہم تخلیق ہے۔ "تمس" بھیشم ساہنی کا تیسرا ناول ہے۔ اس سے قبل ان کے دو ناول "جھروکے" اور "کڑیاں" شائع ہو چکے ہیں۔ یہ دونوں ہی ناول سماجی حقیقت نگاری اور نفسیاتی عکاسی کے امتزاج کو بڑی خوبی سے نمایاں کرتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر مصنّف فکری تناظر کو سماجی حقائق کے دباؤ کے تحت شناخت کرتا ہے اور اس طرح سماجی حقائق کو فکری بلندی عطا کرتا ہے۔ بھیشم کے افسانوی ادب میں اسی لیے دونوں کی آمیزش لطیف انداز میں نمایاں ہوتی ہے۔ وہ نہ تو محض سماجی حقائق کی وسعتوں میں دوڑ لگاتے ہیں اور نہ خالص فکری پیچیدگی میں الجھتے ہیں۔ دونوں کے امتزاج سے ابھرنے والی چیز ہی درحقیقت ان کی تخلیق کی روح بنتی ہے۔ "جھروکے" میں ایک بچّے کی ذہنی کیفیت اور اس کے خاندان میں پیش آنے والے واقعات کی آویزش ہے۔ "کڑیاں" میں قدیم رسم و رواج اور نئے تصورات کی باہمی کشمکش کو منعکس کیا گیا ہے۔ مصنّف نے ایک طرف تو پرمیلا نامی ایک عورت کی زندگی کو اس کے مخصوص معاشرتی ماحول سے ملے سنسکاروں، اس کے حالات میں ہولناک تبدیلیوں، معاشی بدحالی کے تحت اس کی لاچاری، تکالیف اور محرومیوں کے ساتھ پیش کیا ہے، تو دوسری طرف اس کے باطن میں اٹھتی، خود کفیل بننے کی جدوجہد کرتی، ایک نئی عورت کو بھی دریافت کیا ہے۔

"تمس" کی دنیا ان دونوں ناولوں سے مختلف اور وسیع تر ہے۔ اس میں مصنّف وقت اور زمانہ کے لحاظ سے کچھ پیچھے کی طرف گیا ہے۔ اس ناول میں اس نے حصول آزادی سے کچھ پہلے کے زمانے کا انتخاب کیا ہے اور اس کے بطن میں کلبلاتے فرقہ وارانہ تعصّب کے خوفناک واقعات اور ان کے راست اور بالواسطہ اثرات کی نشان دہی کی ہے۔ مصنّف نے تاریخ کی اس تلخ سچائی کا اظہار بڑے فنکارانہ انداز میں کیا ہے کہ انگریزوں نے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کی غرض سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے متعدد سازشیں کیں۔ وہ لالچ اور خوف دونوں سے کام لے کر دیش کے اتحاد کو پارہ پارہ کرتے رہے اور جب یہ ملک چھوڑنے کی نوبت آئی تب بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے بلکہ ان کی یہ حرکتیں اور تیز ہو گئیں۔ ان ہی کے فریب کا نتیجہ تھا کہ کانگرس ہندوؤں کی جماعت مان لی گئی اور جناح کی قیادت میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک پاکستان کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ ہندوستان میں سے پاکستان کا بن جانا بجائے خود ایک معمولی واقعہ نہیں بلکہ وہ اپنے اندر، ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین شدید بدگمانی، نفرت، مارکاٹ اور ایسے ہی متعدد غیر انسانی محرکات

کی داستانیں چھپائے ہوئے ہے۔ وہ اپنے پیچھے بھی ایک ایسی تعصب کی آگ چھوڑ گیا ہے جو اب بھی زہریلا دھواں پھینکتی رہتی ہے، اور بے بسی اور مظلومیت کی دل خراش صدائیں سناتی ہے۔ انگریزوں کی اس تاریخی لیکن وحشیانہ سازش کے آلہ کار بنتے تھے اپنے ہی دیس کے کچھ مذہبی جنون کے مارے جاہل اور لالچی لوگ۔ یہ تھوڑے سے آدمی بھیڑ میں پتھر پھینک کر چھپ جاتے تھے اور بھیڑ میں شامل دیگر لوگ ایک دوسرے کے خلاف بدگمانی اور بے اعتمادی کے شکار ہو کر آپس میں لڑنے لگتے تھے، لہولہان ہو جاتے تھے۔

"تمس" میں اسی تلخ حقیقت سے وابستہ کردار ہیں، اور ان ہی باتوں سے متعلق حوالے ہیں۔ اس میں واقعات ہیں، ماحول ہے۔ ایک بات واضح ہو جانی چاہیئے کہ اس ناول میں سادگی تو ہے لیکن یہ خشک سادگی نہیں۔ مصنف نے سرسری طور پر اپنے کرداروں کی خانہ بندی نہیں کی ہے۔ یہ کردار اپنی سادگی کے باوجود مضبوط اور مستحکم ہیں۔ عام طور پر سب ہی کرداروں میں اندرونی کشمکش سے پیدا ہونے والا تناؤ ہے، جو انھیں زیادہ قرینِ قیاس اور زندہ کردار بناتا ہے۔

یہ ناول بنیادی طور پر سیاسی شعور کا ناول ہے لیکن یہ اپنے آپ کو سیاسی مباحث اور ایک تخیلی دنیا کے قیام تک محدود نہیں کرتا۔ یہ سیاسی بددیانتی سے پیدا شدہ سماجی ہولناکیوں تک لے جاتا ہے۔ وہ قاری کے ذہن کو مجلسی اور تہذیبی تعلقات کے چرمرانے، ٹوٹنے اور انسانیت کے لہولہان ہو جانے کے تجربات سے روشناس کراتا ہے۔ مختصر طور پر کہانی اتنی ہے کہ جناح کی صحیح یا غلط فکر کے نتیجے میں کانگرس ہندوؤں کی جماعت مان لی جاتی ہے اور مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کے طور پر آگے بڑھتی ہے۔ ان کے ساتھ ہی ہندوؤں کی ایک علیحدہ جماعت بھی ابھر رہی ہے۔ وان پرستھی جی کی تقریروں سے اس نئی جماعت کے قیام میں مدد ملتی ہے۔ مراد علی (انگریز کے اشارے پر) نتھو سے ایک سور مروا کر مسجد کے سامنے پھینکوا دیتا ہے۔ بس پھر کیا تھا، فضا میں آہستہ آہستہ ایک فرقہ وارانہ جنون پھیلنے لگتا ہے اور افواہوں کا بازار گرم ہو جاتا ہے اصلیت معلوم کیے بغیر، ہندو، مسلمان ایک دوسرے کے خلاف شک و شبہ اور خوف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کانگرس، مسلم لیگ اور ہندو سبھا کے نمائندے مل کر انگریز ڈپٹی کمشنر رچرڈ سے ملنے جاتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ وہ فساد روکنے کے لیے قبل از وقت کارروائی کرے۔ رچرڈ پہلے تو کہتا ہے: یہ آپ لوگوں کا مذہبی معاملہ ہے، میں کیا کر سکتا ہوں۔ پھر دباؤ ڈالنے پر گول مول جواب دیتا ہے: "سرکار اپنی طرف سے جو کارروائی کر سکتی ہے، وہ ضرور کرے گی۔" لوگ مایوس ہو کر واپس آتے ہیں۔ فساد پھیلنے لگتا ہے، مار کاٹ ہوتی ہے۔ فساد شہر سے گاؤں کی طرف بڑھتا ہے اور صدیوں سے بھائیوں کی طرح رہتے آئے سکھوں اور مسلمانوں کو توڑ پھوڑ کر برباد کر ڈالتا ہے۔ بالآخر سرکار کا ایک ہوائی جہاز فساد زدہ گاؤں کے اوپر سے

پرواز کرتا ہے اور گاؤں میں پھیلی مار کاٹ اس کی دہشت سے ہی بند ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد شہر میں ایک امن کمیٹی کا قیام عمل میں آتا ہے اور پھر رچرڈ کو اپنے ترقی پر تبادلے کی خبر ملتی ہے۔

مصنف نے اس کہانی میں متعدد اندرونی و بیرونی عوامل شامل کیے ہیں اور ان کی آمیزش سے ایک مضبوط و مربوط پلاٹ کی تخلیق کی ہے۔ رچرڈ اس کہانی کا ایک اہم کردار ہے۔ وہ حکومت کا نمائندہ ہے حکومت کے نمائندے تو بہت سے انگریز رہے ہوں گے لیکن رچرڈ ایک خاص قسم کے انگریزوں کا نمونہ ہے۔ وہ ہندوستانی تاریخ کا عاشق ہے۔ ہندوستان کی تاریخ اور سماج کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے اور اس کی تلاش و تحقیق میں ہمیشہ مصروف رہتا ہے۔ اس کے تحقیقی ذوق کی وجہ سے ہی اس کی بیوی لیزا اکتاہٹ محسوس کرتی ہے۔ ایک بار اکتا کر وہ انگلینڈ بھی چلی گئی تھی۔ اب دوبارہ آئی ہے۔ لیزا کو محسوس ہوتا ہے کہ "اس (رچرڈ) میں بچوں کا سا جوش و خروش ہے۔ ڈپٹی کمشنر ہوتے کے باوجود ایک قسم کا بھولا پن ہے۔" وہ بہ ظاہر بہت اچھا آدمی ہے۔ اپنے عملے کے آدمیوں کے ساتھ اس کا سلوک اچھا ہے لیکن درحقیقت وہ مکار ہے۔ شہر میں کشیدگی کی خبر ملنے پر لیزا پوچھتی ہے "پھر تم کیا کروگے رچرڈ؟"...."مجھے کیا کرنا چاہیے لیزا؟ میں حکومت کروں گا اور کیا کروں گا؟" ہندوستان کے عاشق رچرڈ کی ہندوستان کے ساتھ محبت محض کتابی ہے سطحی ہے۔ اندر ہی اندر وہ چاہتا ہے کہ یہاں کے ہندو مسلمان آپس میں لڑتے رہیں تاکہ حکومت خاطر خواہ چلتی رہے۔ لیزا پوچھتی ہے "تمھیں کوئی خطرہ تو نہیں ہے رچرڈ؟" تو رچرڈ جواب دیتا ہے "نہیں لیزا۔ اگر رعیت آپس میں لڑے تو حاکم کو کس بات کا خطرہ ہے۔" وہ یہ بات سمجھتا ہے کہ حکومت کرنے والے یہ نہیں دیکھتے کہ رعیت میں کون سی یکسانیت پائی جاتی ہے، ان کی دلچسپی تو یہ دیکھنے میں ہوتی ہے کہ وہ کن کن باتوں میں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ہندوستان سے محبت کرنے اور ہندوستان کی تاریخ سے خاص واقفیت رکھنے کا دعویٰ کرنے والا رچرڈ بھی حکمرانی کے سارے گُر جانتا ہے اور ان کا استعمال بھی کرتا ہے۔ اس کی حاکمانہ سخت گیری اور سنگدلی اس کی ظاہری نیک سیرتی سے مل کر اور بھی مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ مصنف نے اس کے انفرادی اور طبقاتی کردار کو یک جا کر کے ایک پراسرار شخصیت کی ہی تعمیر نہیں کی بلکہ عوام پر اس کے اثرات کو بھی فنکارانہ خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے۔

مصنف نے کانگرس، مسلم لیگ، ہندو سنگھا اور کمیونسٹ پارٹی کے کرداروں کے اوصاف بھی نمایاں کیے ہیں۔ کانگرس کے مقامی لیڈر بخشی جی ہیں۔ وہ کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر پربھات پھیری لگاتے ہیں۔ ان کی جمعیت میں مختلف مزاجوں، پیشوں اور مختلف اغراض و مقاصد والے آدمی شامل ہیں۔ وہ

لوگ باہم ٹکراتے رہتے ہیں۔ پھر بھی ایک ساتھ پربھات پھیری میں شریک ہوتے ہیں اور اپنی پارٹی کے پروگرام پر عمل کرنے کی رسم نبھاتے ہیں۔ ان میں سے ایک جرنیل سنگھ ہے جو پاگل سا ہے کیونکہ اس میں سچائی کی خاطر قربانی کا جذبہ ہے۔ وہ لاگ لپیٹ کے بغیر سچ بولتا ہے۔ سچ کہتا ہے اور سچ کے لیے جان دے دیتا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ نوجوانوں کو مصنّف نے صحیح معنوں میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے عملی جدوجہد کرتے دکھایا ہے۔ اس اشتعال زدہ ماحول میں کوئی شخص ان نوجوانوں کی بات نہیں اور بھائی کے لیے ان کی کوشش کامیاب نہیں ہوتی۔ مسلم لیگ اور ہندو سنگھٹھا کے فرقہ وارانہ کردار کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ وہ لوگ بھی محض بدگمانی اور خوف کے شکار ہو کر ایک دوسرے کے خلاف تیاریاں کرتے ہیں۔ یعنی ان کی ایک دوسرے کے خلاف تبردآزمائی کا ایک سبب موجود ہے۔ مصنّف نے انھیں بے سبب اشتعال زدہ نہیں دکھایا ہے۔ ایک دوسرے کے ڈر سے ہی ان کے مابین کشیدگی پیدا ہوتی ہے، لیکن جہاں کمیونسٹ پارٹی عمل کی سطح پر اور کانگرس جذبات کی سطح پر اس خوف کو دور کر کے لوگوں میں تحفظ اور اطمینان کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں وہاں دونوں فرقہ پرست جماعتیں خوف کے سبب تصادم اور بیزاری کی طرف بڑھتی ہیں۔

مصنّف نے اس زمانے کے فرقہ وارانہ جنون اور اس کے خوفناک وحشیانہ اثرات کی حقیقت کو ایک فنکار کی گہری نظر سے دیکھا ہے اور ان کی تصویر کشی کی ہے لیکن اس کی انسانیت پرست نگاہ نے اس بھیانک بدنظمی اور خوں ریز ہنگاموں کے درمیان سے انسان کو ڈھونڈھ نکالا ہے۔ اس نے انسانیت کے دل کی دھڑکن سنی ہے۔ ایک طبقے کے درمیان بھی اور ایک آدمی کے اندر بھی نتھو کچھ سوچے سمجھے بغیر سور کو مار تو دیتا ہے لیکن فساد پھوٹ پڑنے پر احساس جرم کے بوجھ سے دبنے لگتا ہے۔ ضمیر کی خلش اسے مسلسل بے چین رکھتی ہے۔ جہاں ایک گاؤں کے باشندے آپس میں لڑ رہے ہیں، اکثریتی فرقہ کے لوگ اپنے دکھ سکھ سے وابستہ اقلیتی فرقہ کے لوگوں کا خاتمہ کر رہے ہیں وہاں مظلوموں کو مخالف فرقے کے اجنبی لوگ سہارا بھی دے رہے ہیں۔ ہرنام سنگھ اور بنتو اپنے گاؤں سے بھاگنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کی دکان پھونک دی جاتی ہے لیکن راجو اپنے لیگی بیٹے کے خوف کے باوجود ان دونوں کو پناہ دیتی ہے۔ ان کی حفاظت کرتی ہے اور چپکے سے آگے چھوڑ آتی ہے۔ ایسے متعدد واقعات اور کردار ہیں۔ شاہ نواز ایسا ہی مسلمان ہے جو اپنے ہندو دوستوں کی حفاظت کرتا ہے۔ لالہ لکشمی نرائن اور شیخ نور الٰہی دو مختلف خیالات والے انسان ہیں لیکن دونوں میں بہت بے تکلفی ہے۔ آخر میں قیام امن کی کوشش کے وقت بھی ان کے درمیان مذاق ہوتا رہتا ہے۔ انھیں اتنے پیار سے باتیں کرتے دیکھ کر سردار موہن سنگھ اپنے

ساتھی سے کہتا ہے: ہم سب کو یہیں رہنا چاہیئے اتحاد کے تصوّر کی بنیاد بھی تو یہی ہے مر مٹ کر بھی، لہو لہان ہو کر بھی ہمیں بالآخر آپس میں ملنا ہی ہے۔ یہ تصوّر ہم سب کی بھلائی کے لیے، اندرونی و بیرونی صحت کے لیے ضروری ہے"۔ فساد کے بعد جب شہر میں پناہ گزیں آتے ہیں اور مصیبت کی کہانیاں سناتے ہیں، اس وقت فرقہ وارانہ اشتعال کا ایک جنگل سا اُگ آتا ہے۔ اس جنگل کی تصویر کشی کرتے ہوئے بھی مصنف انسانی ہمدردی کے چند نقطے ابھارتا ہے اور نئی صورتِ حال سے پیدا شدہ ایک نئے شعور کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے مصنف مارکس وادی ہے لیکن اس پر مارکس وادی تبلیغ کا الزام کہیں بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ حقیقت حال کے صحیح احساس، نئے شعور کے خطوط کی شناخت اور انسانی اقدار کے پرچار کی شکل میں ہی اس کا مارکسی نقطہ نظر سامنے آتا ہے۔ حقیقت حال کے صحیح احساس کا ایک پہلو شہر اور گاؤں کے رشتے کی پہچان بھی ہے۔ فساد شہر سے ابھرا، لیکن سب سے زیادہ نقصان دیہات کا ہوا۔ مزدوروں اور کسانوں میں روزی روٹی کی ایکتا ہے، چاہے وہ کسی بھی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں لیکن یہ جنون اتنا بڑھ گیا تھا کہ روزی روٹی کے رشتے کا بھی خیال نہیں کیا گیا۔ پاپ کرتے ہیں شہر اور سزا بھگتتے ہیں گاؤں۔

اس دیباچے کے آغاز میں کہا گیا ہے کہ یہ ایک سیاسی ناول ہے لیکن سیاست کے تانے بانے کے اندر بھی مصنف حتی الامکان سماجی زندگی کے حقائق کی تہیں کھولتا ہے۔ وہ دل کے اندر بھی جھانکتا ہے اگرچہ اس کے زیادہ مواقع نہیں ہیں۔ اس لیے یہ ناول ان ناولوں کی طرح اپنا اثر نہیں چھوڑتا جو اپنے زمانے کی زندگی کو موضوع بنا کر سماجی، اقتصادی، سیاسی، تہذیبی اور نفسیاتی حقائق کی سخت گرہیں کھولتے ہیں اور لگاتار بسر ہوتی زندگی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ پھر بھی یہ ناول جس موضوع کو لے کر چلتا ہے اس کو بڑی خوبی سے پیش کرتا ہے۔ اور متعلقہ مسائل کا گہرا احساس بھی کراتا ہے۔

بھیشم جی خالص کہانی کار ہیں۔ کہانی کی منظر کشی، زبان وغیرہ کے معاملے میں وہ شاعرانہ طرزِ اظہار سے کام نہیں لیتے لیکن وہ کہانی بہت سلیقے سے کہتے ہیں۔ اس میں انوکھی سادگی ہوتی ہے۔ پلاٹ میں ربط استحکام ہوتا ہے۔ ایک فنکار کی گہری نظر سے وہ جگہ جگہ انسانی ذہن کی الجھنوں اور حقیقت حال کی نزاکتوں کو سبک دستی سے ابھارتے چلتے ہیں "تمس" میں بھی یہ خصوصیات دیکھی جا سکتی ہیں۔

رام درش مشر

1

آلے میں رکھے چراغ نے پھر سے جھپکی لی۔ دیوار میں چھت کے پاس سے دو اینٹیں نکلی ہوئی تھیں۔ جب جب وہاں سے ہوا کا جھونکا آتا، تو چراغ کی بتّی جھپک جاتی اور کوٹھری کی دیوار پر سائے سے لہرا جاتے۔ تھوڑی دیر بعد بتّی اپنے آپ سیدھی ہو جاتی اور اس میں سے اٹھنے والی دھوئیں کی لکیر آلے کو چاٹتی ہوئی پھر سے اوپر کی طرف سیدھے رخ جانے لگتی۔ نتھو کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے سانس کی وجہ سے ہی چراغ کی بتّی جھپکنے لگی ہے۔

نتھو دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اس کی نظر سؤر کی طرف اٹھ گئی۔ سؤر پھر سے لکیایا تھا اور اب کوٹھری کے بیچوں بیچ کچرے کے کسی لسلسے چھلکے پر منھ مار رہا تھا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں فرش پر اور گلابی سی تھوتھنی چھلکے پر جمائے ہوئے تھا۔ پچھلے دو گھنٹے سے نتھو اس بدرنگ، بدہیئت سؤر کے ساتھ جوجھ رہا تھا۔ سؤر کی کالی تھوتھنی تین بار اس کی ٹانگوں کو چاٹ چکی تھی، اور اس میں ہلکا ہلکا درد اٹھ رہا تھا۔ آنکھیں فرش پر گاڑے سؤر کبھی تو دیوار کے ساتھ چلنے لگتا، جیسے کسی چیز کو ڈھونڈھ رہا ہو، پھر اچانک لکیا کر بھاگنے لگتا۔ اس کی چھوٹی سی پونچھ، زہریلے ڈنک کی طرح پیٹھ پر ہلتی اور کبھی اس کا چھلّا بن جاتا، ایسا لگتا جیسے گانٹھ پڑ جائے گی۔ لیکن پھر وہ اپنے آپ ہی کبھی تو اس کی پونچھ کھل کر سیدھی ہو جاتی۔ بائیں آنکھ میں سے مواد بہہ بہہ کر سؤر کی تھوتھنی تک چلا آیا تھا۔ وہ جب چلتا تو اپنی بوجھل توند کی وجہ سے دائیں بائیں جھولنے سے لگتا تھا۔ بار بار بھاگنے سے کچرا ساری کوٹھری میں بکھر گیا تھا۔ کوٹھری میں حبس تھا۔ کچرے کی زہریلی بدبو، سؤر کے تیزی سے چلتے سانس، اور کڑوے تیل کے دھوئیں سے کوٹھری اٹی پڑی تھی۔ فرش پر جگہ جگہ خون کے دھبّے پڑ گئے تھے۔ لیکن چوٹ کے نام پر سؤر کے جسم میں ایک بھی زخم نہیں ہو پایا تھا۔ گذشتہ دو گھنٹے سے نتھو گویا پانی میں یا ریت کے ڈھیر میں چھرا گھونپتا رہا تھا۔ کتنی ہی بار وہ سؤر کے پیٹ میں اور کاندھوں پر چھرا گھونپ چکا تھا۔ چھرا نکالتا تو خون کی چند بوندیں فرش پر گر جاتیں لیکن زخم کے بجائے ایک چھوٹا سا دھبّا رہ جاتا جو سؤر کی چمڑی میں نظر بھی نہیں آتا تھا اور پھر سؤر غرّاتا ہوا آیا تو نتھو کی ٹانگوں کو اپنی

تھوتھنی کا نشانہ بناتا' یا پھر کمرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے یا بھاگنے لگتا تھا۔ چھرے کی نوک چربی کی تہوں کو کاٹ کر واپس آجاتی تھی، انتڑیوں تک پہنچ ہی نہ پاتی تھی۔

مارنے کو ملا بھی تو کیسا منحوس سؤر' بھدا' اتنی بڑی توند' پیٹھ کے بال کالے' تھوتھنی کے آس پاس کے بال سفید' کانٹوں کی طرح' جیسے سیہہ کے ہوتے ہیں۔

اس نے سنا تھا کہ سؤر کو مارنے کے لیے اس پر کھولتا پانی ڈالتے ہیں لیکن ننھو کے پاس کھولتا پانی کہاں تھا۔ ایک بار چمڑا صاف کرتے وقت سؤر کی چربی کی بات چلی تھی اور اس کے ساتھی بھیکو چمار نے کہا تھا۔ "سؤر کی پچھلی ٹانگ پکڑ کر سؤر کو الٹا کر دو۔ گرا ہوا سؤر جلدی سے نہیں اٹھ سکتا۔ پھر اس کے گلے کی نس کاٹ دو۔ سؤر مر جائے گا۔" ننھو یہ سب ہی ترکیبیں آزما چکا تھا۔ ایک بھی ترکیب کام نہیں آئی تھی۔ اس کے عوض اس کی اپنی ٹانگوں اور ٹخنوں پر زخم ہو چکے تھے۔ چمڑا صاف کرنا اور بات ہے' سؤر کو مارنا بالکل دوسری ہی بات۔ نہ جانے کس برے وقت یہ کام سر پر لے لیا تھا اور اگر پیشگی پیسے نہ لیے ہوتے تو ننھو نے سؤر کو اس کوٹھری سے کب کا دھکیل کر باہر کھدیڑ دیا ہوتا۔

"ہمارے سلوتری صاحب کو ایک مرا ہوا سؤر چاہیے' ڈاکٹری کام کے لیے۔" مراد علی نے ننھو سے کہا تھا' جب وہ کھال صاف کر چکنے کے بعد نل پر منھ ہاتھ دھو رہا تھا

"سؤر؟ کیا کرنا ہوگا مالک؟" ننھو نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

"ادھر پگری (Piggery) کے سؤر بہت گھومتے ہیں۔ ایک سؤر کو ادھر کوٹھری میں ہانک لاؤ اور کاٹ ڈالو۔"

ننھو نے آنکھ اٹھا کر مراد علی کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

"ہم نے کبھی سؤر نہیں مارا صاحب۔ اور سنتے ہیں سؤر مارنا بہت مشکل کام ہے۔ ہمارے بس کا نہیں ہے حضور۔ کھال وال اتارنے کا کام ہو تو کر دیں۔ مارنے کا کام تو پگری والے ہی کرتے ہیں۔"

"پگری والوں سے کرانا ہوتا تو تم سے کیوں کہتے۔ یہ کام تم ہی کرو گے۔" اور مراد علی نے پانچ روپے کا چرمراتا نوٹ جیب سے نکال کر اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کے بیچ میں ٹھونس دیا۔

"یہ تمھارے لیے بہت بڑا کام نہیں ہے۔ سلوتری صاحب کی فرمائش کو ہم کیسے منع کر دیتے۔" مراد علی نے لاپرواہی سے کہا۔ "ادھر مسان کے پاس پگری کے سؤر گھومتے ہیں۔ ایک کو پکڑ لو۔ سلوتری صاحب پگری والوں سے خود بات کر لیں گے۔"

اور اس سے پہلے کہ ننھو کچھ کہے مراد علی چلنے کو تیار ہوا۔ پھر اپنی پتلی سی چھڑی زمین پر ٹھکورتے ہوئے کہنے لگا:

"آج ہی رات یہ کام کر ڈالو۔ صبح سویرے جمعدار گاڑی لے کر آجائے گا، اس میں ڈلوا دینا۔ وہ اپنے آپ سلوتری کے گھر پہنچا دے گا۔ میں اس سے کہہ دوں گا۔ سمجھے؟"

نتھو کے ہاتھ ابھی تک بندھے تھے لیکن چرمراتا پانچ کا نوٹ جیب میں پڑ جانے کی وجہ سے منھ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔

"ادھر علاقہ مسلمانی ہے۔ کسی مسلمان نے دیکھ لیا تو لوگ بگڑیں گے۔ تم بھی دھیان رکھنا۔ ہمیں بھی یہ کام برا لگتا ہے۔ مگر کیا کریں، صاحب کا حکم ہے۔ کیسے انکار کریں۔" اور مراد علی چھڑی کو پھر ٹانگوں سے ٹھکورتا ہوا وہاں سے چلا گیا تھا۔

مراد علی سے روز کام پڑتا تھا۔ نتھو انکار کیسے کر دیتا۔ جب کبھی شہر میں گھوڑا مرتا، گائے یا بھینس مرتی تو مراد علی کھال دلوا دیا کرتا تھا۔ اٹھنی، روپیہ مراد علی کی بھی نذر کرنا پڑتا تھا، مگر کھال مل جاتی۔ بڑے رکھ رکھاؤ والا آدمی تھا مراد علی، کمیٹی کا کارندہ ہونے کی وجہ سے بڑے چھوٹے سب ہی لوگوں کو اس سے کام پڑتا تھا۔

شہر کی کوئی سڑک ایسی نہ تھی جس کے بیچوں بیچ لوگوں نے مراد علی کو چلتے نہ دیکھا ہو۔ پتلی بید کی چھڑی ہلاتا ہوا پستہ قد، سیاہ فام مراد علی جگہ جگہ گھومتا تھا۔ شہر کی کسی گلی میں، کسی سڑک پر کسی بھی وقت وہ نمودار ہو جاتا تھا۔ سانپ کی سی چھوٹی چھوٹی پینی آنکھیں اور کنٹیلی مونچھیں، گھٹنوں تک لمبا خاکی کوٹ اور شلوار اور سر پر پگڑی۔ یہ سب اسے زیب دیتے تھے۔ ان سب کو ملا کر ہی مراد علی کی مخصوص تصویر بنتی تھی۔ اگر ہاتھ میں پتلی چھڑی نہ ہوتی، یا سر پر پگڑی نہ ہوتی یا پھر اس کا قد پستہ نہ ہوتا تب اس کی شبیہ ادھوری رہ جاتی۔

مراد علی خود تو حکم چلا کر نکل گیا، نتھو کی جان مصیبت میں پڑ گئی۔ سؤر کہاں سے پکڑے اور اسے کاٹے کیسے۔ نتھو کے دل میں خیال آیا تھا کہ شہر کے باہر سیدھا پگری میں چلا جائے اور ان لوگوں سے کہہ دے کہ ایک سؤر کاٹ کر سلوتری صاحب کے گھر بھجوا دیں۔ مگر اس کے قدم پگری کی طرف نہیں اٹھے۔

سؤر کو کوٹھری کے اندر لانا کون سا آسان کام ثابت ہوا تھا۔ اس نے آوارہ سؤروں کو ایک کچرے کے ڈھیر میں منھ مارتے دیکھا تھا۔ اسے اور کچھ نہیں سوجھا، کچرے کے ایک ڈھیر سے کچرا اٹھا اٹھا کر لاتا رہا اور اس بوسیدہ کوٹھری کے باہر، صحن میں، دروازے کے پاس اکٹھا کرتا رہا۔ شام کے سائے اترنے لگے تھے جب گندے پانی کے پوکھروں، گوبر کے ڈھیروں اور گرد سے اٹی جھاڑیوں کے پاس سے گھومتے ہوئے تین سؤر ادھر آنکلے تھے۔ تب ہی ایک سؤر کچرا سونگھتا ہوا صحن میں آگیا تھا اور نتھو نے

جھٹ سے کواڑ بند کر لیے تھے پھر بھاگ کر اس نے آنگن کے پار کوٹھری کا دروازہ کھول دیا تھا اور اپنی لاٹھی سے سؤر کو ہانکتا ہوا کوٹھری کے اندر لے گیا تھا۔ پھر اس ڈر سے کہ سؤر باڑے کا آدمی سؤر کو ڈھونڈتا ہوا ادھر آ نکلے اور سؤر کا لگیانا سن لے ننھو باہر سے کچرا اٹھا کر کوٹھری کے اندر ڈالتا رہا تھا۔ کوٹھری کے اندر پہنچ جانے پر سؤر اسی کچرے میں کھو گیا تھا اور ننھو بے فکر ہو کر بڑی دیر تک کوٹھری کے باہر بیٹھا بیڑیاں پھونکتا رہا تھا اور اندھیرا ہونے کا انتظار کرتا رہا تھا۔ بہت دیر بعد جب رات گہری ہونے لگی تو ننھو کوٹھری کے اندر گھسا تھا۔ چراغ کی مدھم، ناچتی سی روشنی میں اس نے دیکھا کہ کچرا ساری کوٹھری میں پھیل گیا ہے اور اس میں سے کیچڑ کی سی بدبو اٹھ رہی ہے۔ پھر اس بدصورت بوجھل سؤر کو دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا اور وہ دل ہی دل میں پچھتانے لگا کہ اس نے یہ گندا، جوکھم والا کام کیوں اپنے سر پر لے لیا۔ تب ہی اس کے دل میں آیا کہ لپک کر کوٹھری کا دروازہ کھول دے اور سؤر کو باہر دھکیل دے۔ اب رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی لیکن سؤر جیوں کا تیوں کچرے کے بیچوں بیچ مست گھوم رہا تھا۔ فرش پر خون کے دھبے پڑ گئے تھے اور سؤر کی توند پر دو ایک جگہ گھونپوں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ خود اس کی اپنی ٹانگوں پر سؤر کی تھوتھنی سے لگے زخم تھے اور بس۔ سؤر پہلے کی طرح جیتا جاگتا کوٹھری کے اندر موجود تھا جبکہ ننھو کی سانس پھول رہی تھی اور جسم پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ مگر اس جھنجھٹ سے نکل جانے کا راستہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

دور شیخوں کے باغ کی گھڑی نے دو بجائے۔ ننھو گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی نظر پھر سؤر پر پڑی۔ سؤر نے کچرے کے درمیان کھڑے کھڑے دوبارہ پیشاب کر دیا تھا اور چھپکتا ہوا کمرے کے وسط میں سے ہٹ کر دائیں طرف کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔ چراغ کی لو پھر سے جھپکنے لگی تھی اور سائے کسی برے خواب کی طرح دیواروں پر لہرانے لگے تھے۔ صورت حال میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ سؤر پہلے کی طرح سر نیچا کیے تھوتھنی سے کبھی کچرے کے ٹکڑے کو سونگھنے کے لیے رک جاتا کبھی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا اور کبھی دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگتا۔ پہلے کی طرح اس کی پتلی سی دم کسی پتلے، لمبے کیڑے کی طرح چھلّے بناتی اور کھولتی جا رہی تھی۔

"ایسے نہیں چلے گا،" ننھو نے دانت پیس کر کہا۔ "یہ میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہ سؤر آج میری جان لے لے گا۔"

اس کا دل چاہا کہ ایک بار پھر سؤر کی ٹانگ پیچھے سے کھینچ کر اسے الٹا گرانے کی کوشش کر دیکھے۔ بائیں ہاتھ میں چھرے کو اونچا اٹھائے ہوئے وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا ہوا کوٹھری کے عین وسط میں چلا آیا۔ اس وقت سؤر دائیں طرف کی دیوار کے سرے تک پہنچنے کے بعد بائیں طرف کی دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ننھو

کو اپنی طرف آتے دیکھ کر بھاگنے کی بجائے وہ مڑ کر اس کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک بار وہ غرّایا بھی، جیسے ننھو پر جھپٹنے جا رہا ہو۔ ننھو ایک ایک قدم پیچھے کی طرف ہٹنے لگا۔ اس کی آنکھیں سؤر کی تھوتھنی پر لگی تھیں۔ اب سؤر اس کے عین سامنے تھا، اسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ان حالات میں اس کی پچھلی ٹانگ کو پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچنا اور اسے پیٹھ کے بل گرا دینا ناممکن ہو گیا تھا۔ سؤر کی چھوٹی چھوٹی لال آنکھوں میں خمار چھایا ہوا تھا، نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ ننھو بدحواس ہو رہا تھا۔ دو بج چکے تھے، اور جو کام گزشتہ شام سے اب تک نہیں ہو پایا تھا وہ اب پو پھٹنے سے پہلے کس طرح ہو پائے گا۔ جمعدار کا چھکڑا کسی وقت بھی آسکتا ہے، اور جو کام نہ ہوا تو مراد علی کا کیا بھروسا، دوست سے دشمن بن جائے، کھالیں دلوانا بند کر دے، کوٹھری میں سے اٹھوا دے، کسی سے پٹوا دے، پریشان کرے۔ ننھو کے ہاتھ پیر پھولنے لگے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ سؤر پچھلے پاؤں سے پکڑنے پر کاٹ کھائے گا، یا اچھلے گا اور پاؤں چھڑا لے گا۔

اچانک ننھو بھنّا اٹھا۔ بغیر کسی خاص وجہ کے، جیسے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ "یا تو میں نہیں رہوں گا یا یہ نہیں رہے گا۔" اس نے کہا اور فوراً پلٹ کر فرش پر رکھی پتھر کی سل اٹھا لی۔ سل اٹھا کر وہ کوٹھری کے عین وسط میں پہنچ گیا۔ سل کو دونوں ہاتھوں سے سر کے اوپر اٹھائے وہ پل بھر کے لیے ٹھٹھکا۔ سؤر کی تھوتھنی اب اگلے پیروں پر تھی اور وہ خربوزے کے چھلکے کو سونگھ رہا تھا۔ اس کی لال لال آنکھیں چمچما رہی تھیں۔ پیٹھ کے پیچھے اس کی ننھی سی پونچھ برابر ہل رہی تھی۔ اگر یہ ہلے جلے نہیں اور سل سیدھی اس کے بدن پر جا پڑے تو کہیں نہ کہیں وار کرے گی اور سؤر کے جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ ٹوٹ کر رہے گا۔ اگر ایک ٹانگ ہی ٹوٹ جائے تو بھی غنیمت ہے۔ اس کا چلنا پھرنا مشکل ہو گا۔

پھر دونوں ہاتھ تول کر ننھو نے سل کو سؤر کے سر پر دے مارا۔ آلے میں رکھے چراغ کی لو تھرّائی اور دیواروں پر سائے لہرا گئے۔ سل سؤر کے جسم پر لگی لیکن ننھو کو ٹھیک طرح سے یہ پتہ نہیں لگا کہ کہاں لگی ہے۔ سؤر نے زور سے آواز نکالی اور سل کھٹاک سے فرش پر جا گری۔ ننھو سل پھینکتے ہی پیچھے ہٹ گیا اور سؤر کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سؤر کی ادھ موندی آنکھیں جھپک رہی تھیں اور اس کی تھوتھنی اب بھی اگلی ٹانگوں پر ٹکی ہوئی تھی۔

اچانک سؤر غرّایا اور پچھلی دیوار سے ہٹ کر کوٹھری کے بیچوں بیچ آنے لگا۔ وہ دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ ننھو آنگن میں کھلنے والے دروازے کی طرف سرک کر کھڑا ہو گیا۔ چراغ کی لرزتی روشنی میں سؤر ایک سیاہ ڈھیر کی طرح آگے کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ سل اس کے ماتھے پر گری تھی جس سے شاید وہ چکرا گیا تھا اور اسے ٹھیک طرح سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ننھو ڈر گیا۔ سؤر ضرور اس کی طرف بڑھتا

آرہا ہے اور وہ اسے کاٹ کھائے گا۔

ننھو نے جھٹ دروازہ کھولا اور کوٹھری سے باہر نکل گیا۔

"کس مصیبت میں جان پھنس گئی ہے۔" وہ بڑبڑایا اور آنگن میں آکر چھوٹی دیوار کے پاس کھڑا ہوگیا۔ باہر پہنچ کر صاف بہتی ہوا میں اسے راحت ملی۔ کوٹھری کی گھٹن اور بدبو میں وہ پریشان ہوگیا تھا۔ پسینے سے تر جسم کو ہوا کے ہلکے لمس سے فرحت کا احساس ہوا۔ لمحہ بھر کے لیے اسے ایسا لگا جیسے وہ پھر سے جی اٹھا ہے۔ اس کے مردہ جسم میں جیسے پھر سے جان آگئی۔" مجھے کیا لینا اس کام سے۔ اسلوتری کو سوئر نہیں ملتا تو نہ ملے' میری بلا سے' میں کل مراد علی کے سامنے پانچ کا نوٹ پٹک دوں گا اور ہاتھ جوڑ دوں گا۔ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے حضور! میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ میرا کیا بگاڑ لے گا۔ دو دن تک منھ پھلائے رہے گا۔ میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اسے منا لوں گا۔"

دیوار کے پیچھے وہ خاموش کھڑا رہا۔ چاند نکل آیا تھا اور چاروں طرف چھٹکی چاندنی میں اسے آس پاس کا سارا علاقہ اجنبی اور پراسرار سا لگ رہا تھا۔ سامنے والی بیل گاڑیوں کی کچی سڑک اس وقت سونی پڑی تھی، خاموش اور پرسکون۔ دن بھر اس پر شمال کے دیہات سے آنے والی بیل گاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی ٹن ٹن سنائی دیتی رہتی تھی۔ ان کے پہیوں سے سڑک پر گہری لیکھیں بن گئی تھیں اور مٹی پس پس کر اتنی باریک ہوگئی تھی کہ اس پر پاؤں پڑتے ہی آدمی گھٹنوں تک مٹی میں دھنس جاتا تھا۔ سڑک کے پار تنکھی ڈھلان پر، جو نیچے میدان میں اتر گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اور بیروں کے پیڑ اور کانٹے دار تھوہر کے جھنڈ دھول سے اٹے پڑے تھے لیکن اب چاندنی رات میں دُھلے دُھلے سے لگ رہے تھے۔ میدان کے پار مسان تھے جس کے پیچھے دو کوٹھریوں میں ایک ڈوم رہتا تھا۔ اس وقت یہ کوٹھریاں ایک دوسرے میں پیوست اور اجڑی اجڑی سی لگ رہی تھیں۔ کسی بھی کوٹھری میں روشنی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ ڈوم رات کو شراب پی کر چلاّتا اور بڑبڑاتا رہتا تھا اور اس کی آواز میدان کے پار اس کوٹھری تک آتی تھی۔ لیکن اس وقت وہ جیسے مرا پڑا تھا۔

ننھو کو اچانک اپنی بیوی کی یاد آئی جو اس وقت چماروں کی بستی میں آرام سے سو رہی ہوگی۔ یہ جھنجھٹ مول نہ لیا ہوتا تو وہ اس کے پاس ہوتا اور اس کا گداز جسم ننھو کی باہوں میں ہوتا۔ اپنی جوان بیوی کو باہوں میں بھر لینے کی خواہش اسے بری طرح بے قرار کرنے لگی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ اس کی راہ دیکھتی رہی ہوگی۔ اس سے بغیر کچھ کہے سنے وہ گھر سے چلا آیا تھا۔ ایک ہی شام وہ اس سے دور رہ کر پریشان ہوگیا تھا۔

کچّی سڑک دائیں ہاتھ کو دور تک جا کر نیچے کی طرف اتر گئی تھی۔ اس وقت چاندنی میں وہ کتنی ڈھلی ڈھلی لگ رہی تھی۔ اس کے کنارے ایک طرف کو ہٹ کر ایک کچّا کنواں تھا۔ کنویں پر پڑا اس کا چکر اور مال بھی برے نہیں لگ رہے تھے۔ تھوڑی دور جا کر یہ ویران علاقہ ختم ہو جاتا تھا اور کچّی سڑک، شہر کو جانے والی پکّی سڑک سے جا ملتی تھی۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دور بائیں طرف بگری کی عمارت تھی جو چاندنی میں کالے، چپٹے ڈبّے کی طرح لگ رہی تھی۔ دور دور تک خالی زمین پڑی تھی جس پر جگہ جگہ کانٹے دار جھاڑیاں اور چھوٹے چھوٹے پیڑ پھیلے پڑے تھے۔ دور بہت دور فوجی چھاؤنی کی بیرکیں تھیں، الگ تھلگ، جہاں تک پہنچنے میں گھنٹوں لگ جاتے تھے۔

ننھو کا جسم ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ اس کا دل چاہا، وہیں کھڑا کھڑا منڈیر پر سر رکھ کر جھپکی لے لے۔ کوٹھری سے باہر نکل کر وہ جیسے دوسری دنیا میں آ گیا تھا۔ صاف، ٹھنڈی ہوا اور چاروں طرف چھٹکی چاندنی میں اسے اپنی حالت پر رونا آنے لگا۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا چھرا باہر آنے کے بعد عجیب اور غیر متعلق سا لگنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ وہاں سے بھاگ جائے اور کوٹھری میں جھانک کر دیکھے بھی نہیں اور بھاگ جائے۔ کل سؤر باڑے کا پوربیا چوکیدار ضرور ادھر سے گزرے گا اور کچرا دیکھ کر سمجھ جائے گا کہ سؤر کوٹھری کے اندر ہوگا اور وہ اسے ہانک کر وہاں سے لے جائے گا۔

اسے پھر اپنی بیوی کی یاد ستانے لگی۔ اپنی بیوی کے پاس پہنچ کر، اس کے ساتھ آہستہ آہستہ باتیں کرنے سے اس کے بے چین دل کو چین مل سکتا تھا۔ کب یہ جھنجھٹ ختم ہوگا اور کب وہ اس کے پاس چماروں کی بستی میں واپس پہنچ پائے گا۔

اچانک، دور شیخوں کے باغ کی گھڑی نے تین بجائے، اور ننھو کا سارا جسم تھرّا گیا۔ ایک گہری ٹیس اس کے دل میں اٹھی۔ اب کیا ہوگا؟ وہ یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے جبکہ اب تک سؤر نہیں مرا۔ جمعدار چھکڑا لے کر آتا ہی ہوگا۔ وہ اس سے کیا کہے گا، اسے کیا جواب دے گا۔ آسمان میں ہلکا پیلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ پو پھٹنے والی تھی اور وہ ابھی تک اپنے کام سے فارغ نہیں ہوا تھا۔ اسے پھر اپنی حالت پر رونا آ گیا۔

گھبراہٹ کے عالم میں وہ کوٹھری کی طرف گیا۔ آہستہ سے دروازہ کھول کر اس نے اندر جھانکا۔ کوٹھری کا دروازہ کھولتے ہی بدبو کا بھبوکا سا اس کی طرف جھپٹا، لیکن چراغ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ کوٹھری کے عین وسط میں سؤر کھڑا ہے۔ بے چین سا، گویا گھوم گھوم کر تھک گیا ہو، نڈھال سا۔ کسی اندرونی تحریک سے ننھو کو ایسا لگا جیسے اب سؤر کو مار گرانا مشکل نہیں ہوگا۔ ننھو نے دروازہ بھیڑ دیا اور پھر آلے کے نیچے چپ چاپ جا کر کھڑا ہو گیا اور ٹکٹکی باندھ کر سؤر کو دیکھنے لگا۔

ننھو کے اندر جانے پر سؤر نے اپنا نتھنا اٹھایا۔ اسے ایسا لگا جیسے سؤر کا نتھنا زیادہ سرخ ہو رہا ہے اور آنکھیں زیادہ سکڑی ہوئی ہیں۔ سؤر پر پھینکی گئی رسّی اس کے پیچھے کچھ فاصلے پر پڑی تھی۔ چراغ کی ٹمٹماتی لو نے پھر جھپکی لی اور ننھّو کو ایسا لگا جیسے سؤر نے دوبارہ حرکت کی ہو اور پھر چلنے لگا ہو۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ سؤر واقعی ہلا تھا۔ وہ سچ مچ بہت دھیمی رفتار سے ننھو کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ دو ایک قدم دائیں بائیں ڈگمگاتے ہوئے چلنے کے بعد ایک عجیب سی آواز سؤر کے منھ سے نکلی۔ ننھو دوبارہ چھرا اونچا اٹھا کر فرش پر پیروں کے بل بیٹھ گیا۔ سؤر نے دو تین قدم اور آگے کی طرف بڑھائے۔ اس کا نتھنا اپنے پیروں کی طرف اور زیادہ جھک گیا اور ننھو کے پاس پہنچتے پہنچتے وہ ایک طرف کو لڑھک کر گر گیا۔ اس کی ٹانگوں میں ایک بار زور سے کپکپی پیدا ہو گئی مگر چند لمحوں میں ہی وہ ہوا میں اٹھی کی اٹھی رہ گئیں۔ سؤر ڈھیر ہو چکا تھا۔

ننھّو نے چھرا فرش پر رکھ دیا مگر اس کی آنکھیں اب بھی سؤر پر لگی تھیں۔ اسی وقت پڑوس کے کسی گھر میں کسی مرغ نے پر پھڑپھڑائے اور بانگ دی۔ ساتھ ہی سڑک پر کسی ہچکولے کھاتے چھکڑے کی آواز آئی اور ننھو نے چین کی سانس لی۔

2

پربھات پھیری میں حصّہ لینے کے لیے شروع میں گنے چنے لوگ ہی پہنچتے تھے۔ بعد میں جب یہ لوگ گلیاں اور بازار پھلانگتے ہوئے گزرتے تھے تو جس کسی کا گھر راستے میں پڑتا تھا' وہ توند کھجلاتا' جمائیاں لیتا ان کے ساتھ شامل ہو جاتا تھا۔

ہواؤں میں ابھی خنکی تھی رات کو کمرے کے اندر سوتے تھے' پھر بھی صبح صبح کمبل اوڑھنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ پربھات پھیری میں شامل ہونے والے بزرگ لوگ کن ٹوپ چڑھا کر آتے تھے۔

شیخوں والے باغ کی گھڑی نے چار بجائے۔ کانگرس کمیٹی کے دفتر کے سامنے سڑک پر صرف دو تین آدمی کھڑے دوسرے ممبروں کی راہ دیکھ رہے تھے۔ خفیہ پولس کے دو سپاہی بھی سادہ لباس میں تھوڑی دور پر کھڑے تھے۔

اسی وقت دور سے روشنی دکھائی دی کوئی آدمی ہری کین لیمپ اٹھائے' بڑے بازار کا موڑ کاٹ کر اس طرف آرہا تھا۔ لیمپ کی روشنی کے دائرے میں اس آدمی کا پاجامہ ہی نظر آرہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے دھڑ کے بغیر دو ٹانگیں چلی آرہی ہوں۔

"لو۔ بخشی جی آگئے۔" دور سے پاجامہ پہچان کر عزیز بولا۔

بخشی جی خود کہا کرتے تھے' چار بجے کا مطلب ہے چار بجے' نہ ایک منٹ اُدھر' نہ ایک منٹ اِدھر' لیکن آج وہ خود لیٹ آرہے تھے۔

بخشی جی ہی تھے' بلغمی مزاج والے' ضلع کانگرس کمیٹی کے سکریٹری' عمر رسیدہ آدمی۔ جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا لیکن وہ نہ آئیں تو کوئی بھی نہ آئے گا۔ پربھات پھیری کے لیے کوئی پہنچے گا ہی نہیں۔ ان کے نزدیک پہنچتے ہی عزیز نے یہ شعر پڑھا ؎

مُلاّ ، میاں ، مشعلچی ، تینوں ایک سمان
لوکاں نوں دسّن جاننا' آپ ہنو جان

بخشی نے قریب پہنچ کر اپنی صفائی میں کہا۔ "رات دیر سے سوئے، صبح آنکھ ہی نہیں کھلی۔" پھر دعا سلام کرنے کے بعد چھوٹتے ہی بولے۔

"ماسٹر رام داس نہیں آیا؟"

جواب عزیز نے دیا۔

"وہ گائے دوہ کر آئے گا۔ اس سے پہلے تھوڑا ہی آئے گا۔"

"جب تنخواہ بڑھوانی تھی تب تو رات کے گیارہ بجے بھی بلاؤ تو آجاتا تھا۔ اب تنخواہ بڑھ گئی ہے تو اسے کیا غرض پڑی ہے کہ وقت پر آئے۔"

دور اندھیرے میں نئے محلے کی طرف سے اونچے، لمبے قد کا ایک آدمی، سر سے پاؤں تک سفید کپڑوں میں ملبوس، ڈھلان چڑھ کر سامنے کی طرف سے آتا نظر آیا۔

"لو آگئے جن کے پلّے سچ ہے۔ مہتا جی تم سچ مچ لیڈر لگتے ہو۔"

مہتا جی نے پاس آکر دیگر لوگوں کے بارے میں دریافت کیا کہ اجیت سنگھ پہنچا ہے یا نہیں۔ "دیس راج، شنکر، ماسٹر رام داس یہ سب لوگ کہاں ہیں۔" پھر بخشی جی کی طرف مخاطب ہو کر بولے۔

"میں نے کہا تھا، چار بجے کا وقت دینا ٹھیک نہیں پربھات پھیری کے لیے۔"

"چار بجے کا وقت دو گے تب ہی کہیں پانچ بجے پربھات پھیری پر نکل سکو گے۔" بخشی نے جواب دیا۔

"پانچ بجے کا وقت دیتے تو دھوپ نکلنے پر بھی لوگ اکٹھے نہیں ہو پاتے۔ خود تو دیر سے آتے ہو اور ہم سے کہتے ہو کہ یہ وقت نہیں دینا چاہیے، وہ وقت نہیں دینا چاہیے۔" یہ کہتے ہوئے بخشی جی نے چادر کے نیچے واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کی ڈبیہ نکالی۔ عزیز نے مہتا جی کے پھر سے چٹکی لی۔

"دور سے آپ سچ مچ لیڈر لگتے ہو، مہتا جی۔"

مہتا جی سنجیدہ انداز میں مسکرائے پھر آہستہ سے عزیز کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے:

"اس دن موٹروں کے اڈے پر کھڑا تھا تو ایک آدمی دوسرے سے پوچھنے لگا، کیا وہ جواہر لال نہرو کھڑا ہے۔"

اور مہتا جی نے دونوں ہاتھوں سے اپنی گاندھی ٹوپی کا زاویہ تھوڑا ٹیڑھا کرتے ہوئے کہا: "بہت لوگوں کو مغالطہ ہو جاتا ہے۔"

"آپ کسی سے کم ہیں مہتا جی؟ واہ وا۔ آپ کی اپنی شخصیت ہے۔"

"میں قد میں ان سے تھوڑا لمبا ہوں۔" مہتا جی نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہا کر آئے ہو، مہتاجی ؟" کشمیری لال بولا۔

"واہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ میں ہمیشہ نہا کر آتا ہوں۔ گرمی ہو یا سردی، میرا یہی اصول ہے۔ پربھات پھیری پر تو کسی کو بھی نہائے بغیر آنا ہی نہیں چاہیئے، کشمیری لال، تو اپنی بتا۔ تو نے منھ بھی دھویا ہے یا نہیں ؟"

اسی وقت دور ڈھلان کی طرف سے پھر آواز آئی۔

"لیفٹ۔۔۔ لیفٹ ۔۔۔ رائٹ — لیفٹ لیفٹ۔۔۔"

"لو۔ جرنیل بھی پہنچ گیا ہے" بخشی نے کہا اور سب ہی ہنس پڑے۔

لیمپ کی روشنی سب سے پہلے اس کے پھٹے جوتوں پر پڑی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ سلیپر تھے یا جوتے۔ جوتوں سے لگ بھگ چھ انچ اوپر خاکی پتلون شروع ہوتی تھی، اس کے اوپر خاکی کوٹ جس پر گاندھی اور نہرو کے جتنے تمغے جرنیل کو مل سکتے تھے، اس نے لگا رکھے تھے۔ ساتھ میں رنگین تھگلیاں، ڈورے، سوکھے ہوئے جسم پر سلا ہوا خاکی کوٹ لٹک رہا تھا اور خشخشی ڈاڑھی بچی کھچی اور سب سے اوپر مونگیا رنگ کی پگڑی۔

جرنیل ہی ایک ایسا آدمی تھا جو کوئی تحریک ہو یا نہ ہو جیل جاتا رہتا تھا، جلسے ہوں یا نہ ہوں شہر میں خود ہی تقریریں کرتا پھرتا تھا۔ آئے دن شہر میں کہیں نہ کہیں اس کی پٹائی ہو جایا کرتی تھی۔ بغل میں چھوٹا سا بید دبائے وہ ہمیشہ کبھی ایک محلّے میں اور کبھی دوسرے محلّے میں گھومتا نظر آتا تھا۔ منادی کرنے کے لیے تانگہ نکلتا تو اس میں بیٹھنے والے تین آدمیوں سے ایک آدمی ضرور جرنیل ہوا کرتا تھا۔ جلسہ شروع ہونے پر سب سے پہلے جرنیل کی تقریر ہوتی تھی جس میں اس کی کھوکھلی، پھسپھساتی آواز صرف آگے بیٹھے چند آدمیوں تک ہی پہنچ پاتی تھی۔

جرنیل کے پہنچتے ہی کشمیری لال نے چٹکی لی۔

"جرنیل! کل جلسے میں سے بھاگ کیوں گئے تھے ؟"

جرنیل نے آواز پہچان کر اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے کشمیری لال کو گھور کر دیکھا اور بیت بغل میں دباتے ہوئے بولا۔

"میں صبح صبح تم جیسے آدمی کے منھ نہیں لگنا چاہتا۔ دور رہو تم۔"

بخشی نے کشمیری لال کو روکا۔

"یہ کون سا وقت ہے چھیڑ خانی کرنے کا ؟ بس چپ رہو تم۔"

لیکن جرنیل بپھر اٹھا تھا۔

"میں تمھارا پردہ فاش کروں گا۔ تمھارا کمیونسٹوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے۔ میں جانتا ہوں۔ دیودت کمیونسٹ کے ساتھ کبڑے حلوائی کی دکان پر میں نے تمھیں 'چھانا مرگی' کھاتے دیکھا ہے۔"

"بس بس ٹھیک ہے، جرنیل، اور پردہ فاش مت کرو۔" بخشی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

اتنے میں چوڑے پائنچوں والا پاجامہ پھڑپھڑاتا ہوا شنکرلال پہنچ گیا۔

اندھیرے میں صبح کی زردی محسوس ہونے لگی تھی۔ دائیں ہاتھ بنک کی اونچی دیوار پر سے اندھیرے کی ایک اور پرت جھڑ کر گر گئی تھی۔ سڑک کے پار آریہ اسکول کی عمارت میں حلوائی کی انگیٹھی میں سے دھواں اٹھنے لگا تھا۔ بغل والی گلی میں سے ہوا خوری کے شوقین کھنکھارتے، چھڑی ٹھکورتے اکا دکا نکلنے لگے تھے۔ کہیں کہیں کوئی عورت منھ اور سر لپیٹے گورودوارہ کی طرف جاتی نظر آتی۔

بخشی جی نے ہاتھ میں پکڑے ہری کین لیمپ کو اوپر اٹھایا اور پھونک مار کر بتی بجھا دی۔

"کیوں، ہم پہنچے ہیں بخشی جی تو آپ نے بتی ہی گل کر دی۔"

"کیوں۔ تجھے میرا چہرہ دیکھنا ہے یا مہتاجی کا دیکھنا ہے۔" بخشی جی بولے۔ "تیل ضائع ہوتا ہے۔ یہ کانگرس کمیٹی کا لیمپ نہیں ہے۔ میرا اپنا لیمپ ہے۔ کانگرس کمیٹی سے تیل کی منظوری لے لو۔ پھر میں اسے دن رات جلائے رکھوں گا۔"

اس پر دبی آواز میں کشمیری لال کے پیچھے کھڑے شنکر نے کہا۔ "سگرٹوں کے لیے آپ کو منظوری کی ضرورت نہیں تو مٹی کے تیل کے لیے کیوں ہوگی؟"

یہ جملہ بخشی جی نے سن لیا لیکن زہر کا گھونٹ پی کر خاموش رہے۔ ایسے لوفروں کو منھ لگانا اپنی بے عزتی کروانا تھا۔

"آپ تو مالک ہیں بخشی جی۔ آپ کو منظوری کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کے حکم کے بغیر تو پرندہ پر نہیں مار سکتا۔" شنکر بولا۔ پھر مہتاجی سے مخاطب ہوا۔

"جے ہند مہتاجی!"

"جے ہند!"

"میں نے آپ کو دیکھا ہی نہیں۔"

"تم اب ہمیں کہاں دیکھتے ہو شنکر۔ تمھارے پو بارہ ہیں۔"

"آج آپ اپنا بیگ نہیں لائے؟"

"بیگ کی پربھات پھیری میں کیا ضرورت ہے؟"

"واہ جی، بیگ کی ضرورت تو سب ہی جگہ پڑ سکتی ہے، بیمہ کا گاہک تو کہیں بھی پھنس سکتا ہے۔"

مہتا جی خاموش رہے۔ کانگرس کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ وہ بیمہ کا کام بھی کرتے تھے۔

"کبھی زبان بھی بند کیا کر شنکر۔ مہتا جی تم سے تگنی عمر کے ہیں۔ بڑوں کو بڑا سمجھا کرتے ہیں۔" بخشی جی نے کہا۔

"میں نے کیا کہا ہے؟ میں نے یہی پوچھا ہے نا کہ بیگ نہیں لائے۔ میں نے یہ تو نہیں پوچھا کہ سیٹھی سے پچاس ہزار کا بیمہ ملا یا نہیں۔"

شنکر نے تیر چھوڑ دیا۔ عام طور پر شنکر اس ڈھنگ سے بات نہیں کرتا تھا۔ منہ پھٹ آدمی تھا۔ جلی کٹی منہ پر سناتا تھا۔ لیکن پچاس ہزار کے بیمہ والی چوٹ بہت بڑی تھی۔ مہتا جی ایسے سہمے کہ ایک لفظ منہ سے نہیں کہہ پائے۔ مہتا جی کوئی معمولی ہستی نہیں تھے۔ کل ملا کر سولہ برس جیلوں میں کاٹ کر آئے تھے اور ضلع کانگرس کمیٹی کے صدر تھے اور سب سے اجلی کھادی پہنتے تھے۔ ان پر یہ الزام لگانا بڑی حماقت تھی لیکن مدت سے افواہ چلی آ رہی تھی کہ سیٹھی ٹھیکیدار کا پچاس ہزار کا بیمہ انھیں ملنے والا ہے اور اس کے عوض مہتا جی سیٹھی کو الیکشن میں کانگرس کا ٹکٹ دلانے والے ہیں۔

"یہ تو بکواس کرتا ہے مہتا جی۔ اس کی بات کو بس ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا کرو۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ مہتا جی نے ٹکٹ کا وعدہ کیا ہے۔ ٹکٹ دینے کا اختیار تو صوبائی کمیٹی کو ہے اور سفارش ضلع کمیٹی کرے گی۔ اندرونی طور پر بیمہ کھانے والے صدر اور سکریٹری کوئی فیصلہ کر لیں تو الگ بات ہے لیکن ہم یہ کام نہیں کرنے دیں گے۔ دونوں صدر اور سکریٹری کھڑے سن رہے ہو۔ بڑے بڑے ٹھیکیداروں کو ٹکٹ ملنے لگا تو بس کانگرس کو ختم ہی سمجھو۔"

مہتا جی وہاں سے ہٹ کر کشمیری لال سے باتیں کرنے لگے۔ بخشی جی نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔

دراصل شنکر اور مہتا جی کے درمیان پٹتی نہیں تھی۔ یہ اس دن سے نہیں پٹتی تھی جب سے لاہور میں ہونے والے جلسے میں، جس میں نہرو جی حصہ لینے والے تھے، ضلع کمیٹی کی طرف سے کچھ نمائندے بھیجے گئے تھے، اور مہتا جی نے شنکر کا نام اس فہرست میں نہیں رکھا تھا۔ شنکر پھر بھی لاہور پہنچ گیا تھا اور جلسے میں حصہ لیتا رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ جلسہ کے دوران بڑے پیمانے پر ایک ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں نہرو جی بھی شریک ہوئے تھے۔ سب ہی نمائندوں سے اس ڈنر کے لیے آٹھ آٹھ آنے لیے گئے تھے۔ اپنے نمائندوں کا چندہ مہتا جی نے کانگرس فنڈ میں سے دیا تھا۔ وہاں بھی شنکر کا چندہ دینے سے انھوں نے

انکار کر دیا تھا۔ شنکر بہت بگڑا تھا اور مہتا جی کے منع کرنے کے باوجود دعوت میں شامل ہوا تھا۔ وہ مہتا جی کے عین سامنے لائن میں بیٹھا تھا اور بھوکے بھیڑیے کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔ ہاتھ بھی سَنے ہوئے تھے اور ہونٹ بھی۔ اور دال سبزی بانٹنے والوں پر چلائے جا رہا تھا۔ مہتا جی سے نہ رہا گیا۔

"کھانے کو بیٹھا ہے شنکر تو انسانوں کی طرح کھا۔ ہماری ضلع کانگرس کمیٹی کی رسوائی کروا رہا ہے۔"

"اس وقت آپ خاموش رہیئے مہتا جی۔ یہ کانگرس کے پیسے سے نہیں کھا رہا ہوں۔ اپنے پیسے سے کھا رہا ہوں۔ اپنا زر خرچ کیا ہے۔ آپ کے ساتھ گھر واپس جا کر بات ہو گی۔ میں نے آپ جیسے بہت دیکھے ہیں۔"

"کیا دیکھے ہیں اوئے۔ تو ہر وقت بکواس کرتا رہتا ہے۔ تو گھر چل کر میرا کیا کر لے گا؟"

لاہور سے واپسی پر شنکر نے مہتا جی کو سچ مچ آڑے ہاتھوں لیا۔ صوبائی کانگرس کے انتخابات ہونے والے تھے اور ہر ایک ضلع کمیٹی سے چار ممبر بھیجنے کا منصوبہ تھا۔ مہتا جی نے دیگر تین ممبروں کے ساتھ چوتھا نام کوہلی کا تجویز کر دیا۔ کوہلی ضلع کمیٹی کی طرف سے ضرور چن لیا جاتا اگر شنکر بیہودگی نہ کرتا۔ اسکروٹنی Scrutiny کمیٹی کی میٹنگ چل رہی تھی، جب شنکر اٹھ کھڑا ہوا۔

"معاف کیجیے۔ میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔"

مہتا جی کا ماتھا ٹھنکا۔ "یہ اسکروٹنی کمیٹی کی میٹنگ ہو رہی ہے، جو سوال کرنا ہو، وہ بعد میں مجھ سے کر لینا۔"

"میں آپ سے نہیں، اسکروٹنی کمیٹی سے پوچھنا چاہتا ہوں۔"

پھر وہ بڑے ڈرامائی انداز میں اس طرح کھڑا رہا کہ اسکروٹنی کمیٹی کے صدر اس سے کچھ کہیں تب وہ بولے۔

"کہو۔ کیا بات ہے؟" صدر نے سوال کیا۔

"میں پوچھ سکتا ہوں کہ کانگرس کی ممبری کے اصول کیا ہیں؟"

"تم کام کی بات کرو۔ الٹی سیدھی بات کرنے کا یہ وقت نہیں ہے۔"

"مہتا جی! میں آپ سے بات نہیں کر رہا ہوں۔ آپ خاموش رہیئے۔"

"کہنے دو۔ کہنے دو۔ ہاں بولو، بھائی شنکر۔ کیا کہتے ہو؟"

کانگرس کی ممبری کے کیا اصول ہیں؟"

"کہ ممبر چار آنے سالانہ چندہ دیتا ہو، خالص ہاتھ کی کاتی ہوئی اور بُنی ہوئی کھادی پہنتا ہو، چرخہ

کاتتا ہو۔"

"کیوں ٹھیک ہے یا نہیں؟"

"ٹھیک ہے۔"

"میں کوہلی صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ ایک منٹ کے لیے کھڑے ہو جائیں۔"

سب ہی لوگ خاموش رہے۔

"گستاخی معاف! اسکروٹنی کمیٹی کے ہر ممبر کو سوال پوچھنے کا حق حاصل ہے۔"

مہتا جی غرّائے۔

"مہتا جی صاحب، آپ یہاں پر صدر نہیں ہیں۔ یہاں پر آپ کو اپنی چلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہاں تو کوہلی صاحب۔ ایک منٹ کے لیے کھڑے ہو جائیے۔"

کوہلی کھڑا ہو گیا۔

"آپ کھادی پہنتے ہیں نا؟"

"یہ کیا ناٹک کر رہے ہو، تم؟ سیدھی بات کہو، تم پوچھنا کیا چاہتے ہو؟"

"اپنا ناڑہ دکھائیے۔ ناڑہ مطلب ازار بند۔"

"کیوں؟ تمھارا مطلب؟"

"یہ ایک ممبر کی توہین ہے۔ یہ کیا مذاق چل رہا ہے؟"

"میں مذاق کر رہا ہوں، مہتا صاحب۔ آپ خاموش رہیئے۔ بغیر صدر صاحب کی اجازت کے آپ کو بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہاں تو کوہلی صاحب میں نے کہا تھا، اپنا ازار بند دکھائیے۔"

"اگر نہ دکھاؤں تو؟"

"آپ کو دکھانا پڑے گا۔ میں جو بات ثابت کرنا چاہتا ہوں اس کے لیے ازار بند دکھانا ضروری ہے۔"

"دکھا دو یار۔ یہ بھونکا کام نہیں کرنے دے گا۔ کیسے کیسے لوفر کانگریس میں گھس آئے ہیں۔"

"کیا کہا مہتا جی؟ میں لوفر ہوں تو آپ شہدے ہیں۔ مجھ سے کچھ مت کہلوائیے، میں سیاہ سفید سب کچھ جانتا ہوں۔"

"ہاں تو کوہلی صاحب۔"

"تم کیا چاہتے ہو۔ میں سب کے سامنے اپنا ناڑہ کھولوں؟"

"میں کھولنے کو نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں صرف دکھانے کو کہہ رہا ہوں۔

"دکھا دیا۔ قصّہ ختم کرو۔"

کوہلی نے اچکن کا دامن اٹھایا۔ نیچے سے کھادی کے کرتے کا اگلا حصّہ اوپر کو اٹھایا۔ نیچے پیلے رنگ کا ازاربند لٹک رہا تھا۔ شنکر لپک کر آگے بڑھا اور ناڑہ پکڑ لیا۔

"دیکھ لیجیے صاجان ناڑہ ریشمی ہے۔ ہاتھ کے کاتے ہوئے سوت کا نہیں ہے۔ مشینی ہے۔ اکڑے کا ہے۔ آپ خود چھو کر دیکھ سکتے ہیں۔"

"کانگریسی ممبر ریشمی ناڑہ استعمال کرے، اور آپ اسے صوبائی کانگرس کا امیدوار بنا کر بھیجیں گے۔ کانگرس کے کوئی اصول ہیں یا نہیں؟"

اسکروٹنی کمیٹی کے ممبر ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے۔ مجبور ہو کر کوہلی کا نام کاٹنا پڑا۔ اس دن سے شنکر، مہتا جی کو پھوٹی آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

بخشی جی پریشان ہو رہے تھے۔ نہ ماسٹر رام داس پہنچا، نہ دیس راج۔ گائے گا کون؟ پربھات پھیری میں کم سے کم ایک تو گانے والا چاہیئے ہی۔ کوئی نہ ہوا تو وہ خود گا لیں گے لیکن جو لوگ ضلع کمیٹی سے تنخواہ پاتے ہیں انھیں تو پہنچنا ہی چاہیئے۔"

"دیکھ لینا، مہتا جی! ہم پربھات پھیری شروع کر دیں گے۔ تین گلیاں پار کر جائیں گے تو ماسٹر رام داس دوڑا آئے گا۔ کہے گا، 'بچھڑا دودھ پی گیا تھا، میں کیا کرتا۔ اس طرح تو یہ لوگ کام کرتے ہیں۔" پھر دوسرے ممبروں کو مخاطب کر کے بولے "کشمیری لال! اب اور انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ شروع کر دو تم۔"

لیکن کشمیری لال کو لوگوں کی ٹانگ کھینچنے میں مزا آتا تھا۔ فوراً جرنیل کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

"تقریر کرو، جرنیل تقریر کرو۔ پربھات پھیری شروع کرنے سے پہلے تقریر ہونی چاہیئے۔"

جرنیل کو اور کیا چاہیئے تھا۔ فوراً چھڑی ہلاتا لیفٹ رائٹ کرتا، سڑک کے کنارے ایک پتھر پر کھڑا ہو گیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو کشمیری لال۔ یار کوئی مناسب وقت دیکھا کرو۔" بخشی جی نے جھلا کر کہا۔ "تم نہیں چاہتے کہ پربھات پھیری ہو تو صاف صاف کہہ دو۔"

پھر جرنیل کی طرف بڑھ آئے لیکن جرنیل تقریر شروع کر چکا تھا۔

"صاجان ...."

"کوئی نہیں صاجبان، واجبان۔ نیچے اتر آؤ۔" بخشی جی نے ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا۔ "اتارو یار اسے۔ کیوں تماشا کرتے ہو صبح صبح۔"

"میری زبان کو کوئی نہیں بند کر سکتا۔" جرنیل نے پتھر پر کھڑے کھڑے کہا اور تقریر شروع کر دی

"صاحبان۔۔۔۔" اپنی اکھڑی اکھڑی، پھسپھساتی آواز میں جرنیل بولنے لگا۔

جرنیل کی عمر پچاس سے کچھ اوپر ہی رہی ہوگی، لیکن برسوں تک جیل میں رہنے کے بعد اس کے جسم میں کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ شہر کے دوسرے کانگریسیوں کو جہاں کم سے کم "بی" کلاس ملتا تھا، وہاں جرنیل کو ہمیشہ "سی" میں ڈالا جاتا تھا جس کی وجہ سے وہ بیمار بھی پڑتا رہتا تھا اور ریت سے بھری روٹی بھی کھاتا رہتا تھا لیکن اس نے نہ تو کبھی توبہ کی اور نہ ہی جرنیل کی وردی کو چھوڑا۔ جوانی کے دنوں میں لاہور میں کانگریس کے سیشن کے موقع پر وہ اپنے شہر سے والنٹیر بن کر لاہور گیا تھا۔ نہرو جی کے ساتھ وہ بھی راوی ندی کے کنارے ناچا تھا۔ جب مکمل آزادی کا نعرہ لگایا گیا تھا، اسی دن سے وہ والنٹیر کی وردی پہن رہا تھا۔ جب دن اچھے ہوتے تو اس کی وردی میں کبھی سیٹی لگ جاتی اور کبھی ترنگے کی ڈوری بندھ جاتی۔ دن خراب ہوتے تو وردی دھل بھی نہیں پاتی تھی۔ جرنیل کو نہ کہیں کوئی کام ملا، نہ اس نے کیا۔ کانگریس کے دفتر سے پندرہ روپے مہینہ پر چارک کا محنتانہ لیا کرتا تھا۔ اگر بخشی جی آنا کانی کرتے تو وہیں کھڑا ہو کر تقریر کرنے لگتا۔ دماغ میں سنک تھی اسی کی وجہ سے زندگی کی تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کر لیتا تھا۔ اس کا نہ گھر تھا، نہ گھاٹ، نہ بیوی نہ بچہ۔ نہ کام، نہ دھام۔ ہفتے میں دو تین بار کہیں نہ کہیں پٹ جاتا تھا۔ پولس کے لاٹھی چارج کے وقت جہاں دوسرے لوگ جان بچا کر نکل جاتے تھے، وہاں سنک کا مارا جرنیل اپنی چھوٹی سی ہڈیوں بھری چھاتی پھیلائے کھڑا رہتا تھا اور پسلیاں تڑوا کر آتا تھا۔

"کشمیری لال! اتار دو یار اسے۔ صبح صبح تماشا دکھانے لگے ہو۔" اب کی بار مہتا جی نے اونچی آواز میں کہا۔ لیکن جرنیل اور بھی ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"صاحبان! ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ضلع کانگریس کے صدر نے دیش کے ساتھ غداری کی ہے۔ جو وچن ہم نے 1929ء میں راوی کے کنارے لیا تھا، ہم اس پر مرتے دم تک قائم رہیں گے۔ آپ کا زیادہ وقت نہ لیتے ہوئے میں اتنا ہی کہوں گا کہ کوئی مائی کا لال ابھی پیدا نہیں ہوا ہے جو کانگریس کے اصولوں کی خلاف ورزی کر سکے۔ مہتا جی کس کھیت کی مولی ہیں؟ ہم ان سے بھی نمٹیں گے اور ان کے پٹھوؤں کشمیری لال، شنکر لال، جیت سنگھ جیسے غداروں سے بھی نمٹیں گے۔۔۔"

ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

"یہ اس طرح نہیں اترے گا۔" کشمیری لال، جس نے یہ شوشہ کھڑا کیا تھا، خود ہی بخشی جی کو سرگوشی میں صلاح دے رہا تھا۔ "اگر اتارنے کی کوشش کریں گے تو اور زیادہ ضد پکڑے گا۔"

بخشی جی نے آگ بگولا ہو کر کشمیری لال کی طرف دیکھا۔

"تالی بجائیں گے تو یہ خود اتر آئے گا' آپ فکر نہ کریں۔ دو تین بار تالیاں بجائیں گے تو اپنے آپ ہی تقریر ختم کر دے گا۔" یہ کہتے ہوئے کشمیری لال نے تالی بجائی۔ باقی لوگوں نے بھی تالیاں بجائیں۔

"واہ۔ وا۔ بہت اچھا۔ بہت خوب۔"

"صاحبان! میں آپ کا زیادہ وقت نہ لیتے ہوئے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اتنے صبر و اطمینان کے ساتھ میرے ان ٹوٹے پھوٹے لفظوں کو سُنا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ دن دور نہیں جب ہندوستان آزاد ہوگا۔ کانگرس اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوگی۔ جو قسم میں نے راوی کے کنارے۔۔۔۔"

"خوب۔ خوب' بہت خوب!" کشمیری لال نے پھر تالی بجائی۔

"صاحبان! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں آپ کے سامنے پھر کسی دن حاضر ہوں گا۔ اب آپ میرے ساتھ مل کر نعرہ لگائیے۔ انقلاب!"

دو چار آوازیں جواب میں اٹھیں۔

"زندہ باد!"

"کیوں روٹی نہیں کھاتے ہو؟ زور سے نعرہ لگاؤ۔ انقلاب!"

اونچی آواز میں جواب آیا۔

"زندہ باد!"

اور جرنیل بینت بغل میں دبا کر پتھر پر سے نیچے اتر آیا۔

"زندہ باد!" ایک آواز ڈھلان کی طرف سے بھی آئی اور ماسٹر رام داس ہانپتا ہوا صبح کے جھٹ پٹے میں سامنے آیا۔

"یہ کوئی وقت ہے آنے کا؟" بخشی جی نے غصہ سے کہا۔

جواب کشمیری لال نے دیا۔

"بچھڑا دودھ پی گیا تھا' اس وجہ سے دیر ہو گئی۔۔۔"

سب لوگ ہنسنے لگے لیکن ماسٹر رام داس سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"آج پربھات پھیری نہیں ہوگی۔"

"کیوں؟"

"آج تعمیری کام کا جو فیصلہ ہوا ہے۔"

"تعمیری کام کا فیصلہ کس نے کیا ہے؟"

"مجھ سے گوسائیں جی نے کل رات کہا تھا کہ امام دین کے محلّے کے پیچھے ڈھوک میں نالیاں صاف کریں گے۔"

"دیر سے آئے ہو اور اب بہانے بناتے ہو۔"

"کیوں؟ میں تو جھاڑو، بیلچے بھی وہاں پہنچا آیا ہوں۔ کچھ رات کو پہنچا دیے تھے کچھ صبح لے گیا تھا" پھر وہ خود ہی گنانے لگا۔ "پانچ بیلچے، بارہ جھاڑو، تین گینتیاں اور پانچ کڑاہیاں میں رات کو ہی پہنچا آیا تھا۔ شیر خاں کے گھر سب سامان رکھا ہے۔"

"ہمیں تو کسی نے نہیں بتایا۔"

"اسی لیے تو میں بھاگا چلا آرہا ہوں۔ میں جب پہلے یہاں آیا تھا تو یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔"

"ڈھوک کی نالیاں صاف ہوں گی؟ تیرا دماغ خراب ہے؟" کشمیری لال نے کہا۔ "لیکن وہاں پر تو نالیاں ہیں ہی نہیں۔"

"ہیں... ہیں۔ ہیں کیوں نہیں۔ کچّی نالیاں ہیں، پکّی نالیاں نہیں ہیں۔"

"کچّی نالیاں ہیں تو برسوں کی لسلسی کیچڑ وہاں جمع ہو گی۔ نالیاں کون صاف کرے گا؟"

"ہم کریں گے۔ تم غدار ہو۔" جرنیل نے تنک کر کہا۔

"کبھی کوئی فیصلہ، کبھی کوئی۔ گوسائیں جی نے فیصلہ کیا تھا تو ہمیں بتایا کیوں نہیں؟"

دریں اثنا اندھیرا کم ہونے لگا تھا۔ جو لوگ پربھات پھیری کے لیے جمع ہوئے تھے وہ عجیب سی کیفیت محسوس کر رہے تھے۔

"چلو۔ اب یہاں سے تو نکلو۔" بخشی نے کہا اور بجھا ہوا لیمپ اٹھاتے ہوئے آگے آئے۔ "یہاں سے گاتے ہوئے چلیں گے۔ شروع کرو رام داس۔"

جرنیل لیفٹ رائٹ کرتا ہوا آگے چلنے لگا۔ ترنگا کشمیری لال نے اٹھا لیا۔ رام داس نے پربھات پھیری کا وہی پرانا گیت، جس سے ہمیشہ پربھات پھیری شروع کی جاتی اور جو کبھی بھی جم نہیں پاتا تھا، اپنی اونچی لیکن بے سری آواز میں شروع کر دیا:۔

ذرا وی لگن آزادی دی
لگ گئی جنہاں دے من دے وچ

چلتے قدموں کی ٹاپ کے ساتھ ساتھ اس منڈلی نے یہ سطریں دہرائیں اور منڈلی نے شاہ قطب ڈھوک کا رخ کیا۔

3

گلی میں قدم رکھتے ہی نتھو نے اطمینان کا سانس لیا۔ گلی میں اندھیرا تھا، جبکہ سڑکوں میں اندھیرا کم ہونے لگا تھا۔ نتھو جلدی سے جلدی گلیوں کا جال طے کر کے اپنے ڈیرے پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس بدبو بھری کوٹھری سے نکل کر اس نے کھلی ہوا میں اطمینان کا سانس لیا۔ اس کی رات جس طرح گزری تھی، اس کے مقابلے میں ان سوتی جاگتی گلیوں میں اسے سکون کا احساس ہوا۔

بائیں طرف سے عورتوں کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے اور چوڑیاں کھنکنے کی آوازیں آئیں۔ اس نے قریب سے گزرتے دیکھا۔ نل میں پانی ابھی نہیں آیا تھا۔ نتھو کو یہ بھی اچھا لگا۔

چند قدم آگے جانے پر اسے ٹھوکر لگی۔ ایسا محسوس ہوا گویا کوئی چیز اس کے پاؤں سے ٹکرا کر بکھر گئی ہو۔ پھر وہ سمجھ گیا اور سمجھتے ہی اس کا سارا جسم جھنجھنا اٹھا۔ ایک گھر کے سامنے کوئی عورت ٹوٹکا، کر گئی تھی۔ کچھ ٹھیکیوں میں پیٹے کنکر اور گندھے آٹے کا پتلا اور اس میں ٹھونسی ہوئی لکڑی کی کھپچیاں۔ شاید کوئی بدنصیب عورت اپنی مصیبت کسی دوسرے کے گھر پر ڈالنے کے لیے 'ٹوٹکا'، کر گئی تھی۔ نتھو نے اسے اپنے لیے برا شگون سمجھا۔ ایسی رات گزارنے کے بعد ٹوٹکے پر پاؤں پڑ جانے سے اس کو بڑا وہم ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گیا۔ عام طور پر یہ ٹوٹکے بچوں کے اوپر سے 'گرہ'، ٹالنے کے لیے کیے جاتے ہیں جبکہ نتھو کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ مطمئن سا پھر آگے بڑھ گیا۔

اس گلی سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھا۔ جہاں سے وہ گلی میں داخل ہوا تھا، وہاں سے کچھ فاصلے پر مسلمانوں کے گھر تھے۔ دو ایک دھوبیوں کے اور کچھ قصائیوں کے، جو گلی کے کنارے گوشت کی دکانیں لگاتے تھے۔ یہیں پر ممدو حمام والا بھی رہتا تھا۔ آگے چل کر کچھ گھر ہندوؤں اور سکھوں کے بھی پڑتے تھے اور گلی کے آخری سرے تک پہنچتے پہنچتے پھر مسلمانوں شیخوں کے گھر شروع ہو جاتے تھے۔

ایک گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے اندر سے کسی بوڑھے کی آواز سنائی دی "یا اللہ! کل دی خیر،

کل دا بھلا"۔ بوڑھا جاگ کر سب ہی کے لیے دعا کر رہا تھا۔ پھر اس کے کھنکھارنے اور انگڑائی لے کر اٹھنے کی آواز آئی۔ لوگ جاگ رہے تھے۔

وہ کچھ ہی قدم آگے بڑھا ہوگا کہ اس کا دایاں پاؤں پھر کسی لسلسی چیز میں دھنس گیا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ ساتھ ہی گوبر کی بدبو آئی۔ اس نے کھینچ کر پاؤں نکالا تو ادھ ٹوٹا گھڑا لڑھک گیا۔ وہ سمجھ گیا! اور جہاں اس کے منھ سے گندی گالی نکلنے والی تھی، وہاں اس کی ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ٹونے کا برا شگون اس کو کرنے جیسے دھو، پونچھ ڈالا ہو۔ کچھ دن سے تپش بڑھ رہی تھی اور آسمان سے کوئی چھینٹا بھی نہیں گرا تھا۔ جب کبھی چھینٹا پڑنے میں دیر ہو جاتی تو محلوں کے من چلے لڑکے ٹوٹے گھڑے میں گوبر، اور گائے اور گھوڑے کا پیشاب اکٹھا کر کے کسی موذی کے گھر کی ڈیوڑھی میں پھینک آتے تھے۔ اس کو بارش بلانے کا شگون مانا جاتا تھا۔

ایک گھر کے سامنے ایک آدمی گلی میں بندھی گائے کے سامنے کھڑا سانی کر رہا تھا۔ قریب ہی کسی گھر میں سے پیالے اور چوڑیاں کھنکنے کی آواز آئی۔ شاید چائے تیار ہو رہی تھی۔ اتنے میں کوئی عورت دوپٹے میں سر اور منھ لپیٹے پاس سے گزری۔ اس نے ہاتھ میں کوئی کٹوری اٹھا رکھی تھی۔ شاید وہ عورت مندر یا گوردوارے میں ماتھا ٹیکنے جا رہی ہے، نتھو نے دل ہی دل میں کہا۔ دن کا کاروبار عام اور سہل انداز میں شروع ہو رہا تھا۔ اسی وقت گلی کے ایک سرے سے نتھو کو 'اکتارہ' بجانے کی اور ساتھ میں کسی فقیر کے گانے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز اس نے پہلے بھی سنی تھی لیکن فقیر کو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ صبح کو جھٹ پٹے میں یہ فقیر گزر جایا کرتا تھا۔ خاص طور پر رمضان کے دنوں میں جب مسلمان لوگ اٹھ کر سحری کھاتے تھے۔ نزدیک پہنچنے پر اس نے دیکھا، فقیر اونچے قد اور چھریرے بدن کا بوڑھا آدمی تھا۔ چھوٹی سی سفید داڑھی اور سر پر چندیا ٹوپی اور لمبا چغہ۔ کندھے پر بڑا سا جھولا لٹک رہا تھا۔ نتھو رک گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ فقیر کے گیت کے بول اس کے کانوں میں پڑیں۔

"تینوں غافلاں جاگ نہ آئی چڑیاں بول رہیاں۔۔۔!" (اے غافل تو ابھی تک پڑا سو رہا ہے جبکہ پرندے چہچہانے لگے ہیں!)

فقیر گیت گاتا چلا جا رہا تھا۔ اکتارے کی دھیمی آواز جو اکثر نتھو کے خوابوں میں گھل مل جایا کرتی تھی اور نیند کی حالت میں بھی اسے پیاری لگتی تھی آج اسے اور بھی میٹھی لگی۔ اس نے جیب سے ایک پیسہ نکال کر فقیر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"اللہ سلامت رکھے! گھر بھرے رہیں۔" فقیر نے دعا دی۔

نتھو آگے بڑھ گیا۔

گلی پار کرنے کے بعد وہ کچھ اجالے میں آ گیا تھا۔ یہاں سے تانگہ چلانے والے گاڑی بانوں کا محلہ شروع

ہو جاتا تھا۔ سڑک پر پہنچنے کے بعد بھی کیفیت زیادہ نہیں بدلی تھی۔ صرف اجالا ہو چلا تھا۔ سڑک کے کنارے دو تین تانگے کھڑے تھے جن کے بم آسمان کی طرف اس طرح اٹھے ہوئے تھے جیسے سب لوگوں کے لیے دعا کر رہے ہوں۔ لمبی دیوار کے سامنے کھڑا ایک گاڑی بان اپنے گھوڑے کو 'کھریرا' کر رہا تھا۔ نزدیک ہی دو عورتیں گوبر کی تھاپیاں بنا کر ابھی سے مٹی کی دیوار پر لگا رہی تھیں۔ سڑک کے درمیان ایک گھوڑا اپنے آپ اکیلا ہی سبک انداز سے چہل قدمی کر رہا تھا۔ صبح سویرے کے پرسکون سہانے وقت میں جگہ جگہ زندگی ہلکی ہلکی انگڑائیاں لے رہی تھی۔

ننھو کو ایسا لگا جیسے وہ بھی ٹہلنے نکلا ہو۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے کوئی دیکھے یا پہچانے لیکن ساتھ ہی اس کے دل کی ہڑبڑاہٹ بڑی حد تک دور ہو چکی تھی اور وہ خود بھی چہل قدمی کے انداز میں ایک محلّے سے دوسرے محلّے میں جا رہا تھا۔

اچانک اسے خیال آیا، چھکڑا کہاں تک پہنچا ہوگا؟ وہ کس طرف جا رہا ہوگا؟ بڑا عجیب سا سوال تھا لیکن یہ خیال آتے ہی یکایک اس کے قدم تیز ہو گئے۔ کیا وہ دور، چھاؤنی میں پہنچ چکا ہوگا؟ ممکن ہے اس وقت سلوتری صاحب کے ہسپتال کے سامنے کھڑا ہو۔ ننھو کے منھ سے گالی نکلی۔ کیا دن کے وقت سوّر کو نہیں مارا جا سکتا تھا۔ سلوتری کو مرے ہوئے سوّر کی کیا ضرورت تھی۔ ضرور کہیں سوّر کا گوشت بیچنے کے لیے اسے مروایا ہوگا۔ رات کے واقعات یاد کر کے اس کے جسم میں سنسنی سی پیدا ہو گئی۔ اس نے بڑی بری حالت میں رات کاٹی تھی۔ پسینہ۔ سوّر کے جسم کی بدبو، بند کوٹھری، سوّر کی ہنکاریں، سوّر نے تین بار اپنی تھوتھنی سے اس کے پیر چاٹے تھے اور اس کی کھال بھی نوچ ڈالی تھی۔ سوّر کے مرتے مرتے ننھو خود ادھ مرا سا ہو گیا تھا۔ بھاڑ میں جائے مراد علی، جہاں ننھو کا دل چاہے گا، وہیں گھومے گا۔ اس نے جیب پر ہاتھ لگا کر پھر سے نوٹ کی چرمراہٹ سن لی۔ ہمیں کیا، ہم نے تو اپنے پیسے کھرے کر لیے ہیں۔

چرنی کے پاس پہنچ کر وہ دائیں طرف گھوم گیا۔ تب ہی دور سے شیخوں کی باغ کی گھڑی کی آواز سنائی دی۔ شاید چار کا گھنٹہ بجا رہی تھی۔ اس وقت اس کی آواز کتنی صاف سنائی دے رہی تھی۔ دن کے وقت کبھی نہیں سنی جا سکتی تھی۔ شہر کے شور میں کھو جاتی تھی۔ لیکن اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے آسمان کے راستے سے آ کر اس کے کانوں میں پہنچی ہو۔ کچھ ہی لمحوں بعد، دور شہر کے مرکزی حصّے میں ایک ٹیلے پر بنے شوالے سے مندر کی آواز آئی۔ آوازیں مسلسل بڑھ رہی تھیں۔ جگہ جگہ گھروں کے دروازے کھل رہے تھے۔ کچھ لوگ کھنکھارتے، اپنی چھڑیاں سڑک پر پٹ پٹ مارتے، گھومنے جا رہے تھے ایک بکروا ہا، اپنی تین چار بکریاں ساتھ لے کر ان کا دودھ بیچنے کے لیے نکل پڑا تھا۔ ننھو کے قدم پھر ڈھیلے پڑ گئے۔ اسے صبح کی ٹھنڈی سہانی ہواؤں میں گھومنے سے بڑی فرحت مل رہی تھی۔

اب وہ گاڑی بانوں کا محلہ طے کر چکا تھا اور امام دین کے محلّے کے باہر 'کمیٹی' کے بڑے میدان کے کنارے لگی ریلنگ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ دائیں طرف ریلنگ کے پار ڈھلان تھا اور ڈھلان ختم ہونے پر بہت بڑا میدان شروع ہوتا تھا۔ اس میدان میں آئے دن کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا تھا۔ جاڑوں میں ہر اتوار کو یہاں لڑائی ہوا کرتی تھی۔ لوگ شرطیں باندھتے تھے۔ زخمی کتا میدان سے بھاگنے کی کوشش کرتا تو لوگ اسے بھاگنے نہیں دیتے تھے۔ اسی میدان میں نعرہ بازی بھی ہوتی تھی۔ ہزاروں کا اجتماع ہوتا تھا۔ یہیں پر باہر سے آنے والے سرکس لگا کرتے تھے۔ تارا بائی کا سرکس، پرشورام کا سرکس، یہیں پر بیساکھی کا ڈھول بجا کرتا تھا اور دنگل ہوا کرتے تھے۔ اسی جگہ اب سیاسی جلسے ہونے لگے تھے۔ اب تو آئے دن جلسے ہوتے تھے۔ مسلم لیگ کے جلسے ہوتے تھے اور بیلچہ پارٹی کے بھی۔ جبکہ کانگرس کے جلسے یہاں سے دور اناج منڈی کے پاس کے میدان میں ہوتے تھے۔

اس نے جیب سے بیڑی نکالی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ریلنگ پر بیٹھ کر بیڑی کے کش لینے لگا۔

اسی وقت امام دین کے محلّے کے پیچھے واقع مسجد میں سے اذان کی آواز آئی۔ صبح کے ہلکے سے اندھیرے کی ایک اور پرت چھن کر گر گئی تھی اور آس پاس کے گھر کچھ صاف نظر آنے لگے تھے۔ نتھو ریلنگ پر سے اتر آیا اور بیڑی بجھا دی اور دوبارہ امام دین کے محلّے کی گلیوں کا رخ کیا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ مراد علی 'کمیٹی' کے میدان کے ایک طرف کہیں رہتا ہے۔ اسے یقینی طور پر تو نہیں معلوم تھا لیکن اس نے ایک دو بار مراد علی کو اس طرف سے آتے دیکھا تھا۔ یوں تو مراد علی شہر بھر میں گھومتا تھا۔ اپنی پتلی سی چھڑی اٹھائے سڑکوں کے بیچوں بیچ چلتا۔ کبھی کسی محلّے میں تو کبھی کسی محلّے میں نظر آیا کرتا تھا۔ اس کی گھنی کالی مونچھوں کے درمیان اس کے دانت کبھی بھی نہیں دکھائی دیتے تھے۔ ہنستا، تب بھی دانت نظر نہیں آتے تھے۔ صرف باچھیں ہی کھل جاتی تھیں۔ اور اس کے گول مٹول چہرے میں آنکھیں، چھوٹی چھوٹی پینی سانپ کی آنکھوں کی طرح چمکتی رہتی تھیں۔ کیا معلوم، وہ یہیں کہیں پھر سے نظر آجائے۔ یہاں سے چل دینا ہی بہتر ہے۔ اگر کہیں اس نے دیکھ لیا تو بگڑے گا۔ مراد علی نے نتھو سے تاکید کی تھی کہ سؤر کی لاش اٹھوا دینے کے بعد وہ اسی کوٹھری میں اس کا انتظار کرے۔ لیکن نتھو وہاں سے بھاگ آیا تھا۔ سؤر کے مارنے کے پیسے مل گئے تو پھر کیوں وہاں کچرے اور بدبو میں پڑا رہتا۔

نتھو ایک تنگ اور پیچ در پیچ گلی میں داخل ہو گیا اور کچھ آگے جا کر بائیں طرف ایک اور گلی میں مڑ گیا۔ جو بل کھاتی ہوئی شمال کی طرف چلی جا رہی تھی۔ تھوڑی دور جانے پر اس کے کانوں میں کسی گانے والی منڈلی کی آواز آئی۔ وہ کچھ ہی قدم اور آگے بڑھ پایا تھا کہ دور سامنے والی گلی کے موڑ پر اسے گانے والوں

کی آواز زیادہ صاف اور تیز سنائی دینے لگی۔ نتھو سمجھ گیا، یہ کوئی پربھات پھیری کی منڈلی ہوگی۔ ان دنوں شہر میں کچھ زیادہ ہی جلسے اور جلوس نظر آنے لگے تھے۔ نتھو کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ فضا میں نعرے گونج رہے تھے جنھیں وہ بہت دن سے سنتا چلا آ رہا تھا۔ یہ گانے والی منڈلی کانگرس والوں کی معلوم ہو رہی تھی کیونکہ منڈلی کے آگے آگے کوئی آدمی ترنگا جھنڈا اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ جب منڈلی نزدیک پہنچی تو نتھو ایک طرف کو دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ منڈلی گاتی ہوئی سامنے سے گزرنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ آٹھ دس آدمی تھے، ایک دو کے سر پر گاندھی ٹوپی تھی۔ کچھ لوگوں کے سر پر فیض ٹوپی تھی۔ دو ایک سردار بھی تھے۔ عمر رسیدہ لوگ بھی تھے اور جوان بھی۔ اس کے پاس گزرنے پر ایک آدمی نے اونچی آواز میں نعرہ لگایا۔

"قومی نعرہ"

"بندے ماترم"

"بول بھارت ماتا کی جے"

"بول مہاتما گاندھی کی جے"

اس کے بعد صرف لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد کچھ ہی فاصلے پر، جہاں ایک اور گلی اس گلی کو کاٹتی تھی، ایک اور نعرہ بلند ہوا۔

"پاکستان زندہ باد!"

"پاکستان زندہ باد!"

"قائداعظم زندہ باد!"

"قائداعظم زندہ باد!"

نتھو نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تین آدمی گلی کے موڑ پر اچانک نمودار ہو گئے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ نتھو کو ایسا لگا جیسے وہ گلی کے بیچ میں کھڑے ہو کر اس گانے والی منڈلی کا راستہ روک رہے تھے۔ ان دونوں آدمیوں میں سے ایک کے سر پر رومی ٹوپی تھی اور آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ تھا وہ آدمی گلی کے درمیان کھڑا اس طرح پکار رہا تھا جیسے منڈلی کو للکار رہا ہو۔

"کانگرس ہندوؤں کی جماعت ہے۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔"

اس کا جواب منڈلی کی طرف سے ایک بڑی عمر کے آدمی نے دیا۔

"کانگرس سب کی جماعت ہے۔ ہندوؤں کی، سکھوں کی، مسلمانوں کی۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں محمود صاحب، آپ بھی پہلے ہمارے ساتھ تھے۔"

اور اس ضعیف آدمی نے آگے بڑھ کر رومی ٹوپی والے کو بانہوں میں بھر لیا۔ منڈلی میں سے کچھ لوگ ہنسنے لگے۔ رومی ٹوپی والے نے خود کو بانہوں میں سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سب ہندوؤں کی چالاکی ہے، بخشی جی۔ ہم سب جانتے ہیں آپ جو چاہیں کہیں۔ کانگرس ہندوؤں کی جماعت ہے۔ کانگرس ہندوؤں کی جماعت ہے اور مسلم لیگ مسلمانوں کی۔ کانگرس مسلمانوں کی رہنمائی نہیں کر سکتی۔"

دونوں منڈلیاں ایک دوسرے کے سامنے کھڑی تھیں۔ لوگ باتیں بھی کر رہے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف چلّا بھی رہے تھے۔

بزرگ کانگریسی کہہ رہا تھا۔

"وہ دیکھ لو۔ سکھ بھی ہیں، ہندو بھی ہیں، مسلمان بھی ہیں۔ وہ عزیز سامنے کھڑا ہے، حکیم جی کھڑے ہیں۔"

عزیز اور حکیم دونوں ہندوؤں کے کتّے ہیں۔ ہمیں ہندوؤں سے نفرت نہیں ان کے کتّوں سے نفرت ہے۔" اس نے اتنے غصّہ میں کہا کہ کانگرس منڈلی کے دونوں مسلمان کھسیانے ہو گئے۔

"مولانا آزاد ہندو ہیں یا مسلمان؟" بزرگ نے کہا" وہ تو کانگرس کے صدر ہیں۔"

"مولانا آزاد ہندوؤں کا سب سے بڑا کتّا ہے۔ گاندھی جی کے پیچھے دم ہلاتا پھرتا ہے، اسی طرح جیسے یہ کتّے آپ کے پیچھے دم ہلاتے پھرتے ہیں۔"

اس بات پر وہ بزرگ بڑے پُر سکون انداز میں بولے۔

"آزادی سب کے لیے ہے۔ سارے ہندوستان کے لیے ہے۔"

"ہندوستان کی آزادی ہندو کے لیے ہوگی۔ مسلمان تو آزاد پاکستان میں ہی آزاد ہوں گے۔"

اسی وقت گانے والی منڈلی میں سے ایک دبلا پتلا سردار، میلے کچیلے کپڑے پہنے اور بغل میں بینت دبائے آگے بڑھا اور چلّا کر بولا۔

"پاکستان میری لاش پر۔۔۔"

اس پر کانگرس منڈلی کے لوگ ہنسنے لگے۔

"چپ اوئے چپ!" کسی نے اس کو چپ کرانے کی کوشش کی۔ ننھو کو بھی اس کی تیکھی، اکھڑی اکھڑی آواز عجیب سی لگی تھی۔ لوگوں کو ہنستے دیکھ کر اس نے یہ سمجھ لیا کہ یہ کوئی سنکی آدمی ہوگا۔

لیکن وہ بولے جا رہا تھا" گاندھی جی کا فرمان ہے کہ پاکستان ان کی لاش پر بنے گا میں بھی پاکستان

نہیں بننے دوں گا۔"

لوگ پھر ہنسنے لگے۔

"غصہ تھوک دو جرنیل۔"

"بس، بس، جرنیل۔ کبھی خاموش بھی رہا کر۔" بخشی جی نے کہا۔

اس پر جرنیل بگڑ گیا۔

"مجھے کوئی چپ نہیں کرا سکتا۔ میں نیتاجی سبھاش بوس کی فوج کا آدمی ہوں۔ میں سب کو جانتا ہوں۔ آپ کو بھی جانتا ہوں۔۔۔"

لوگ پھر ہنسنے لگے۔ لیکن جب منڈلی آگے بڑھنے لگی تو رومی ٹوپی والے نے راستہ روک لیا۔

"آپ ادھر سے مت جائیے۔ یہ مسلمانوں کا محلّہ ہے۔"

"کیوں؟" ضعیف آدمی بولا۔ "آپ سارے شہر میں پاکستان کے نعرے لگاتے ہیں تو کوئی آپ کو روکتا ہے؟ اور ہم تو صرف حبّ الوطنی کے گیت گا رہے ہیں۔"

یہ سن کر رومی ٹوپی والا کچھ پگھل گیا اور بولا۔

"آپ لوگ جانا چاہتے ہیں تو جائیے لیکن ہم ان کتّوں کو اپنے محلّے میں گھسنے نہیں دیں گے۔"

پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس طرح پھیلا دیے جیسے گلی کا راستہ دوبارہ روک رہا ہو۔

اسی وقت نتھو نے دیکھا' رومی ٹوپی والے سے ذرا دور پیچھے کی طرف مراد علی کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی نتھو کا سارا بدن جھنجھنا اٹھا۔ 'یہ کہاں سے پہنچ گیا؟' نتھو دیوار کے ساتھ سرکتا ہوا گانے والی منڈلی کے پیچھے ہو گیا۔ 'مراد علی نے کہیں دیکھ تو لیا؟' منڈلی کے ممبروں کے پیچھے کھڑے ہونے سے وہ سچ مچ چھپ گیا تھا۔ یہاں سے مراد علی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر گم صم کھڑا رہنے کے بعد اس نے سر ٹیڑھا کر کے دیکھا۔ مراد علی ابھی تک وہیں کھڑا تھا اور بحث میں الجھے لوگوں کی باتیں دور سے سن رہا تھا۔

نتھو دھیرے دھیرے پیچھے کی طرف کھسکنے لگا۔ جب تک یہ لوگ بحث میں الجھے رہیں گے مراد علی بھی شاید وہیں بُت بنا کھڑا رہے گا۔ یہی موقع ہے بھاگ نکلنے کا۔ اگر مراد علی نے دیکھ لیا تو وہ ضرور ڈیرے پر پہنچ کر جواب طلب کرے گا۔ کچھ دور تک سرکتے رہنے کے بعد نتھو نے اچانک پیٹھ موڑی اور تیز رفتار سے چلنے لگا۔ جیسے ہی گلی کا موڑ آنکھوں سے اوجھل ہوا' وہ سرپٹ بھاگنے لگا۔

4

ٹیلے کے اوپر پہنچ کر دونوں نے اپنے گھوڑے روک لیے۔ سامنے دور تک کشادہ گھاٹی پھیلی ہوئی تھی جو پہاڑوں کے دامن تک چلی گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دور افق تک سات رنگی دھول اڑ رہی ہے۔ بڑا میدان، کہیں کہیں چھوٹی پہاڑیاں اور ان پر شفاف نیلا آسمان، جس کی شفاف بلندیوں میں چیلیں تیر رہی تھیں۔ بائیں طرف اونچا پہاڑ تھا جسے آسمانی رنگت ڈھانکے ہوئے تھی۔ پہاڑ کی بلندی مغرب کی سمت میں ڈھلتے ڈھلتے اتنی کم ہوگئی تھی کہ میدانوں کو چھونے لگی تھی۔ دائیں طرف سرخی مائل پہاڑیاں فاصلے کی دھند کی وجہ سے ایسی لگ رہی تھیں جیسے دھول میں اٹی کچھ شکلیں ہوں۔

طلوع آفتاب کے وقت دکھائی دینے والا یہ منظر اپنی بیوی لیزا کو بھی دکھانے کی غرض سے رچرڈ اس کو یہاں لے کر آیا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر لیزا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس منظر کو دیکھ کر لیزا پر کیا اثر ہوا۔ اس خوبصورت منظر کو وہ اس ڈھنگ سے لیزا کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا، جیسے اتنے دن تک اسے ایک تحفے کی طرح سنبھال کر رکھے رہا ہو۔

صبح کی سہانی ہوا میں لیزا کے سنہرے بال آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ اس کی نیلی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی پاکیزگی اور چمک تھی۔ صرف آنکھوں کے نیچے ہلکے ہلکے گومڑ بننے لگے تھے جو تھکاوٹ سے، زیادہ بیئر پینے سے، دیر تک سوتے رہنے سے پیدا ہو گئے تھے۔

لیزا کو خوش کرنے کی غرض سے وہ اسے یہاں لایا تھا۔ اب کی بار تقریباً چھ ماہ بعد لیزا ولایت سے واپس آئی تھی اور رچرڈ نہیں چاہتا تھا کہ پچھلی کہانی دہرائی جائے اور

لیزا نئی جگہ پر اکتاہٹ محسوس کرنے لگے اور پریشان ہو کر ایک بار پھر ولایت کو واپس چلی جائے۔ اگر لیزا کو یہ شہر پسند نہیں آیا تو یہاں کی رہائش دونوں کے لیے جہنم بن جائے گی۔ وہ دن بھر دفتر میں کام کرنے کے بعد واپس آیا کرے گا تو دونوں میں جھڑپ شروع ہو جایا کرے گی۔ اس لیے رچرڈ نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ صبح کا وقت وہ لیزا کے ساتھ گزارا کرے گا۔ اسی وجہ سے گزشتہ ایک ہفتے سے، جب سے لیزا آئی تھی، وہ کبھی ٹھنڈی سڑک پر اور کبھی ٹوپی پارک میں گھمانے کی غرض سے اور کبھی گھڑ سواری کے لیے اسے باہر لاتا رہا تھا۔ اپنی طرف سے لیزا بھی کوشش کر رہی تھی کہ وہ بھی رچرڈ کی دلچسپیوں میں حصہ لینے لگے اور اپنے دل کو لگائے رکھے۔ وہ ضلع کے ڈپٹی کمشنر کی بیوی تھی اس لیے اگر وہ اکیلی بھی چھاؤنی صدر میں گھومتی تو دیسی لوگ اٹھ اٹھ کر سلام کرتے تھے۔ بھاگ بھاگ کر اس کا حکم بجا لاتے تھے۔ لیکن کوئی کہاں تک اکیلا گھوم سکتا تھا۔ اس لیے دونوں کے ہی دل میں اندر ہی اندر، یہ اندیشہ تھا کہ یہ صورت حال زیادہ مدت تک چل سکے گی یا نہیں۔ خواہش کے باوجود نبھ سکے گی یا نہیں۔

"بہت خوبصورت منظر ہے۔" لیزا بولی۔ "وہ سامنے کون سا پہاڑ ہے؟ کیا اسی جگہ سے ہمالیہ کے پہاڑ شروع ہو جاتے ہیں؟"

"ہاں یہی سمجھو۔" رچرڈ نے پُر جوش مسرت کے ساتھ کہا۔ "اور یہ وادی آگے چل کر اونچے پہاڑوں کے درمیان سے گزرتی، سیکڑوں میل دور تک چلی گئی ہے۔"

"کتنی سنسان وادی ہے۔" لیزا نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں لیزا۔ یہ تاریخی وادی ہے۔ ہندوستان میں آنے والے سب ہی حملہ آور اسی راستے سے آئے تھے، وسط ایشیا سے آنے والے اور منگولیا سے آنے والے بھی۔" رچرڈ کا جوش اور بڑھتا گیا۔ "سکندر بھی اسی راستے سے ہندوستان آیا تھا۔ آگے چل کر یہ وادی دو راستوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ایک راستہ تبت کی طرف چلا گیا ہے، دوسرا افغانستان کی طرف۔ اسی راستے سے تاجر لوگ اور بدھ مذہب کے پرچارک بھی جاتے تھے۔ بڑا اہم تاریخی علاقہ ہے۔ میں تو گزشتہ ایک مہینے سے اسی علاقے میں گھوم رہا ہوں۔ مؤرخ کے لیے تو یہ علاقہ بیش قیمت ہے۔ جگہ جگہ پرانی عمارتوں کے کھنڈر ہیں، قلعے، بدھ وِہار اور۔"

"رچرڈ! تم تو اس طرح باتیں کر رہے ہو جیسے یہ تمہارا اپنا ملک ہو۔" لیزا نے ہنس کر کہا۔

"ملک اپنا نہیں ہے لیزا، لیکن تاریخ تو اپنی ہے!" رچرڈ نے مسکرا کر کہا۔ پھر گھڑسواری کی ہیئت سے پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "جانتی ہو، اس پہاڑ کے پیچھے ٹیکسلا کے کھنڈر ہیں۔ ٹیکسلا کے بارے میں جانتی ہو، نا؟"

"ہاں۔ نام سنا ہے۔"

"وہاں کسی زمانے میں بہت بڑی یونی ورسٹی ہوا کرتی تھی۔"

لیزا مسکرا دی۔ وہ سمجھ گئی کہ اب رچرڈ وادی کی پوری تاریخ بتائے گا۔ اسے رچرڈ کا جوش اچھا لگا۔ رچرڈ سوکھے پتھروں کے بارے میں بھی بڑے جوش کے ساتھ باتیں کرسکتا ہے۔ اس کے اندر بچوں کا جیسا جوش و خروش ہے۔ ڈپٹی کمشنر ہونے کے باوجود اس کے مزاج میں بھولاپن ہے۔ کاش وہ بھی ان باتوں میں دلچسپی لے سکتی۔

"وہاں پر ایک میوزیم بھی ہے۔ تمھیں پسند آئے گا۔ وہاں سے حال ہی میں گوتم بدھ کی ایک مورتی لایا ہوں۔"

"کیوں؟ پہلے تمھارے پاس کیا کم مورتیاں تھیں جو ایک اور اٹھا لائے ہو۔"

"وہاں نزدیک ہی کھدائی ہو رہی تھی۔ بہت سی مورتیاں ملی ہیں۔ کیوریٹر نے ایک مورتی مجھے تحفے میں دی ہے۔"

لیزا کی نگاہوں کے سامنے بنگلے کا بڑا کمرہ گھوم گیا جس میں رچرڈ نے طرح طرح کی مورتیاں اور ہندوستانی فنون لطیفہ کے نمونے سجا رکھے تھے، اور الماریوں میں بے شمار کتابیں ٹھسا ٹھس بھری تھیں۔ یہی دھن اس پر کینیا میں بھی سوار ہوئی تھی۔ وہاں افریقہ کے فنون لطیفہ کے نمونے سجا رکھے تھے۔ طرح طرح کے تیر کمان، منکے، پرندوں کے پر، ٹوٹم ـــــ اور یہاں آکر وہ مورتیاں اکٹھی کرتا رہتا ہے۔

لیزا کا دھیان پھر آس پاس کے مناظر کی طرف گیا۔ نیچے، بائیں طرف، چھوٹے چھوٹے پیڑوں کا گھنا جنگل تھا۔ اسی کے درمیان سے، گھوڑوں پر سوار، وہ ٹیلے کے اوپر آئے تھے۔ جنگل میں سے نکل کر ٹیلے کے اوپر آجانے پر منظر صاف ہو گیا تھا۔ دائیں طرف چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے اور ان کے آگے میدان تھا جو پھیل کر دور دھندلکے میں کھو گیا تھا۔

"یہاں کی مٹی کیسی ہے، لال لال رنگ کی۔" لیزا ٹیلوں کی طرف دیکھ کر بدبدائی۔ پھر رچرڈ کی طرف مڑ کر بولی۔ "سڑک کہاں ہے؟" پھر تمسخر کے لہجے میں بولی "وہ سڑک ـــ تو

دکھاؤ جس پر سے ہو کر سکندر ہندوستان آیا تھا۔"

"ان دنوں پکی سڑکیں نہیں تھیں، لیزا۔ لیکن ایک پرانی سڑک، تقریباً چار سو سال پرانی، اس ٹیلے کے پیچھے سے ہو کر نکل گئی ہے۔"

لیزا نے رچرڈ کی طرف دیکھا۔ موٹے فریم کے چشمے کے نیچے رچرڈ کے چہرے کا نچلا حصّہ بڑا نازک لگتا تھا۔ لیزا کا دل چاہا کہ رچرڈ اس علاقے کے پتھروں اور کھنڈروں کا ذکر چھوڑ کر اس سے لاڈ پیار کی باتیں کرے، لیکن رچرڈ اپنی لہر میں بولے جا رہا تھا۔

"اس علاقے کے لوگ بہت پرانے زمانے سے، سیکڑوں برسوں سے یہاں بسے ہوئے ہیں۔" پھر لیزا کی طرف دیکھ کر بولا "کیا یہاں کے لوگوں کو تم نے دھیان سے دیکھا ہے، ایک ہی نسل کے لوگ ہیں۔ ناک نقشے سب کے ایک جیسے ہیں، ایک ہی طرح کی ناک، ہونٹ، چوڑا ماتھا، بھورے رنگ کی آنکھیں۔ یہاں کے لوگوں کی آنکھیں بھورے رنگ کی ہیں، تم نے دھیان دیا، لیزا؟"

"ایک ہی نسل کے لوگ کیسے ہو سکتے ہیں، رچرڈ، جبکہ تم کہتے ہو کہ اس راستے سے طرح طرح کے لوگ آتے رہے ہیں؟"

"ہیں۔ نہیں، لیزا، یہی بات تو لوگ بھول جاتے ہیں۔" رچرڈ کی آواز میں ایک طرح کا جوش پیدا ہو گیا تھا، جیسے وہ اپنی کسی تحقیق کو درست ثابت کرنا چاہ رہا ہو۔ "جو لوگ وسط ایشیا سے سب سے پہلے آئے تھے، صدیوں بعد ان کے پوتے نواسے دوسرے ملکوں سے یہاں آئے۔ نسل سب کی ایک ہی تھی۔ وہ لوگ جو آریہ کہلاتے تھے اور ہزاروں سال پہلے یہاں آئے اور وہ بھی جو مسلمان کہلاتے تھے اور تقریباً ایک ہزار سال پہلے یہاں آئے، ایک ہی نسل کے لوگ تھے۔ سب ہی ایک ذات کے لوگ تھے۔"

"ان باتوں کو یہ لوگ بھی تو جانتے ہوں گے۔"

"یہاں کے لوگ کچھ نہیں جانتے ہیں۔ یہ وہی باتیں جانتے ہیں جو ہم انھیں بتاتے ہیں۔" پھر تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر بولا "یہ لوگ اپنی تاریخ کو نہیں جانتے ہیں۔ صرف اس کا نام لیتے ہیں۔"

لیزا اکتانے لگی تھی۔ رچرڈ پر کوئی دھن سوار ہو جاتی تو وہ سب کچھ بھول جاتا تھا۔

جتنا وہ اپنی دھن میں کھو کر آگے بڑھ جاتا تھا، لیزا اسے دھکیل کر اتنا ہی پیچھے لے جاتی تھی۔ اپنی کتابوں میں کھویا ہوا رچرڈ یا تو ڈپٹی کمشنر تھا، یا کوئی مؤرخ۔ لیزا کو وہ بہت چاہتا تھا۔ لیکن لیزا کے لیے اس کے پاس کوئی وقت نہیں تھا۔ گھر میں کسی الماری کے سامنے کھڑے کھڑے کسی کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے وہ اسی میں ڈوب جاتا تھا۔ اسی وجہ سے جب لیزا اکتانے لگتی تو پھر اس کی اکتاہٹ کی کوئی حد نہ ہوتی تھی۔ ہر چیز کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ لوگ زہر سے لگنے لگتے تھے۔ اور آخر میں یا تو وہ اعصاب زدگی کا شکار ہو جاتی یا پھر چھ مہینے یا سال بھر کے لیے ولایت چلی جاتی تھی۔

"یہاں پر کوئی پکنک کی جگہ بھی ہے؟" لیزا نے رچرڈ کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

رچرڈ کو دھکا سا لگا۔ لیکن یہ سوال اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

"بہت ہیں۔" پھر وہ اپنی چھڑی سے بائیں طرف اونچے پہاڑ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اس پہاڑ کی وادی میں جھرنے ہیں، گھنے پیڑوں کے جھنڈ ہیں۔ پہاڑ میں سے پھوٹنے والے پانی کے سوتے نیچے تک پہنچتے ہیں، بہت ہی خوبصورت جگہ ہے ہندوؤں نے جھرنوں کے آس پاس پتھروں کی چنائی کر کے وہاں تالاب بنا دیے ہیں۔ ایک ایک جھرنے کو الگ الگ نام دے دیا ہے۔ رام اور سیتا، اور اسی طرح اپنی دیومالا کے دیگر ناموں پر ان کے نام رکھ دیے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے رچرڈ مسکرا دیا، یہ سوچتے ہوئے کہ یہ نام لیزا کے لیے بڑے انوکھے اور اجنبی ہوں گے۔ "بہت سے مقامات ہیں۔ جگہ جگہ پر نامعلوم پیروں کی قبریں ہیں جن پر لوگ چراغ جلاتے ہیں۔ پرانے قلعے ہیں۔ مندر ہیں۔۔۔۔"

پھر بینت سے اس پہاڑ کے دامن میں پھیلے ہوئے ایک اور پیڑوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہاں تھوڑا دائیں طرف ایک اچھا پکنک کا مقام ہے۔ وہاں کسی پیر کی قبر ہے۔ کسی مسلمان پیر کی قبر۔ وہاں پر بسنت کے موسم میں ایک انوکھا میلہ لگتا ہے۔ دور دور سے ناچنے گانے والی عورتیں آ کر جمع ہوتی ہیں، اور پندرہ دن تک میلہ لگا رہتا ہے۔ دن کے وقت لوگ جوا کھیلتے ہیں اور رات کو ناچ گانا ہوتا ہے۔ تمھیں کبھی لے چلوں گا۔"

"کیا آج کل وہاں میلہ لگا ہوا ہے؟"

"ہاں لگا ہوا ہے، لیکن آج کل وہاں جانا ٹھیک نہیں۔"

"کیوں؟"

"ان دنوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی ہے۔ دنگے فساد کا ڈر ہے۔"

لیزا نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے حالات کے بارے میں سن رکھا تھا، لیکن وہ ان کے بارے میں بہت کم جانتی تھی۔

"میں تو ابھی تک ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ پہچان بھی نہیں سکتی۔ تم پہچان لیتے ہو، رچرڈ، آدمی ہندو ہے یا مسلمان؟"

"ہاں میں پہچان لیتا ہوں۔"

"گھر کا خانساماں ہندو ہے یا مسلمان؟"

"مسلمان ہے۔"

"تم کیسے جانتے ہو؟"

"اس کے نام سے۔ پھر اس کی چھوٹی سی داڑھی سے، اس کے لباس سے بھی۔ پھر وہ نماز بھی پڑھتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے کھانے پینے کے طریقے بھی الگ ہیں۔"

"تمھیں سب معلوم ہے، رچرڈ؟"

"کچھ کچھ معلوم ہے۔"

"تم کتنا کچھ جانتے ہو۔ تمھیں ڈھیروں باتیں معلوم ہیں، میں تو کچھ بھی نہیں جانتی۔ تم مجھے بھی بتانا، رچرڈ۔ میں بھی سمجھنا چاہتی ہوں۔ اور وہ تمھارا سکریٹری جو اس روز اسٹیشن پر آیا تھا، سفید دانتوں والا، وہ کون ہے، ہندو، یا مسلمان؟"

"وہ ہندو ہے۔"

"تم نے کیسے جانا؟"

"اس کے نام سے۔"

"تم نام سے ہی جان جاتے ہو۔"

"بڑا آسان ہے لیزا۔ مسلمانوں کے نام کے آخر میں دین، علی، احمد، محمد جیسے الفاظ لگے ہوتے ہیں جبکہ ہندوؤں کے نام کے پیچھے لال، چند، رام لگے ہوتے ہیں۔ روشن لال

ہوگا تو ہندو، روشن دین ہوگا تو مسلمان۔ اقبال چند ہوگا تو ہندو، اقبال احمد ہوگا تو مسلمان۔"

"اتنا کچھ تو میں کبھی بھی نہیں جان سکوں گی۔" لیزا نے دل برداشتہ ہوکر کہا۔

"اور وہ پگڑی والا آدمی کون ہے۔ جو تمھاری گاڑی چلاتا ہے اور جس کی لمبی سی داڑھی ہے؟"

"وہ سکھ ہے۔"

"اسے پہچاننا مشکل نہیں ہے۔" لیزا نے ہنس کر کہا۔

"سب ہی سکھوں کے نام پیچھے سنگھ لگا ہوتا ہے۔" رچرڈ نے کہا۔

دونوں ٹیلے سے اترنے لگے۔ ہوا میں ہلکی ہلکی تپش ہوگئی تھی۔ سورج نکل آیا تھا اور ماحول سے پُراسرار کیفیت کا پردہ اترنے لگا تھا۔

"اس علاقے میں گھومنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ تمھیں اچھا لگے گا لیزا۔ ہر ویک اینڈ، کہیں نہ کہیں نکل جایا کریں گے۔"

رچرڈ کا گھوڑا آگے آگے تھا۔ دونوں گول گول پتھروں سے بھرے سوکھے نالے کو پار کر رہے تھے۔

"اس 'ویک اینڈ' کو کہاں چلوگے۔ ٹیکسلا؟"

لیزا کے لہجے میں رچرڈ کو ہلکا سا طنز محسوس ہوا۔ رچرڈ کے لیے ٹیکسلا بہت ہی خوبصورت اور اہم مقام تھا۔ وہاں پر وہ گھنٹوں گھومنا چاہتا تھا، بار بار جانا چاہتا تھا۔ لیکن لیزا ــــ ؟ کیا لیزا کو بھی کھنڈروں میں گھومنا پسند ہوگا؟

"چند روز تک وہاں نہیں جاسکیں گے، لیزا۔ آج کل شہر میں کچھ تناؤ پایا جاتا ہے۔ جب حالات بہتر ہوجائیں گے تب چلیں گے۔ اس ویک اینڈ تو..." رچرڈ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آگے کیا کہے۔ آنے والا 'ویک اینڈ'، کیسا ہوگا، وہ کہیں لیزا کو لے جاسکے گا یا نہیں، یہ بات وہ خود بھی اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔

"کہیں نکل جائیں گے۔" وہ بدبدایا اور نیچے پہنچ کر گھوڑے کی باگ موڑدی۔

ناشتہ کرنے سے پہلے رچرڈ اور لیزا بنگلے کے ان گنت کمرے طے کرتے ہوئے بڑے کمرے میں آکر رک گئے۔ اپریل کا مہینہ شروع ہوتے ہی دن چڑھنے پر کھڑکیوں اور دروازوں پر پردے ڈال دیے جاتے تھے جس سے گھر کے اندر ہلکا سا اندھیرا چھایا

رہتا تھا اور دن کے وقت بھی بجلی کی روشنی کی ضرورت رہتی تھی۔ چاروں طرف دیواروں کے ساتھ لگی الماریوں میں کتابیں ٹھسا ٹھس بھری تھیں۔ ان کے درمیان جگہ جگہ دیوار سے لگے، لکڑی کے اونچے پیڈسٹل رکھے تھے جن پر بدھ اور بودھی ستووں، کے کئی اونچے اونچے بت رکھے تھے۔ ہر ایک بت کے اوپر بجلی کی روشنی کا الگ سے انتظام کیا گیا تھا۔ بٹن دبانے پر روشنی ایسے زاویے سے بت کے چہرے پر پڑتی کہ اس کا روپ کھل اٹھتا۔ ان کے علاوہ دیواروں پر ہندوستانی مصوری کے متعدد نمونے تھے۔ آتش دان پر ایک گڑیا اور تامر پتر پر لکھے ایک گرنتھ کو رکھا گیا تھا۔ آتش دان کے سامنے پتھر پر لکھائی کا ایک بڑا سا نمونہ لکڑی کے کندے کے سہارے کھڑا تھا۔ قریب ہی تین مونڈھے تھے اور کالی لکڑی کی ایک لمبی نیچی تپائی رکھی تھی۔ یہاں رچرڈ پائپ سلگا کر پڑھتا تھا، یہیں پر خانساماں اسٹوو پر پانی کی کیتلی اور چائے کے برتن بھی رکھ جاتا تھا۔ رچرڈ کو خود چائے بنا کر پینے کا شوق تھا۔ تپائی پر ادھ کھلی کتابیں، رسالے وغیرہ رکھے رہتے تھے اور ساتھ میں پائپ اسٹینڈ بھی ہوتا تھا جس میں طرح طرح کے سات آٹھ پائپ رکھے رہتے تھے۔ تپائی کے بالکل اوپر کی طرف بڑے گول شیڈ کا لیمپ لٹک رہا تھا۔ پڑھتے وقت بتی جلانے پر روشنی کا دائرہ ان ہی تین مونڈھوں اور تپائی پر پڑتا تھا۔ باقی کمرے میں اندھیرا رہتا تھا۔

لیزا کی کمر میں ہاتھ ڈالے رچرڈ، اسے بدھ کی وہ مورتیاں ایک ایک کر کے دکھا رہا تھا جنہیں اس نے لیزا کے چلے جانے کے بعد جمع کیا تھا۔

"بنگلہ کے باہر ہوتا ہوں تو ہندوستان کے کسی ایک شہر میں ہوتا ہوں، واپس آتا ہوں تو پورے ہندوستان میں واپس آجاتا ہوں۔" رچرڈ کہہ رہا تھا۔

موٹے کالے فریم کا چشمہ، منھ میں پائپ، کہنیوں پر لگے جھبوں والا پرانا کوٹ اور نیچے کارڈرائے کی ڈھیلی سی پتلون پہنے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتا رچرڈ کسی میوزیم کا کیوریٹر لگتا تھا۔

وہ بدھ کی ایک مورتی کے سامنے آکر رک گئے تھے۔

"بدھ کی مورتیوں کی سب سے بڑی خوبی وہ ہلکی ہلکی مسکراہٹ ہے جو ان کے ہونٹوں کے آس پاس کھیلتی ہے۔ بدھ کے چہرے کو ایسی روشنی میں رکھنا چاہیے جس میں یہ

مسکراہٹ ابھر آئے۔ ٹھہرو! میں تمھیں دکھاتا ہوں۔" رچرڈ نے کہا، اور سامنے رکھی بدھ کی مورتی کو تھوڑا سا دائیں طرف کو گھما دیا۔ پھر اس کا بٹن دبایا جس سے بدھ کے عین اوپر لٹکتی بتی روشن ہو گئی۔

"دیکھا لیزا۔ دیکھا۔" رچرڈ نے چہک کر کہا۔ لیزا کو بھی یوں محسوس ہوا جیسے بدھ کے چہرے پر اچانک مسکراہٹ کھل اٹھی ہے — ہلکی پرسکون اور کسی قدر طنز آمیز مسکراہٹ۔

"مسکراہٹ ہونٹوں کے گوشوں میں چھپی رہتی ہے، پینتالیس ڈگری کے زاویے سے ہلکی سی روشنی ڈالو تو جیسے پھوٹ کر باہر آجاتی ہے۔ اب اس کا زاویہ بدل دوں تو مسکراہٹ بہت کم ہو جائے گی۔"

لیزا نے مڑ کر رچرڈ کی چہرے کی طرف دیکھا، یہ مرد لوگ کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ کتنا مزا لے لے کر پتھروں اور کھنڈروں کے بارے میں باتیں کرتے رہتے ہیں۔ کوئی عورت ان باتوں سے واقف ہونے کے باوجود اتنا چہکے گی نہیں۔ اتنی ڈینگ نہیں مارے گی۔ اس نے رچرڈ کا بازو دبا دیا اور اس کے کاندھے پر اپنا گال رکھ دیا۔

"بدھ کی مورتیوں کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ بدھ کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی ہے۔" رچرڈ نے کہا اور جھک کر لیزا کے بالوں کو چوم لیا۔

ہر کمرے میں طرح طرح کی بتیاں تھیں۔ جہاں کہیں بیٹھنے کا انتظام تھا، وہاں سے گھنٹی کا تار باورچی خانے تک اور باہر برآمدے تک چلا گیا تھا۔

رچرڈ کو ان کمروں میں گھومتے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ضلع کا سب سے بڑا افسر ہے۔ یہاں تو وہ ہندوستان کی تاریخ کا عالم اور ہندوستانی فنون کا محقق تھا۔ البتہ جب وہ ڈپٹی کمشنر کی کرسی پر بیٹھتا تو وہ برطانوی سامراج کا نمائندہ ہوتا تھا اور ان پالیسیوں کے مطابق کام کرتا تھا جو لندن سے طے ہو کر آتی تھیں۔ ایک کام کو دوسرے کام سے الگ رکھنا، ایک جذبے کو دوسرے جذبے سے الگ رکھنا، اس کی تربیت اور اس کے مزاج کی خصوصیت تھی۔ وہ ایک طرح کا کام کرتے کرتے دوسرے بالکل مختلف کام کے لیے اپنے آپ کو ڈھال لیا کرتا تھا۔ وہ ذاتی دلچسپیوں کو سرکاری کام سے الگ رکھ سکتا تھا، الگ سے دیکھ سکتا تھا۔ ایک مخصوص ضابطے کے تحت اس کی زندگی گھومتی رہتی تھی۔ ہفتے میں تین دن وہ کچہری کرتا

تھا۔ ضلع مجسٹریٹ کی حیثیت میں مقدموں کی سماعت کرتا تھا۔ جب عدالت کی کرسی پر بیٹھتا تو بھول جاتا کہ وہ حاکموں کا نمائندہ ہے اور مقامی باشندوں کے مقدمے سن رہا ہے، تب وہ انصاف کرتا، تعزیرات ہند کی دفعات کو صحیح طور پر عمل میں لاتا۔ ایک شعبے کے افکار اور جذبات دوسرے شعبے میں دخل انداز نہیں ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے اس کو دماغی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ وہ کبھی کسی مصیبت کا شکار نہیں ہوتا تھا۔ اس کے اپنے عقائد اور رجحانات کیا تھے، اس کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل تھا۔ شاید رچرڈ نے کبھی یہ سوال اپنے آپ سے بھی نہیں کیا ہوگا۔ جب کبھی کوئی مصیبت کھڑی ہوتی تھی تو وہ اپنے محسوسات اور خیالات کو اپنی ڈائری میں انڈیل دیتا تھا۔ انتظامی امور میں اس کے ذاتی رجحانات کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا بلکہ اس وقت وہ اس کے لیے اجنبی ہوتے تھے۔ یہ تصور کہ ہمارے عمل کو ہمارے افکار کا آئینہ دار ہونا چاہیئے" ایک ایسا بھونڈا آدرش واد ہے جس سے ہر شخص سول سروس میں پہنچتے ہی اپنا دامن چھڑا لیتا ہے۔ پھر رچرڈ کی اپنی حیثیت کیا تھی؟ ایڈمنسٹریشن میں اس کی ذاتی دین کس بات میں تھی؟ یہ اس کی اس لیاقت میں تھی جس کے تحت وہ برٹش سرکار کی پالیسیوں کو بہ روئے کار لاتا تھا۔ اس کی اس تیکھی نظر اور سوجھ بوجھ میں تھی جس سے وہ صورت حال کو سمجھ لیتا اور حقیقت کا پتہ لگا لیتا تھا۔ اس دانائی میں تھی جس سے برطانوی سرکار کی پالیسیوں کو خفیہ طور پر، بغیر کسی آہٹ کے، عملی جامہ پہنایا جاتا تھا۔ یوں تو یہ سوال بھی عجیب سا ہے کہ اس کے ذاتی رجحانات کیا تھے؟ کوئی بھی آدمی اپنے پیشے کا انتخاب کرتے وقت اس کے اخلاقی پہلو کے بارے میں سوچتا ہی کب ہے۔ وہ تو صرف ذاتی اغراض و مقاصد کے بارے میں سوچتا ہے۔

ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے دونوں ڈائننگ روم کی طرف چل پڑے۔ لیزا کو گھر بھر میں یہی کمرہ سب سے زیادہ پسند تھا۔ بلوط کی لکڑی سے بنی کالے رنگ کی گول میز کے وسط میں پیتل کی ایک چوڑی گول طشتری رکھی تھی جس میں لال گلاب کے پھول چن چن کر بھر دیے گئے تھے۔ اس طشتری کے عین اوپر جالی دار شیڈ والا بجلی کا لیمپ تھا، جو چھت سے لٹک کر سیدھا طشتری کے اوپر اتر آیا تھا۔ روشنی کا دائرہ سیدھا پھول کی طشتری پر پڑ رہا تھا اور جالی دار شیڈ میں سے روشنی چھن چھن کر میز پر رکھی چینی کی خوشنما پلیٹوں اور ان کے آس پاس رکھے سرویٹوں پر پڑ رہی تھی۔ رچرڈ کو اس طرح کی آرائش سے بڑا لطف

حاصل ہوتا تھا، اور لیزا جانتی تھی کہ رچرڈ کے ساتھ رہتے ہوئے اسے رچرڈ کی سنک کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا ہوگا۔

میز پر ناشتے کے لیے بیٹھنے سے پہلے رچرڈ دہلیز پر ٹھٹھکا کھڑا رہا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" لیزا نے رچرڈ کے شانے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

"سوچ رہا ہوں کہاں سے شروع کروں۔"

"کیا کہاں سے شروع کروں؟"

"تم یہاں کے لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتی ہو، نا؟ یہاں کے حالات کے بارے میں۔۔۔"

"میں کچھ نہیں جاننا چاہتی۔ میں یہی جاننا چاہتی ہوں کہ تم دفتر سے کب واپس آؤ گے؟"

اور لیزا آگے بڑھ کر رچرڈ کا سینہ سہلانے لگی۔ رچرڈ نے جھک کر اس کے ہونٹ چوم لیے۔

"ابھی سے اکتانے لگیں؟"

اسے پھر محسوس ہوا جیسے افق پر کوئی بادل کا ٹکڑا نمودار ہوگیا ہے جو آہستہ آہستہ بڑا ہونے لگے گا اور گہرا ہوتا جائے گا اور پھر سارے آسمان کو ڈھانک لے گا۔

رچرڈ نے اسے اور زیادہ زور سے باہوں میں بھینچ لیا لیکن اسے اس پیار میں کوئی زیادہ لطف نہیں مل رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک طرح کا اندیشہ تھا کہ اب کی بار لیزا کے ساتھ یہ دن کیسے کٹیں گے۔ اپنے ہونٹوں سے لیزا کے بال، پیشانی اور آنکھوں کو چھوتے ہوئے اسے کسی خاص ہیجان کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ رات کے وقت جس بدن کو وہ شدّتِ جذبات سے اپنے بدن کے ساتھ چپٹائے رہتا تھا، وہی بدن اس وقت اس کو بھونڈا اور بھدّا لگ رہا تھا۔ لیزا کو بہلانے کے لیے وہ صرف محبت کا ناٹک کر رہا تھا، ایک طرح فرض ادا کر رہا تھا۔

اسی وقت میز کے پیچھے اندھیرے میں کھڑا خانساماں دھیرے سے آگے بڑھ آیا۔ روشنی کے دائرے میں پہنچنے پر اس کی سفید وردی پر بندھی لال رنگ کی پیٹی چمک اٹھی۔ دبے پاؤں، ذرا سی آہٹ کے بغیر وہ میز پر ناشتہ لگانے لگا۔ شروع شروع میں جب کبھی خانساماں یا کوئی اور نوکر کسی کام سے اچانک آجاتا تو لیزا ٹھٹھک کر الگ ہو جاتی لیکن اس وقت بھی رچرڈ اسے اپنی باہوں میں دبائے رکھتا اور خانساماں اپنا کام کرتا رہتا، اور لیزا شرم کی وجہ سے آنکھیں بند کر لیتی تاکہ وہ خانساماں کی موجودگی کو بھولی رہے لیکن آہستہ آہستہ وہ خانساماں کی موجودگی کو یہ سوچ کر نظر انداز کرنے لگی کہ وہ دیسی باشندہ ہی تو

ہے اور پھر ایک معمولی خانساماں ہے۔

"اب کی بار تمھیں کسی نہ کسی کام میں دلچسپی لیتے رہنا چاہیئے لیزا۔"

"کس کام میں؟"

"کتنے ہی کام ہیں۔ ڈپٹی کمشنر کی بیوی تو ضلع کی خاتونِ اوّل سمجھی جاتی ہے۔ تم جو بھی کام ہاتھ میں لوگی، دوسرے افسروں کی بیویاں اس میں تمھاری مدد کریں گی۔"

"میں جانتی ہوں، ریڈ کراس کے لیے چندہ اکٹھا کرو، فلاور شو منعقد کرو۔ بچّوں کے لیے میلے لگاؤ۔ سپاہیوں کے لیے کپڑے، جوتے اکٹھے کرو، یہی نا...."

"ایک اور ادارہ بھی ہے جو یہاں قائم کرنے کا منصوبہ ہے۔ جانوروں کی دیکھ بھال اور حفاظت کے لیے یہاں پر ابھی تک کوئی ادارہ نہیں ہے۔ کنٹونمنٹ کی سڑکوں پر آوارہ کتّے گھومتے ہیں انھیں ہٹانا۔ گھوڑا گاڑیوں میں بوڑھے، لنگڑے گھوڑے جُتے رہتے ہیں...."

"ان کا کیا کرو گے؟"

"انھیں مروا دینا چاہیئے۔ ان سے کام لیتے رہنا تو ظلم ہے۔ آوارہ کتّے بیماری پھیلاتے ہیں۔ پاگل ہو جاتے ہیں تو لوگوں کو کاٹ کھاتے ہیں۔ تم کوئی کام چُن لو جس میں تمھیں دلچسپی ہو۔"

"تم تو ڈپٹی کمشنری کرو، اور میں کتّے مرواتی پھروں۔ مجھے کیا پڑی ہے۔" لیزا نے کہا۔ "تم میرے ساتھ مذاق کر رہے ہو۔ تم میرے ساتھ ہمیشہ مذاق کرتے ہو۔"

"میں مذاق نہیں کرتا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ تم کسی نہ کسی کام میں دلچسپی لینے لگو۔"

"میں تمھارے کاموں میں دلچسپی لوں گی۔ تم مجھے وہی بتاؤ جو صبح بتا رہے تھے ہندوستانیوں کے بارے میں۔"

رچرڈ مسکرا دیا۔

"سنو! سب ہی ہندوستانی چڑچڑے مزاج کے ہوتے ہیں۔ تھوڑا اکسانے پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ مذہب کے نام خون کرنے والے، اور سب ہی لوگ شخصیت پرست ہوتے ہیں، اور سب ہی لوگ سفید چمڑی والی عورتوں کو پسند کرتے ہیں...."

لیزا کو اس بات کا آخری جملہ سنتے ہوئے ایسا لگا کہ رچرڈ پھر مذاق کرنے لگا ہے۔

لیزا کی نظر میں وہ بڑا عالم فاضل تھا لیکن کبھی کبھی یہ بھی محسوس ہوتا کہ وہ اُسے جاہل سمجھتا ہے اور اس کے جملہ میں اکثر طنز چھپا رہتا ہے۔ سنجیدہ موضوع پر بات کرتے ہوئے بھی وہ ایک آدھ جملہ ایسا لگا دیتا جیسے مذاق کر رہا ہو۔ اس پر لیزا کو شک ہونے لگتا کہ اس کی سنجیدہ بات میں بھی کوئی سچ تھا، یا وہ بھی مذاق ہی تھا۔

"تم کوئی بھی بات میرے ساتھ سنجیدگی سے نہیں کرتے۔" لیزا نے شکایت کے لہجے میں کہا۔

"سنجیدگی سے بات کرنے کی تک ہی کیا ہے۔" رچرڈ نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"سنو لیزا، یہاں پر شاید کوئی گڑبڑ ہو گی۔"

لیزا نے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور رچرڈ کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"کیا گڑبڑ ہو گی؟ پھر جنگ ہو گی؟"

"نہیں، لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی بڑھ رہی ہے۔ شاید فساد ہوں گے۔"

"یہ لوگ آپس میں لڑیں گے؟ لندن میں تو تم کہتے تھے کہ وہ لوگ تمھارے خلاف لڑ رہے ہیں۔"

"ہمارے خلاف بھی لڑ رہے ہیں اور آپس میں بھی لڑ رہے ہیں۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو؟ کیا پھر مذاق کرنے لگے؟"

"مذہب کے نام پر آپس میں لڑتے ہیں اور ملک کے نام پر ہمارے ساتھ لڑتے ہیں۔" رچرڈ نے مسکرا کر کہا۔

"بہت چالاک مت بنو، رچرڈ! میں سب جانتی ہوں۔ ملک کے نام پر یہ لوگ تمھارے ساتھ لڑتے ہیں اور مذہب کے نام پر تم انھیں لڑاتے ہو۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"ہم نہیں لڑاتے، لیزا۔ یہ خود لڑتے ہیں۔"

"تم انھیں لڑنے سے روک تو سکتے ہو۔ آخر ہیں تو یہ ایک ہی ذات کے لوگ۔"

رچرڈ کو اپنی بیوی کا بھولاپن بڑا پیارا لگا۔ اس نے جھک کر لیزا کا گال چوم لیا، پھر بولا۔

"ڈارلنگ! حکومت کرنے والے یہ نہیں دیکھتے کہ رعایا میں کون سی بات مشترک ہیں۔ ان کی دلچسپی تو یہ دیکھنے میں ہوتی ہے کہ وہ کن کن باتوں میں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔"

اسی وقت خانساماں ٹرے اٹھائے اندر چلا آیا۔ اسے دیکھ کر لیزا بولی: "یہ ہندو

ہے یا مسلمان ؟"

"تم بتاؤ" رچرڈ نے کہا۔

لیزا کچھ دیر تک خانساماں کی طرف دیکھتی رہی جو ٹرے کا سامان میز پر رکھ دینے کے بعد بُت بنا کھڑا تھا۔

"ہندو ہے۔"

رچرڈ ہنس دیا۔" غلط۔"

"غلط کیوں ؟"

"پھر دھیان سے دیکھو۔"

لیزا نے پھر دھیان سے دیکھا۔" سکھ ہے، اس کے داڑھی ہے اور سر پر پگڑی ہے۔"

رچرڈ پھر ہنس دیا۔ خانساماں ابھی تک مجسمے کی طرح بے جان سا کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کی ایک بھی نس حرکت نہیں کر رہی تھی۔

"اس نے داڑھی کو تراش رکھا ہے۔ سکھ لوگ داڑھی کو نہیں تراشتے۔ یہ ان کے مذہب کے خلاف ہے۔"

"یہ تو تم نے مجھے بتایا ہی نہیں تھا۔" لیزا بولی۔

"میں نے کتنی ہی باتیں تمھیں نہیں بتائی ہیں۔"

"مثلاً۔"

"مثلاً یہ کہ سکھوں کے پانچ نشان ہوتے ہیں، بالوں کے علاوہ چار نشان اور ہیں۔ ہندوؤں کے سر پر چٹیا ہوتی ہے اور مسلمانوں کے بھی اپنے نشان ہوتے ہیں۔ پھر کھانے پینے میں بھی۔ ہندو گائے کا گوشت نہیں کھاتے، مسلمان سؤر کا گوشت نہیں کھاتے۔ سکھ لوگ جھٹکے کا گوشت کھاتے ہیں، اور مسلمان حلال کا۔"

"تم نہیں چاہتے کہ میں ان کے بارے میں کچھ سیکھ سکوں۔ اتنی ڈھیر سی باتیں کس کو یاد رہ سکتی ہیں۔" پھر خانساماں کی طرف دیکھ کر بولی۔" کیا ساری باتیں جان لینے کے بعد میں دیکھتے ہی بتا سکوں گی کہ آدمی ہندو ہے یا مسلمان ؟ ایک ایک نشان دیکھے بغیر کوئی کیسے جان سکتا ہے ؟" پھر ہنس کر بولی۔" میں شرط لگا کر کہہ سکتی ہوں کہ ان لوگوں کو خود بھی نہیں معلوم ہو گا کہ ہندو کون ہے اور مسلمان کون۔ اور رچرڈ، تم بھی جھوٹ بولتے ہو۔ تمھیں بھی یہ

پتہ نہیں چلتا ہوگا۔"

پھر وہ خانساماں سے مخاطب ہوئی: "خانساماں! تم مسلمان؟"

"مسلمان۔ میم صاحب!"

"تم ہندو کو مارے گا؟"

خانساماں سٹپٹا گیا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر میم صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر مسکرا کر صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے بعد آگے بڑھ کر روشنی کے دائرے میں آگیا اور ایک طشتری صاحب کے سامنے بڑھا دی، جس پر ایک تہہ کیا ہوا کاغذ رکھا تھا۔ پھر وہ پیچھے ہٹ کر اندھیرے میں آگیا۔ رچرڈ نے کاغذ کھول کر دیکھا اور پھر تہہ کر کے طشتری میں رکھ دیا۔

"کیا ہے رچرڈ؟"

"ناگر کی رپورٹ ہے، لیزا!" رچرڈ نے آہستہ سے کہا اور اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔

"کیسی رپورٹ؟"

"شہر کے حالات کی۔ تم تو جانتی ہو، میرے پاس ہر روز صبح تین چار محکموں کی رپورٹ آتی ہے۔ پولس سپرنٹنڈنٹ کی رپورٹ، ہیلتھ آفیسر کی رپورٹ، سول سپلائی افسر کی ... مجھے معاف کرنا..." یہ کہتا ہوا رچرڈ کھانے والے کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر تک لیزا بے وقوفوں کی طرح بیٹھی رہی۔ رچرڈ نے ابھی تک کافی نہیں پی تھی۔ لیزا شش و پنج میں تھی کہ وہ خود کافی پی لے یا رچرڈ کا انتظار کرے، لیکن رچرڈ جلدی واپس آگیا۔

"کس کی رپورٹ تھی رچرڈ؟"

"پولس سپرنٹنڈنٹ کی۔" رچرڈ نے کہا۔ پھر تسلی دینے والے لہجے میں بولا: "کوئی خاص بات نہیں ہے۔ معمول کے مطابق روزانہ کی رپورٹ ہے۔"

لیزا کو محسوس ہوا کہ رچرڈ کچھ چھپا رہا ہے۔

"کچھ تو ہے، رچرڈ۔ تم کچھ چھپا رہے ہو!"

"چھپانے کے لیے کیا ہے لیزا، پھر تم سے چھپاؤں گا؟ شہر کی باتوں سے مجھے یا تمھیں کیا لگاؤ ہے کہ میں چھپاتا پھروں؟"

"پھر بھی کچھ تو ہے۔ سپرنٹنڈنٹ نے کیا لکھا ہے؟"

"اس نے صرف اتنا لکھا ہے کہ شہر میں تھوڑا سا تناؤ پایا جاتا ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہندوستان میں آج کل جگہ جگہ ایسا تناؤ پایا جاتا ہے۔"

"پھر تم کیا کرو گے رچرڈ؟
"مجھے کیا کرنا چاہیے، لیزا؟ میں حکومت کروں گا اور کیا کروں گا؟
لیزا نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔
"تم پھر مذاق کرنے لگے رچرڈ؟"
"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی پائی جاتی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں"۔
"تم ان کا جھگڑا طے نہیں کراؤ گے؟"
رچرڈ مسکرا دیا اور کافی کا گھونٹ بھر کر نرم لہجے میں بولا۔
"میں ان سے کہوں گا کہ تمھارے مذہب کے معاملات تمھارے ذاتی معاملات ہیں تمھیں چاہیئے کہ انھیں خود ہی سلجھاؤ۔ سرکار پوری طرح سے مدد کے لیے تیار ہے"۔
"تم ان سے یہ بھی کہنا کہ تم ایک نسل کے لوگ ہو، تمھیں آپس میں نہیں لڑنا چاہیئے۔ تم نے مجھے یہی بتایا تھا۔ نا، رچرڈ"۔
"ضرور کہوں گا' لیزا"، رچرڈ نے کسی قدر طنز کے ساتھ کہا۔
دونوں کافی کے گھونٹ بھرتے رہے، پھر اچانک لیزا کا چہرہ متفکر نظر آنے لگا۔
"تمھیں کوئی خطرہ تو نہیں ہے، رچرڈ؟"
"نہیں لیزا۔ اگر رعایا آپس میں لڑے تو حاکم کو کس بات کا خطرہ ہے؟"
لیزا کے ذہن میں یہ بات اتری تو اس کی نگاہوں میں رچرڈ کے لیے احترام کا جذبہ چھلک آیا۔
"ٹھیک ہی تو کہتے ہو۔ تم کتنا کچھ جانتے ہو، رچرڈ۔ تم سچ مچ بڑے سمجھ دار ہو۔ مجھے جیکسن کی بیوی نے ایک بار بتایا تھا کہ ہندوستانیوں کی کسی بھیڑ کو تتر بتر کرنے کے لیے جیکسن اکیلا ریوالور ہاتھ میں لے کر بھیڑ کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا تھا اور چھجے پر کھڑی اس کی بیوی دیکھ رہی تھی۔ اور بے حد ڈر گئی تھی کہ جانے کیا ہو جائے۔ تم سوچو، رچرڈ۔ ایک اکیلا جیکسن، اور سیکڑوں کی بھیڑ — کچھ بھی ہو سکتا تھا"۔
"تم فکر مت کرو، لیزا"، رچرڈ نے کرسی سے اٹھ کر لیزا کا گال تھپتھپایا اور باہر نکل گیا۔

5

اندھیرا بہت کم ہو گیا تھا' جب پربھات پھیری کی منڈلیاں گلیاں پار کرتی ہوئی امام دین کے محلے میں جا پہنچی۔ راستے میں شیر خاں کے گھر سے جھاڑو' بیلچے' کڑاہیاں اور صفائی کا دوسرا سامان لے کر وہ آگے بڑھنے لگے۔ صبح کی روشنی میں ان کے تھکے تھکے پیلے چہرے صاف نظر آنے لگے۔ مہاتما جی کو چھوڑ کر سب ہی لوگوں کے کپڑے مسلے ہوئے اور میلے میلے تھے۔ بخشی جی کے سر پر گاندھی ٹوپی ایک طرف سے پچکی ہوئی تھی جیسے اپنے سر پر لادا ہوا کوئی بوجھ ابھی ابھی پھینک کر آئے ہوں۔ شنکر' ماسٹر رام داس اور عزیز نے کندھوں پر جھاڑوئیں اٹھا رکھی تھیں دیس راج اور شیر خاں کے ہاتھوں میں کڑاہیاں تھیں۔ جرنیل ایک لمبا بانس اٹھائے ہوئے تھا۔ دن کی روشنی میں رام داس جھاڑو ہاتھ میں لے کر چلتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

"برہمنوں سے بھی جھاڑو اٹھواتے ہو' گاندھی مہاتما۔ جو کرو تھوڑا۔ ہاں جی' برہمنوں کے ہاتھ سے بھی جھاڑو اٹھوا دی۔"

اور یہ کہہ کر آہستہ سے ہنس دیا۔ جھاڑو اس نے پیٹھ کے پیچھے کر لی تھی۔ اپنی بات کا کوئی جواب نہ پا کر اس نے ذرا اونچی آواز میں بخشی کو مخاطب کیا۔

"میں نالی صاف نہیں کروں گا۔ پہلے بول دوں۔"

"کیوں' تمھارے سرخاب کے پر لگے ہیں؟"

"یہ میری عمر نالی صاف کرنے کی ہے؟"

"کیوں؟ گاندھی جی پاخانہ صاف کر سکتے ہیں۔ تم نالی صاف نہیں کر سکتے؟"

"میں جھوٹ نہیں کہتا۔ میں جھک نہیں سکتا۔ جھکتا ہوں تو کمر میں درد ہونے لگتا ہے۔ مجھے پتھری کی شکایت ہے۔"

"گائے کے لیے سائی پائی کرتے ہو تو پتھری کی شکایت نہیں رہتی، تعمیری کام کرتے ہو تو پتھری کی شکایت ہونے لگتی ہے۔"

اس پر شنکر گھوم کر بولا۔

"ماسٹر جی! ہمیں پرچار کرنا ہے۔ کون سچ مچ نالیاں صاف کرنی ہیں۔ نالی میں صاف کروں گا، تم کڑاہی میں کوڑا اٹھاتے رہنا۔"

تھوڑی دور جانے کے بعد منڈلی ایک گلی میں گھوم گئی۔

"یہ کس راستے پر چل رہے ہو؟"

اچانک پیچھے سے گوسائیں جی نے چلا کر کہا۔ منڈلی کے آگے آگے چلتا ہوا دیس راج دائیں طرف کو گھوم گیا اور اس کے پیچھے ساری منڈلی اسی طرف جانے لگی تھی۔

"ہاں۔ ہاں۔ منع کر دو۔" بخشی جی نے تائید کی۔ "صبح صبح ان لوگوں کی نماز کا وقت ہوتا ہے۔ کیا فائدہ مسجد کے سامنے سے جانے کا۔"

"او کشمیری!" بخشی جی نے چلا کر کہا۔ "تم سب لوگ کہاں کھوئے رہتے ہو۔ ادھر مسجد کے سامنے سے جانے کے لیے کس نے کہا ہے؟ ہمیشہ اپنی من مانی کرتے ہو۔"

کشمیری لال رک گیا۔

"شیر خاں اور دیس راج اس طرف مڑ گئے تھے، ہم بھی ادھر مڑ گئے۔ مگر کوئی بات نہیں بخشی جی۔ مسجد کے سامنے گانا بند کر دیں گے۔"

"نہیں۔ نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں۔ دیکھتے نہیں فضا کیسی ہو رہی ہے۔ واپس آؤ اور پچھلی گلی میں سے ہو کر سیدھے چوک کی طرف چلو۔ وہاں سے سڑک پار کر کے امام دین کے محلّے میں چلے جائیں گے۔"

منڈلی پلٹ آئی اور بائیں طرف کی تنگ گلی کو پار کر کے تھوڑی دیر کے بعد امام دین کے محلّے کے پاس جا پہنچی۔ یہ راستہ پربھات پھیری کے لیے نیا تھا۔ عام طور پر شہر کے باہر کی پرانی بستیوں میں کانگرس پرچار کے لیے نہیں جاتی تھی۔ کمیٹی کے میدان کو طے کر کے جانا یوں بھی دور پڑتا تھا۔ امام دین کا محلّہ کمیٹی کے میدان کے پار مشرق کی سمت میں ایک سرے پر تھا۔

ایک جگہ چرنی کے پاس منڈلی کھڑی ہو گئی۔ کشمیری لال نے جس کے ہاتھ میں ترنگا

تھا، سر اونچا کر کے زور سے نعرہ لگایا۔

"انقلاب!"

سب ہی لوگوں نے جوش کے ساتھ کہا۔ "زندہ باد۔"

"بولو بھارت ماتا کی۔۔۔۔ جے۔"

نعروں کی آواز سن کر محلّے کے بچّے بھاگتے ہوئے گھروں سے باہر آ گئے۔ عورتیں ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے سے جھانکنے لگیں۔ لال کلغی والا ایک مرغ اچھل کر کچی دیوار کے اوپر چڑھ گیا اور کچھ دیر پر پھڑپھڑانے کے بعد "کو۔۔۔ ککڑوں۔۔ کوں!" کی بانگ لگائی، جیسے اس نے محلّے کی نمائندگی کرتے ہوئے نعرے کا جواب دیا ہو۔

"تم سے تو یہ مرغ ہی اچھا ہے کشمیری! دیکھو کیسے رعب سے بانگ دیتا ہے۔" شیر خاں بولا۔

"کیوں، کشمیری کسی سے کم ہے؟ کشمیری، کانگرس کا کُکڑ ہے۔" شنکر نے جملہ چست کیا۔

"تو بھی سر پر لال کلغی لگا لے، کشمیری! اسے لال ٹوپی لے دو بخشی جی، پھر بالکل کُکڑ نظر آئے گا۔"

"کیوں، کلغی کے بغیر یہ ککڑ نظر نہیں آتا؟ یہ مادہ ککڑ ہے، ککڑی، کشمیری ککڑی۔۔۔"

شہر میں ہنسی مذاق کا ایسا ہی ماحول تھا۔ موقع بے موقع ساتھیوں کے درمیان چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی تھی۔

"بس۔ بس۔ اب کام شروع کرو۔" بخشی جی چرنی پہ لالٹین رکھتے ہوئے بولے۔

زیادہ تر مکانات اکہرے، ایک منزلہ تھے۔ بہت سے گھروں کے دروازوں پر ٹاٹ کے پردے لٹک رہے تھے۔ سامنے کھلا میدان تھا۔ اور میدان کے پار، دو کچّی گلیاں، ایک دوسرے کے متوازی تھیں۔ ایک گلی میں نالیاں تھیں لیکن کچّی تھیں۔ دوسری گلی میں نالیاں کھودی ہی نہیں گئی تھیں۔ گلی میں مویشی بندھے تھے۔ گھروں میں سے نکل کر عورتیں سروں پر ایک ایک دو دو گھڑے رکھے پانی بھرنے جا رہی تھیں۔ ایک جگہ سے ایک لڑکا بھینس کے نیچے سے گوبر اٹھا رہا تھا۔ نزدیک ہی چرنی کے پاس دو بچّے میدان میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رفع حاجت کر رہے تھے، اور باتیں کر رہے تھے۔

"تیری ٹٹی اتنی پتلی کیوں ہے؟"

"میں بکری کا دودھ پیتا ہوں۔ تو کیا پیتا ہے؟"

میدان کے ایک اور گوشے میں ایک تندور گڑا ہوا تھا۔ یہاں پہنچ کر ایسا لگتا تھا جیسے یہ لوگ گلیوں گلیوں چلتے ہوئے کسی گاؤں میں داخل ہو گئے ہوں۔

'اٹھاؤ بیلچے اور تعمیری کام شروع کرو۔" بخشی جی نے کہا۔

نہتا اور ماسٹر رام داس کڑاہی لے کر آنگن کی طرف بڑھ گئے۔ شنکر اور کشمیری لال نے بیلچے اٹھائے اور نالی صاف کرنے چل پڑے۔ شیر خاں، دیس راج اور بخشی جی جھاڑو اٹھا کر آنگن جھاڑنے لگے۔

آس پاس کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کیا ہونے والا ہے۔ تانگہ ہانکنے والا ایک جھاجھی اپنے گھر کے باہر آکر میدان کے کنارے پیروں کے بل بیٹھ گیا تھا لیکن بخشی جی کو جھاڑو لگاتے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور لپک کر بخشی جی کے پاس پہنچا۔

"کیوں ہمیں شرمندہ کرتے ہو، بابو جی! ہمارا گھر تم بوہارو گے؟ لائیے جھاڑو مجھے دیجیے۔"

"نہیں، نہیں۔ یہ ہمارا ہی کام ہے۔" بخشی جی نے جواب دیا۔

'نہیں۔ بندہ پرور! کبھی یہ بھی ہوا ہے۔ آپ پڑھے لکھے خاندانی لوگ ہیں۔ ہم آپ سے جھاڑو لگوائیں گے۔ توبہ استغفار۔ لائیے مجھے دیجیے۔ ہمیں کیوں دوزخ کی آگ میں دھکیلتے ہو..."

بخشی جی کو اس کا برتاؤ اچھا لگا۔ کانگرس کے پرچار کا اثر ہو رہا ہے۔ انھوں نے دل میں کہا۔ یہی تعمیری کام کا مقصد ہے، اور کیا!

کشمیری لال اور شنکر بیلچے اٹھائے گھروں کے ساتھ ساتھ جانے والی نالی میں سے گاڑھی گاڑھی کیچڑ نکال رہے تھے۔ جب سے نالی کھودی گئی تھی اس میں گندا پانی جمع ہو رہا تھا، اور اب اس نے گہرے نیلے رنگ کی لسلسی کیچڑ کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ اتنی مدت تک یہ لسلسی کیچڑ نالی میں پڑی رہی، اس میں بدبو نہیں آئی لیکن اب جبکہ شنکر اور کشمیری لال اسے بیلچوں سے نکال نکال کر نالی کے کنارے جگہ جگہ ڈھیر لگانے لگے تو بدبو سے ناک پھٹنے لگی۔ نالی کچھ نہیں تو ایک فٹ گہری ہو گی اور اس میں

اوپر تک کیچڑ ہی کیچڑ بھری تھی۔

"او، بادشاہو! یہ کیا ظلم کرنے لگے ہو!"

ایک چھت کی منڈیر کے پیچھے کھڑا رنگی ہوئی داڑھی والا کوئی بزرگ بولا۔" ادھر یہ بیماری پھینک جاؤگے تو اٹھوائے گا کون؟ نالی میں پڑا رہنے دیتے تو کم سے کم ایک جگہ تو رہتا۔ اب اس کے ڈھیر جگہ جگہ لگا جاؤگے، پہلے سے بھی زیادہ گندگی پھیلاؤگے۔۔۔"

بخشی جی دور سے یہ کام دیکھ رہے تھے۔ کمر سیدھی کرکے کھڑے ہو گئے، انھیں شنکر اور کشمیری لال پر غصّہ آیا۔" یہ جوان لوگ کبھی نہیں سمجھیں گے۔" وہ بدبدائے۔" تعمیری کام کا مطلب نہیں کہ سچ مچ نالیاں صاف کرنے لگو۔ اس کا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ لوگوں کو صفائی کی طرف متوجّہ کرو۔ اور ملک کی آزادی کی ضرورت کا احساس دلاؤ۔"

لیکن وہ بزرگ اپنی رائے زنی کے بعد منڈیر کے پاس سے ہٹ چکا تھا۔ بخشی جی پھر آنگن کی صفائی کرنے میں لگ گئے۔

اسی وقت سامنے والی گلی میں سے ایک سفید ریش بزرگ نکلا۔ ہاتھ میں تسبیح لیے ہوئے تھا۔ ظاہر ہے مسجد کی طرف جا رہا تھا۔ سفید ریش، شلوار، سفید کرتا، جس کے اوپر نئے طرز کی واسکٹ اور سر پر بڑا سا انگوچھا بندھا تھا۔ چال ڈھال سے ہی لگتا تھا کہ کوئی مذہبی آدمی ہے۔ ان لوگوں کو جھاڑو لگاتے اور نالیاں صاف کرتے دیکھ کر رک گیا، پھر رام داس کی طرف، جو ہاتھ میں جھاڑو لیے، دھول مٹّی میں بھوت بنا کھڑا تھا، دیکھ کر بولا۔

"ہم لوگوں پر احسان کا بوجھ لادنے آئے ہو؟" لیکن وہ ان لوگوں کے جذبۂ خدمت سے بہت متاثر معلوم ہوتا تھا۔" آفریں ہے۔ واہ۔ وا!" اور اس کی نگاہیں آنگن، گلی اور نالی پر کام میں لگے ایک ایک رضاکار کی طرف جانے لگیں۔" خوش رہو۔ واہ وا۔ کیسا نیک دل پایا ہے۔ آفریں ہے۔" وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

"ہم کیا صفائی کریں گے بزرگوار۔ ہم کتنا کچھ کر سکتے ہیں۔" بخشی جی بزرگ کو بولتے دیکھ کر جھاڑو اٹھائے اس کے پاس چلے آئے تھے۔

بزرگ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "مطلب گلیاں صاف کرنے سے نہیں۔ اس کے پیچھے جو جذبہ کام کر رہا ہے وہ بہت بلند ہے ـــــ آفریں، صد آفریں۔۔۔" یہ کہہ کر سفید ریش بزرگ مسکراتا ہوا، اور ہلکی چال سے چلتا ہوا محلّے میں سے نکل کر مسجد کی طرف جانے لگا۔ بخشی جی کو اس کے منھ سے تعمیری کام کی تعریف سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ انھیں ایسا لگا جیسے آج کے تعمیری کام کا حقیقی مقصد پورا ہو چکا ہو۔

"وہ دیکھو، مہتا جی اور عزیز کی طرف۔" شیر خاں نے ہنس کر کہا۔ "دونوں نے جھاڑو کو ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔ مہتا جی کو تو اپنے کپڑوں کا خیال ہوگا۔"

بخشی نے گھوم کر دیکھا۔ بڑے صاف ستھرے ہاتھوں سے مہتا ایک ایک کنکر اٹھا تا کڑاہی میں سجا رہا تھا۔ پہلی (کلمے کی) انگلی اور انگوٹھے سے ایک ایک کنکر اٹھاتا تھا اور کڑاہی کے پاس آکر بڑے قرینے سے اس میں ڈال دیتا۔ دوسری طرف رام داس تھا، جس کی مونچھوں اور بالوں پر ابھی سے مٹّی کی تہہ جمنے لگی تھی۔

آس پاس، بچّوں کے علاوہ، بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے سے عورتیں اور لڑکیاں اور چھتوں پر کھڑے مرد تعمیری کام کا مظاہرہ دیکھ رہے تھے۔

جرنیل جو ابھی تک لمبا سانس اٹھائے چرخی کے پاس کھڑا تھا، چلتا ہوا نالی صاف کرنے والوں کے پاس پہنچا۔

"نالی کھولنے کی ضرورت ہے؟ بانس لگاؤں؟" اس نے فوجی انداز میں کہا۔

آس پاس کھڑے لوگ ہنس دیے۔

"یہ تعمیری کام بکواس ہے۔" شنکر نے کمر سیدھی کرتے ہوئے کشمیری لال سے کہا۔ "نالیاں صاف کرنے سے آزادی نہیں ملے گی۔"

شنکر اور کشمیری دونوں پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ نالی کے کنارے وہ تین جگہ کیچڑ کے ڈھیر لگا چکے تھے۔

"بہت بک بک مت کیا کر، شنکر۔" بخشی نے کہا۔ وہ اب گلی کے بیچ میں جھاڑو اٹھائے کھڑے تھے۔ شنکر کا جملہ انھوں نے سن لیا تھا۔ "تیرے بھیجے میں بہت عقل آگئی ہے۔ باپو تو نالائق ہیں نا، جو ہم سب سے چرخا کاتنے اور تعمیری کام کرنے کو

کہتے ہیں۔"

"کر تو رہا ہوں، تعمیری کام ہی کر رہا ہوں اور کیا کر رہا ہوں، لیکن ہے یہ بکواس۔"
بخشی جی صبح صبح شنکر کے منہ نہیں لگنا چاہتے تھے کیونکہ وہ بڑا منہ پھٹ آدمی تھا۔ پھر بھی ان سے نہیں رہا گیا۔

"کچھ سمجھا کر شنکر۔ یہ ہماری دیش بھگتی کی علامت ہے اس طرح ہم غریبوں کی سطح پر اتر آتے ہیں۔ کیا غریبوں میں کام کرنے جاؤ گے تو پتلون پہن کر جاؤ گے؟ جھاڑو لے کر اور کھادی پہن کر جاتے ہو تو لوگ تمھیں اپنا سمجھتے ہیں۔"

"جب سے تعمیری کام کرنے لگے ہو، تحریک ہی ٹھپ ہو گئی ہے۔" شنکر نے کہا۔

"لگاؤ جھاڑو اور کاتو چرخے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک اور بیلچہ کیچڑ سے بھر کر ڈھیر پر ڈال دیا۔

تب ہی جرنیل اونچی آواز میں بولا۔

"تم غدار ہو۔ میں تمھیں جانتا ہوں۔ تم کمیونسٹ ہو۔"

"بس۔ بس جرنیل۔" بخشی نے جلدی سے کہا۔ جرنیل بولنے لگے گا تو پھر ایک اور بکھیڑا اٹھ کھڑا ہو جائے گا۔ اسے روکنا ممکن نہیں ہوگا۔

"تم بھی شنکر، وقت بے وقت اپنی ہانکنے لگتے ہو۔ یہ کوئی جگہ ہے بحث کرنے کی؟"

اسی وقت ایک آدمی کمیٹی کے میدان کی طرف سے بھاگتا ہوا آیا اور شیر خاں کے گھر والی گلی پار کر کے ایک اور محلّے کے لوگوں کے پاس جا پہنچا اور ان کے ساتھ کھسر پھسر کرنے لگا۔ اس نے کالے رنگ کی واسکٹ پہن رکھی تھی اور بڑا مشتعل نظر آ رہا تھا۔ یوں تو بھاگ کر آنا معمولی بات تھی مگر وہ جس انداز سے بھاگتا ہوا آیا تھا وہ آس پاس کے لوگوں کو عجیب سا لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اِدھر اُدھر کھڑے لوگ وہاں سے ہٹنے لگے۔ صرف چھوٹے چھوٹے بچّے وہاں کھڑے رہ گئے۔ پھر پلک جھپکتے ہی ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے سے عورتیں ہٹ گئیں۔ ایک عورت لپک کر باہر آئی اور باہر رفع حاجت کرتے دو بچّوں میں سے ایک کا بازو پکڑ کر گھسیٹ کر اندر لے گئی۔

سکتہ سا چھا گیا۔ کانگرس کارکن حیران تھے کہ کیا بات ہوئی۔

اسی وقت وہی سفید ریش بوڑھا، جو ذرا دیر پہلے ہاتھ میں تسبیح پکڑے "آفریں آفریں"

کہتا، مسکراتا ہوا وہاں سے گیا تھا، واپس آتا دکھائی دیا۔ مہتا اور بخشی جی ساتھ ساتھ کھڑے تھے اور اندازہ لگا رہے تھے کہ کیا بات ہوگئی ہے جو آناً فاناً لوگ وہاں سے ہٹ گئے ہیں۔ ان کا دل چاہا کہ بزرگ کے پاس جاکر پوچھیں کہ معاملہ کیا ہے۔ اتنے وہ سفید ریش بزرگ ہاتھ میں تسبیح ہلاتا ہوا خود ان کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ لمحہ بھر کے لیے وہ ٹھٹکا، پھر بولا۔

"آپ صاحبان یہاں سے چلے جائیے ـــــ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔" یہ کہتے کہتے اس کی آواز تیز ہوگئی اور ٹھوڑی کانپنے لگی۔ چہرہ لٹک گیا۔

ایسا لگتا تھا جیسے وہ بخشی اور مہتا جی کو مخاطب کرکے کہہ رہا تھا۔ دوسرے کارکن بھی لپک کر پاس آگئے۔

"اٹھ جائیے یہاں سے۔" بزرگ بولے جارہا تھا۔ "بس ہوچکا جو کچھ آپ کو کرنا تھا۔ سن رہے ہیں آپ؟" اس کی آواز کانپنے لگی تھی۔ "خنزیر کے بچّو! یہاں سے چلے جاؤ۔" وہ چلّایا اور قدم تیزی سے بڑھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ چاروں طرف خاموشی چھاگئی۔ بخشی اور مہتا ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے۔ بخشی نے سوچا، ممکن ہے شنکر یا کشمیری لال نے، جو اکثر اول جلول بکتے رہتے ہیں، کسی سے کچھ کہہ دیا ہے جس سے محلّے والوں کو برا لگا ہے۔ مگر یہ آدمی تو باہر سے آیا تھا۔ پہلے یہاں سے جاتے وقت تو ہماری تعریف کرتا گیا تھا۔ اب کیا ہوگیا ہے جو اتنا بوکھلا گیا ہے۔

اسی وقت ایک اڑتا ہوا پتھر آیا اور بخشی جی کے پاس آکر گرا۔ کشمیری لال اور شنکر مبہوت ہوکر بخشی جی کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا بات ہے؟" ماسٹر رام داس نے پاس آکر پوچھا۔

"چلو، یہاں سے نکل چلیں، یہاں کوئی گڑبڑ ہے۔" بخشی جی نے کہا۔ "یہاں پر آنا ہی غلط تھا۔ کہاں ہے دیس راج، جو ہمیں یہاں لے کر آیا تھا؟"

مگر دیس راج وہاں نہیں تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کب کھسک گیا تھا۔

"کوئی شرارت ہے، ضرور کوئی شرارت ہے۔"

دو تین پتھر یکے بعد دیگرے اڑتے ہوئے آئے۔ ایک پتھر سیدھا رام داس کے کندھے پر لگا۔
"نکل چلو یہاں سے ٹھہرو نہیں۔"
کارکنوں کی منڈلی ہڑبڑا کر وہاں سے نکلنے لگی۔
اونچا بانس ہاتھ میں اٹھائے جرنیل چلّایا۔ "تم سب بزدل ہو، میں تم میں سے ایک ایک کو جانتا ہوں۔ میں یہاں تعمیری کام کر کے ہی جاؤں گا۔"
اس پر بخشی نے کڑک کر، فوجی حکم سناتے ہوئے جرنیل سے کہا۔
"جھنڈا سنبھالو، جرنیل۔ جھنڈا کہاں ہے؟"
جرنیل فوراً اٹین شن ہو گیا، اور چپلیں گھسیٹتا ہوا، چرنی کے پاس رکھا جھنڈا اٹھانے چلا گیا۔
اسی وقت دو پتھر یکے بعد دیگرے اڑتے ہوئے آئے۔ ایک چرنی پر گرا، اور دوسرا اس جگہ جہاں جرنیل کھڑا تھا، زمین پر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی تین آدمی سامنے کی گلی طے کر کے آئے اور گلی کے سرے پر کھڑے ہو گئے۔
منڈلی کے لوگ چپ چاپ وہاں سے کھسکنے لگے۔ کشمیری لال نے جرنیل کے ہاتھ سے جھنڈا لے لیا۔ مہتا نے زمین پر رکھی کڑھائی الٹ دی جس میں وہ پتھر اکٹھے کر رہا تھا، اور خالی کڑھائی اٹھائے میدان پار کرنے لگا۔ بخشی جی کے ہاتھ میں لالٹین تھی لیکن ان کی گردن جھکی ہوئی تھی۔
"بیلچے اور کڑاہیاں شیر خاں کے گھر رکھ دیں؟" ماسٹر رام داس نے بخشی جی سے پوچھا۔
"اب جیسے بھی ہو، چلتے جاؤ۔ یہاں پر رکھو نہیں۔"
کشمیری لال نے گھوم کر دیکھا۔ اب گلی کے سرے پر تین کی جگہ پانچ آدمی کھڑے تھے۔ میدان کے پار کچھ لوگ آ کر کھڑے ہو گئے تھے اور ان کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ محلّے میں سے نکل کر وہ قطب الدین کی گلی سے باہر آئے تو نان بائی کی دکان پر بھی انھیں ایسا ہی منظر دیکھنے کو ملا۔ تین آدمی جو نان بائی کی دکان پر کھڑے تھے، پلٹ کر ان لوگوں کو گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ لیکن ان میں سے بولا کوئی نہیں۔
"کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔" بخشی جی نے مہتا سے کہا۔
"کیا معلوم، کشمیری یا شنکر نے محلّے کی کسی لڑکی وڑکی کو چھیڑ دیا ہو گا۔ آپ نے بھی تو کانگرس میں کیسے کیسے لوفر بھر لیے ہیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں مہتاجی؟ وہ لوگ تو سارا وقت نالیاں صاف کرتے رہے تھے۔ یہاں تو کوئی دوسری ہی بات معلوم ہوتی ہے۔"

موہیالوں کی گلی میں مڑنے پر انھیں تین چار آدمی گلی کے سرے پر کھڑے نظر آئے۔

"کہاں جا رہے ہو بخشی جی؟ اُدھر مت جاؤ۔" ایک لمبے قد کے موہیالائے، جو بخشی جی کا واقف کار تھا، آگے بڑھ کر کہا۔

"کیا بات ہے۔"

"بس، اُدھر مت جاؤ۔"

"کچھ بتاؤ تو ہوا کیا ہے؟"

اس وقت تک کشمیری، جرنیل اور ماسٹر رام داس بھی بخشی جی اور مہتا کے پاس پہنچ چکے تھے۔

"اُدھر گلی کے باہر دیکھو۔"

بخشی جی نے سامنے کی طرف دیکھا۔ گلی کے باہر سڑک کے پار ایک مسجد تھی جسے 'وکیلوں کی مسجد' کہا جاتا تھا۔

"کیا ہے؟"

"آپ کو کچھ نظر نہیں آیا۔ مسجد کے دروازے کے نیچے سیڑھی کی طرف دیکھیے۔"

مسجد کی سیڑھی پر کوئی کالی کالی چیز پڑی تھی

"کوئی آدمی سوٗر ار کر پھینک گیا ہے۔"

بخشی جی نے مہتا کے چہرے کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں: دیکھا! میں نے کہا تھا، نا کہیں کوئی گڑبڑ ہے!

سب ہی نے گھوم کر اس طرف دیکھا۔ مسجد کے دروازے لی سیڑھی پر ایک سیاہ رنگ کا بورا سا رکھا نظر آیا، جس میں سے دو ٹانگیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ مسجد کا ہرے رنگ کا دروازہ بند تھا۔

"لوٹ چلو۔ یہیں سے لوٹ چلو۔" ماسٹر رام داس نے آہستہ سے کہا۔

"آخ۔۔۔۔ تھو!" کشمیری لال نے سور کی طرف دیکھ کر کہا، اور منھ پھیر لیا۔

"بخشی جی! یہیں سے لوٹ چلیں۔ آگے مسلمانوں کا محلّہ ہے۔" رام داس نے پھر کہا۔

"کسی نے شرارت کی ہے۔" مہتا جی بڑبڑائے۔
"آپ کو پکّا معلوم ہے کہ سؤر ہی ہے؟" مہتا جی بولے۔
"کیا معلوم کوئی اور جانور ہو۔"
"کوئی اور جانور ہوگا تو مسلمان اتنا بگڑیں گے؟" بخشی جی نے چڑ کر کہا۔
جرنیل بھی اپنی گھنی ابرو کے بیچ میں چھپی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مسجد کی طرف گاڑے کھڑا تھا، چھوٹتے ہی بولا۔
"انگریزوں نے پھینکا ہے!"
اس کے نتھنے پھڑکنے لگے اور وہ چلّا کر بولا۔ "انگریز کی شرارت ہے۔ میں جانتا ہوں۔"
"ہاں۔ ہاں، جرنیل! انگریز کی ہی شرارت ہے، مگر اس وقت تم چپ رہو" بخشی جی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"پچھلی گلی میں سے گھوم جائیں۔" ماسٹر رام داس نے پھر کہا، لیکن اب کی بار جرنیل اس پر برس پڑا۔
"تم بزدل ہو۔ یہ انگریز کی شرارت ہے۔ میں اس کا بھانڈا پھوڑ دوں گا۔"
اس پر مہتا جی نے جھک کر بخشی جی کے کان میں کہا۔
"اس پاگل کو کیوں ساتھ لے آتے ہو؟ یہ سب ہی کو مروائے گا۔ نکلوا اسے کانگرس میں سے۔"
سڑک پر سے گاہے گاہے کوئی مسلمان گزرتا اور مسجد کی سیڑھی پر نظر پڑتے ہی پہلے اسے گھور کر دیکھتا، پھر منہ پھیر لیتا اور بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔
اچانک سامنے والی سڑک پر سے ایک تانگہ سرپٹ دوڑتا ہوا نکل گیا۔ اس کے بعد مسجد کی بغل سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔ سڑک کے پار، بائیں طرف بیٹھے والے قصائی نے ٹنگے ہوئے بکروں پر کپڑا ڈال کر دکان پر چٹخنی چڑھادی۔ موہیالوں کی گلی میں گھروں کے دروازے بند ہونے لگے۔
بخشی جی نے گھوم کر دیکھا۔ ماسٹر رام داس کھسک گیا تھا اور دور گلی کے سرے کی طرف بڑھتا چلا جارہا تھا۔ تھوڑی دور پر اس کے پیچھے عزیز اور شیر خاں بھی چلے جارہے تھے۔ گلی میں جگہ جگہ دو دو چار چار لوگوں کی ٹولیاں کھڑی تھیں۔
"آپ یہاں سے نکل جائیں بخشی جی! آپ کے یہاں رہنے سے اشتعال بڑھے گا۔"

بخشی جی کے موہیال دوست نے کہا۔

بخشی جی نے اس آدمی کی طرف دیکھا اور پھر کشمیری لال سے بولے۔

"جھنڈا بانس میں سے نکال کر تہہ کر دو۔" پھر موہیال سے بولے۔ "اس سوّر کی لاش کو تو یہاں سے ہٹا دیں۔ جتنی دیر یہاں پڑی رہے گی اتنا ہی تناؤ بڑھے گا۔"

"آپ سوّر کی لاش کو ہٹائیں گے؟" موہیال نے حیران ہو کر کہا۔ "آپ کو تو میں سمجھتا ہوں، اس طرف جانا بھی نہیں چاہیئے۔"

"میں ان سے اتفاق کرتا ہوں۔" مہتا جی نے کہا۔ "ہمیں اس میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ اس سے معاملہ بگڑ سکتا ہے۔"

"لیکن یہاں سے نکل جائیں گے تو کیا معاملہ نہیں بڑھے گا؟ کیا مسلمان اس لاش کو یہاں سے ہٹائیں گے؟"

"وہ نہیں ہٹائیں گے تو بھنگی چمار کا انتظام کریں گے۔ بہر صورت ہمیں اس میں نہیں پڑنا چاہیئے۔"

بخشی جی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی لالٹین ایک گھر کے چبوترے پر رکھ دی اور مہتا کی طرف دیکھ کر بولے۔

"مہتا جی! آپ کیا کر رہے ہیں۔ ہم یہاں سے چپ چاپ نکل جائیں اور تناؤ کو بڑھنے دیں؟ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو دوسری بات تھی۔" پھر کشمیری لال اور جرنیل کو مخاطب کر کے بولے "تم آجاؤ میرے ساتھ۔" اور وہ گلی میں سے نکل کر مسجد کی طرف جانے لگے۔

کشمیری تذبذب میں پڑ گیا۔ جائے یا نہ جائے۔ امام دین کے محلّے میں پتھر پڑے تھے۔ یہاں پر نہ جانے کوئی کیا کر بیٹھے؟ اس کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ اس نے جھنڈے کا بانس دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور وہیں ساکت کھڑا ہو گیا۔ ٹانگوں میں لرزش سی ہونے لگی۔ لیکن اتنی دیر میں جرنیل اور بخشی سڑک پار کر چکے تھے۔ تھوڑی دیر تک کشمیری وہیں کھڑا رہا۔ پھر وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے گلی سے نکل آیا۔ سڑک پر پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ موہیال جا چکے تھے۔ صرف مہتا جی وہاں کھڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ساری گلی سنسان ہو گئی ہو۔ بائیں طرف سڑک کے کنارے تین چار دکانیں تھیں۔ سب ہی بند پڑی تھیں۔ دائیں طرف دور کنوئیں کے پاس دکانوں کی قطار تھی، وہاں بھی دکانیں بند تھیں اور کچھ لوگ، کنوئیں کے پاس گانٹھ سی بنائے کھڑے تھے اور اسی طرف دیکھے جا رہے تھے۔

اسے محسوس ہوا جیسے لوگ جگہ جگہ چھجوں پر کھڑے ہیں، لیکن گھروں کے دروازے بند ہیں۔

"سب سے پہلے اس سوٗر کی لاش کو یہاں سے ہٹائیں۔" بخشی جی کہہ رہے تھے۔

کالے رنگ کا سوٗر تھا۔ کوئی اس پر بورا ڈال گیا تھا، لیکن بورے کے نیچے سے اس کی ٹانگیں، تھوتھنی اور پیٹ کا کچھ حصّہ نظر آ رہے تھے۔

مہتا جی ابھی تک گلی میں دیوار کے سہارے کھڑے تھے۔ وہ ابھی تک پس و پیش میں تھے۔ سوٗر کو وہاں سے ہٹانے میں خطرہ تو تھا ہی لیکن ساتھ میں کپڑے گندے ہونے کا ڈر بھی تھا۔ بخشی اور جرنیل نے سوٗر کو ٹانگوں سے پکڑا اور اس کی لاش گھسیٹ کر مسجد کی سیڑھی سے اتار دی۔ پھر اسے گھسیٹتے ہوئے سڑک کے پار لے آئے، اور اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے دھکیل کر چھپا دیا۔

"ابھی تو اسے یہیں رکھو۔ مسجد کا دروازہ تو کھلے۔ مسجد کی سیڑھی کو دھو دیتے ہیں۔" بخشی جی نے کہا اور پھر کشمیری سے مخاطب ہوئے۔ "کشمیری تم جاؤ، ادھر پیچھے بھنگیوں کے ڈیرے میں چلے جاؤ، وہاں میونسپلٹی کے بھنگی رہتے ہیں۔ دیکھو اگر دو بھنگی ٹھیلہ لے آئیں تو اسے اٹھوا دیتے ہیں۔"

اسی وقت کنوئیں کی طرف سے کسی کے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ تینوں نے گھوم کر دیکھا۔ ایک آدمی سر پر پگڑی باندھے اور ہاتھ میں ڈنڈا لیے ایک گائے کے پیچھے بھاگتا ہوا اسے ہانکے لیے جا رہا تھا۔ اس کا سینہ کھلا ہوا تھا اور گلے میں ایک تعویذ جھول رہا تھا۔ چکنی کھال والی بادامی رنگ کی گائے تھی۔ موٹی موٹی حیران سی آنکھیں۔ ڈر کے مارے اس کی پونچھ اٹھی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے راستہ بھٹک گئی ہو۔ تینوں ٹھٹک گئے۔ پگڑی والے نے اپنا منھ لپیٹ رکھا تھا۔ گائے کو ہانکتا ہوا وہ سڑک پر سے گزرا، اور پھر اسے دائیں ہاتھ کی ایک گلی کی طرف لے گیا۔

بخشی جی دیر تک ٹھٹکے کھڑے رہے۔ پھر دھیرے سے بولے۔

"ایسا لگتا ہے کہ شہر پر چیلیں اڑیں گی۔ آثار بہت برے ہیں۔"

اور ان کا چہرہ پہلے سے زیادہ اور سنجیدہ لگنے لگا۔

6

ہفتہ واری ست سنگ کے اختتام سے پہلے پُنیہ آتما وان پرستھی جی ہمیشہ کی طرح منتر پاٹھ کرنے لگے۔ اس منتر پاٹھ کو وہ ست سنگ روپی یگیہ کی 'انتم آہوتی' کہا کرتے تھے۔ ان گِنے چنے خاص منتروں اور شلوکوں میں ہندوستانی تہذیب کا مختصر بیان ہوتا تھا، جنھیں بے حد اصرار پر وان پرستھی جی نے سب ہی ممبروں کو یہ منتر زبانی یاد کروا دیے تھے۔ وَیدی پر بیٹھے بیٹھے ہی وان پرستھی جی آنکھیں بند کرکے، ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر منتر پڑھنے لگے۔

سروے بھونتو سکھینہ، سروے سنتو نرامیہ
سروے بھدرانی پشینتو ماکشچت دکھ بھاگ بھوییتو

سارے ست سنگ میں اکیلے وان پرستھی جی ہی تھے جو سنسکرت سے واقف تھے۔ انھوں نے سب ہی وَید اور وَیدانت پڑھ رکھے تھے۔ اس لیے جب بھی وہ پڑھتے تھے تو الفاظ کی ادائیگی میں کبھی کوئی بھول نہیں ہوتی تھی بلکہ ایسا لگتا تھا جیسے ایک ایک لفظ پوری سمجھ بوجھ کے ساتھ دل کی گہرائیوں سے نکل رہا ہے۔ اپنیشد کے شلوک کے بعد انھوں نے گیتا کے دو شلوک پڑھے۔

"آپوریہ مانم اچل پرتشٹھم ....."

سبھا کے سب ہی ممبران کے ساتھ ساتھ گنگنانے لگے۔ کچھ لوگ یہ الفاظ دہرانے میں پیچھے رہ گئے تھے اس لیے وان پرستھی جی کے پڑھ چکنے کے بعد بھی سبھا میں کچھ دیر تک گنگناتی آوازیں آتی رہیں۔

آخر میں شانتی پاٹھ ہوا اور سارا ہال مرد، عورتوں کی آوازوں سے گونجنے لگا کیونکہ شانتی پاٹھ کا منتر سب کو زبانی یاد تھا:

اوم دیو شانتی پرتھوی، شانتی راپ
شانتی روشدھیہ: شانتی ونسپتی

سچ مچ ایسا لگنے لگا جیسے شانتی کا عام اثر فضا میں پھیلنے لگا ہے۔ چاروں طرف شانتی چھانے لگی ہے اور ان آزاد گلوں سے نکلنے والی شانتی (امن) کی آواز گھر گھر تک پہنچ رہی ہے۔ 'انتم آہوتی' میں سچ مچ سب ہی کو بڑا آنند آتا تھا۔ منتر پاٹھ کے بعد ایک پرارتھنا کا گیت گایا جاتا اور اس میں بھی ساری متحرک اور غیر متحرک دنیا کے سکھ کی کامنا کی جاتی۔ تالی بجا بجا کر وان پرستھی جی گا رہے تھے۔

"سب پر دیا کرو بھگوان
سب پر کرپا کرو بھگوان ۔۔"

پنیہ آتما جی کے اصرار پر ست سنگ میں روایتی انداز میں آرتی کا گانا بہت کم کر دیا گیا تھا، کیونکہ اس میں "میں مورکھ، کھل کامی"، جیسے لفظوں کا استعمال کیا گیا تھا جو وان پرستھی جی کی رائے میں احساس کمتری پیدا کرتے تھے۔ اسی طرح کسی کھنہ جی کا لکھا ہوا وہ گیت بھی نکال دیا گیا تھا جس میں "ہم سب ہی پوت کپوت تیرے" کے الفاظ شامل تھے اور جو وان پرستھی جی کو پسند نہیں تھے۔

'انتم آہوتی' ختم ہوتی۔ اس کے بعد سبھا کو ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن سبھا کے ممبران بیٹھے رہے کیونکہ منتری جی کوئی ضروری اطلاع دینا چاہتے تھے۔ منتری جی اٹھے، لیکن اٹھ کر انھوں نے اتنا ہی کہا کہ سبھا برخاست ہونے کے بعد 'انترنگ سبھا' کے سب ہی ممبر از راہِ کرم بیٹھے رہیں۔ ایک اہم موضوع پر غور کرنا ہے۔ اس اہم موضوع کے بارے میں بھی سبھا کے ممبروں کو پہلے سے ہی اندیشہ تھا۔ وان پرستھی جی کے بھاشن میں بھی بار بار اس موضوع کا اشارہ ملتا رہا تھا، یہاں تک کہ پرَوچن دیتے وقت وان پرستھی جی خود بھی سخت بے چین اور جذباتی ہو گئے تھے۔ ان کا چہرہ تمتمانے لگا تھا، اور ہونٹ پھڑ پھڑانے لگے تھے، خاص طور سے اس وقت جب انھوں نے بلند آواز میں یہ شعر پڑھا تھا۔

" پھیلائے گھور پاپ یہاں مسلمین نے
نعمت فلک نے چھین لی، دولت زمین نے "

اس لیے سب ہی لوگ جانتے تھے کہ اُنتر نگ سبھا کس موضوع پر غور کرنے والی ہے۔

منتری جی کے اعلان کے بعد لوگ اٹھنے لگے۔ مجلس برخاست ہونے لگی۔ لوگ مندر کے سات دروازوں میں سے نکل نکل کر برآمدے میں اپنا اپنا جوتا تلاش کر کے پہننے لگے۔ کچھ لوگ مندر میں داخل ہوتے وقت جان بوجھ کر دائیں پیر کا جوتا ایک دروازے کے سامنے اور بائیں پیر کا جوتا تیسرے یا چوتھے دروازے کے سامنے چھوڑ دیتے تھے تاکہ سَت سنگ کے بعد جوتوں کا دوبارہ مل جانا یقینی ہو سکے۔ اس لیے برآمدے میں تھوڑی دیر تک بھیڑ سی رہی۔ یوں بھی سبھا ختم ہو جانے کے بعد دو دو چار چار آدمی برآمدے میں باتیں کرتے رہا کرتے تھے، اور آج تو شہر کی صورتِ حال کا ذکر ہر شخص کی زبان پر تھا۔ وان پرستھی جی اپنی دل کو چھونے والی تقریر کے بعد ابھی تک وَیدی پر بیٹھے تھے۔ وہ ابھی تک مشتعل معلوم ہوتے تھے اور ان کا چہرہ دمک رہا تھا۔

اسی وقت آنگن میں سے کچھ لوگ مندر کے اندر آتے دکھائی دیے۔ برآمدے میں کھڑے دو چار آدمیوں نے انھیں پہچان لیا۔ وہ شہر کے دیگر ہندو دھارمک سنستھاؤں کے معزز عہدہ دار تھے۔ ان کے پیچھے پانچ سات سِکھ بھی اندر آتے دکھائی دیے۔ وہ علاقہ کے بڑے گوردوارے سے آئے تھے۔ انھیں بھی 'اُنتر نگ سبھا' کی بیٹھک میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔

'انترنگ سبھا' کی بیٹھک شروع ہوئی۔ منتری جی نے، جو دبلے پتلے لیکن بڑے جوشیلے آدمی تھے، شہر کی بگڑتی صورتِ حال کا تجزیہ پیش کیا۔ کچھ افواہوں کا بھی تذکرہ کیا۔ مسجد کے سامنے پائی جانے والی سوّر کی لاش کا ذکر کیا۔ یہ بھی بتایا کہ جامع مسجد میں لاٹھیاں، بھالے اور طرح طرح کا اسلحہ بہت دنوں سے جمع کیا جا رہا ہے۔ شہر کی صورت حال کی رپورٹ دینے کے بعد منتری جی نے اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کرنے اور اپنے اپنے سجھاؤ پیش کرنے کی درخواست کی۔

"یہاں پر بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔"

یہ آواز وان پرستھی جی کی تھی، جو وَیدی پر بیٹھے اپنا ہاتھ اٹھا کر سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔ "اس مسئلے پر کسی دوسری جگہ بیٹھ کر غور کرنا چاہیئے۔"

اور وان پرستھی جی ویدی سے اتر آئے اور مندر کے پچھواڑے کی طرف چل دیے۔ باقی سب ہی لوگ ان کے پیچھے پیچھے جانے لگے۔ مندر کے پچھواڑے سے زینہ پر چڑھ کر وان پرستھی سب ہی لوگوں کو ایک چھوٹے کمرے میں لے گئے، جہاں مندر کا ساز سامان رکھا رہتا تھا اور چند کرسیاں اور بنچیں پڑی رہتی تھیں۔

سب لوگوں کے بیٹھ جانے پر پنڈت آتما جی آہستہ لیکن سنجیدہ آواز میں بولے۔

"سب سے پہلے اپنی حفاظت کا انتظام کیا جانا چاہیئے۔ سب ہی ممبر اپنے اپنے گھر میں ایک کنستر کڑوے تیل کا رکھیں۔ ایک ایک بوری کچا یا پکا کوئلہ رکھیں۔ کھولتا ہوا تیل دشمن پر ڈالا جا سکتا ہے۔ جلتے انگارے چھت کے اوپر سے پھینکے جا سکتے ہیں....."

ممبر دھیان سے سنتے رہے۔ بات دوٹوک تھی لیکن وان پرستھی جی کے منھ سے یہ بات سنتے ہوئے کچھ لوگوں کو جھینپ سی محسوس ہوئی۔ زیادہ تر ممبر تاجر لوگ تھے اور بڑی عمر کے تھے۔ کچھ نوکری پیشہ لوگ بھی تھے۔ دو ایک وکیل بھی تھے۔ پریشان تو سب ہی تھے لیکن وان پرستھی جی کی طرح جوش میں نہیں تھے۔ انھیں ابھی تک پوری طرح یقین نہیں ہو پایا تھا کہ شہر کی حالت یہاں تک بگڑ چکی ہے کہ گھروں میں تیل کے کنستر رکھنے کی نوبت آ گئی ہے۔ وہ ابھی تک یہ سمجھتے تھے کہ چھوٹے موٹے ایک دو واقعات کے بعد سرکار حالات پر قابو پا لے گی۔ شرارت کو دبائے گی اور فساد نہیں ہونے دے گی۔

یہ سب سن کر ایک صاحب نے منتری جی سے کہا۔

"یووک سماج کا کام ٹھنڈا پڑا ہے۔ دیوورت جی کو آپ نے اور کاموں میں لگا رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں نوجوانوں کو لاٹھی سکھانے کا کام فوراً شروع کر دینا چاہیئے۔ دو سو لاٹھیاں آج ہی منگوا کر بانٹ دی جائیں۔"

یہ سن کر سبھا کے دان ویر پردھان جی نے، جو شہر کے مشہور و معروف تاجروں میں سے تھے، سر ہلا کر کہا۔

"یہ رقم میں دوں گا۔ آپ آج ہی دو سو لاٹھیاں منگوا کر بانٹ دیں۔"

"واہ وا" کی آواز سنائی دی۔ حاضرین نے پردھان جی کی دریا دلی کی بھرپور

تعریف کی۔ بیچ میں سے ایک ممبر کی آواز آئی۔

"ہم ہندوؤں کی یہی تو کمزوری ہے۔ ہم پیاس لگنے پر کنواں کھدواتے ہیں۔ آج جب حالت بگڑ رہی ہے اور مسلمان جامع مسجد میں اسلحہ اکٹھا کر رہے ہیں، ہم لاٹھیاں خریدنے جا رہے ہیں۔"

اس پر منتری جی فوراً بولے۔

"اس مسئلے پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نوجوان طبقہ پوری طرح تیار ہے اور اس طرف پورا پورا دھیان دیا جا رہا ہے۔ خود وان پرستھی جی تن من کے ساتھ اس کام میں دلچسپی لے رہے ہیں، پٹھن پاٹھن اور ہَوَن یگیہ کے علاوہ ہندوؤں کو منظم کرنے کی مہم میں پوری لگن کے ساتھ کام کر رہے ہیں، لیکن پردھان جی کے سجھاؤ کا میں سواگت کرتا ہوں۔ ان کی فیّاضی کے بل بوتے پر ہمارے کتنے ہی کام پورے ہوئے ہیں۔ ہمیں اپنی تیاری میں کوئی کمی نہیں آنے دینا چاہیئے۔"

باہر سے آئے لوگوں میں سے ایک بزرگ نے جو بڑی دیر سے اپنی چھڑی پر ٹھوڑی رکھے بیٹھے تھے اور جنھوں نے ایک ایک کر کے اپنی دونوں ٹانگیں کرسی پر چڑھا لی تھیں، اپنی باریک تیکھی آواز میں بولے۔

"بھائیو! یہ سب ٹھیک ہے، لیکن میں کہوں گا کہ ڈپٹی کمشنر کے پاس جاؤ۔ اس سے ملو۔ پانی بھی مت پیو، اور ڈپٹی کمشنر سے ملو۔ یہ بکھیڑا یہاں ختم ہونے والا نہیں ہے۔ اس سے ملو اور اسے سمجھاؤ کہ ہندوؤں کے جان و مال کو بہت خطرہ ہے۔"

"ڈپٹی کمشنر کے پاس جانا ضروری ہے لیکن لالہ جی اپنی حفاظت تو اپنے آپ کرنی ہوگی۔" وان پرستھی جی نے کہا۔

"اد، مہاراج! بچوں کو لاٹھی چلانا ضرور سکھاؤ۔ نیزہ اور تلوار چلانا بھی سکھاؤ۔ سورما بن جائیں گے ہمارے بیٹے۔ لیکن سب سے پہلے ڈپٹی کمشنر سے ملو۔ اس سے کہو کہ شہر میں فساد نہیں ہونے دے۔ اس کا بڑا دبدبہ ہے۔ وہ چاہے تو چڑیا بھی نہیں پھڑک سکتی۔"

"آج اتوار ہے۔ ڈپٹی کمشنر نہیں ملے گا۔" منتری جی نے کہا۔

"میں کہتا ہوں گھر پر جا کر ملو۔ یہی وقت ہے یہیں سے کچھ لوگ، اٹھ کر سیدھے

ڈپٹی کمشنر کے گھر چلے جاؤ۔"
یہ سن کر ایک سکھ سجّن نے اطلاع دی۔
"میں نے سنا ہے ایک وفد پہلے ہی ڈپٹی کمشنر سے ملنے چلا گیا ہے۔"
"کون لوگ ہیں اس میں؟"
"اس میں کچھ کانگریسی ہیں کچھ لیگی ہیں اور شہر کے دوسرے لوگ ہیں۔"
تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔
"وہ وفد کیا کرے گا؟ ہندوؤں اور سکّھوں کو الگ سے جا کر ملنا چاہیئے۔ اسے تو یہ بتانا ہے کہ دیکھو یہ لوگ کیا رہے ہیں۔ اگر مسلمان بھی ساتھ ہوں گے تو ڈپٹی کمشنر سے تم کیا کہہ سکتے ہو؟ یہ سارا کام تو کانگریسیوں نے بگاڑا ہے۔ انھوں نے ہی مسلّوں کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔"
"شرارت تو بہت بڑھ رہی ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔" ایک سکھ سجّن بولے۔ "سنا ہے' ایک گائے بھی کاٹی گئی ہے۔ مائی ستّو کی دھرم شالہ کے باہر اس کے ٹکڑے پھینکے گئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم' یہ خبر کہاں تک صحیح ہے۔ لیکن سننے میں ضرور آیا ہے۔"
اس پر دان پرستھی جی کا چہرہ تمتمانے لگا۔ ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا مگر کچھ بولے نہیں۔ اپنے جوش کو دبائے چپ چاپ بیٹھے رہے۔
"گئو وَدھ ہوا تو یہاں خون کی ندّیاں بہہ جائیں گی۔" منتری جی مشتعل ہو کر بولے۔
کچھ دیر تک سب ہی خاموش رہے۔ اگر یہ بات سچ مچ ٹھیک ہے تو اس کے پیچھے گہری شرارت ہے۔ مسلمان جو نہ کرے کم ہے۔ اس لیے وسیع پیمانے پر شہر کے ہندوؤں اور سکّھوں کی تنظیم کرنے اور اپنے بچاؤ کا ایک مشترک منصوبہ تیار کرنے کے لیے مختلف تجاویز پر غور کیا جانے لگا۔
"محلہ کمیٹیوں کی کیا حالت ہے؟"
'یہاں محلّہ کمیٹیاں بنانا بہت مشکل کام ہے۔ سب ہی محلّوں میں مسلمان گھسے بیٹھے ہیں۔ یہ شہر ہی اس بے ڈھنگے پن سے بسا ہوا ہے کہ ہر محلّے میں ہندو بھی رہتے

ہیں اور مسلمان بھی۔ محلّہ کمیٹیاں کیسے بناؤ گے ؟ ہر بات کی خبر مسلمانوں کو مل جاتی ہے۔ 1926ء کے فسادات کے بعد دو تین محلّے ایسے بنے ہیں جن میں ہندوؤں نے آنکھیں کھول کر مکان بنوائے ہیں جیسے نیا محلّہ، راج پور وغیرہ، جو صرف ہندوؤں اور سکھّوں کے محلّے ہیں۔ ورنہ باقی سب ہی میں مسلمان بھرے ہوئے ہیں۔"

محلّہ کمیٹیوں کے بارے میں دیر تک سنجیدگی سے غور ہوتا رہا۔ ایک ذیلی کمیٹی بھی بنائی گئی جو فوراً ان محلّہ کمیٹیوں کے ساتھ رابطہ قائم کرے۔ اس بات پر بھی غور کیا جانے لگا کہ خطرے کے وقت یہ رابطہ کس طرح قائم رہے۔

ایک بزرگ نے سجھاؤ دیا۔

"شوالے پر لگے گھڑیال کی جانچ بھی کرا لیجیے۔"

کیوں ؟ اسے کیا ہوا ہے ؟"

"یوں ہی احتیاط کے طور پر۔ رات کے وقت اگر خطرے کی گھنٹی بجانی پڑ جائے تو کم سے کم وہ کام تو کرتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ رسّی کھینچو تو رسّی ہی ٹوٹ جائے۔ گھڑیال ہی نہ بجے۔"

شہر کے عین وسط میں ایک ٹیلے پر واقع، شہر کا پرانا مندر تھا۔ اسی کو لوگ شوالہ کہتے تھے۔ آس پاس دکانیں تھیں۔ وہیں مندر کے اوپر کسی زمانے میں یہ گھڑیال بھی لگایا گیا تھا۔

"مدّت بھی تو بہت ہو چکی ہے۔" وہ بزرگ کہہ رہے تھے۔" 1927ء میں لگوایا گیا تھا — شاید اس سے بھی پہلے۔"

اس بات پر ایک شخص کے منھ سے یکایک نکل گیا۔

"نہ ہی بجے تو اچھا ہے، بھگوان کبھی نہ بجوائے۔"

"اسی جذبے نے تو ہمیں بزدل بنا دیا ہے۔" وان پرستھی جی تنک کر بولے۔" بات بات پر خطرے سے ڈرنا — اسی وجہ سے ملیچھ لوگ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کو 'کراڑ' اور 'بنیا' کہہ کر پکارتے ہیں۔"

لوگ پھر چپ ہو گئے۔ احساسات سب ہی کے ایک جیسے تھے لیکن وہ وان پرستھی جی کی طرح جوش میں نہیں تھے۔ وہ بھی یہ بات مانتے تھے کہ مسلمان شرارت کریں گے

لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ فساد پھوٹ پڑے، کیونکہ اس سے سچ مچ ہندوؤں اور سکھوں کے جان ومال کو خطرہ تھا۔

کچھ دیر تک تدابیر اور ذرائع پر بھی غور ہوتا رہا۔ حفاظتی اقدامات اور فسادات کو روکنے کی تدابیر پر بھی غور کیا گیا۔ متعدد تجاویز پیش کی گئیں۔ محلّہ کمیٹیاں بنائی جائیں، والنٹیر دستے بھی بنائے جائیں۔ شہر کی تمام ہندو سکھ تنظیموں کے ساتھ رابطہ برقرار رکھا جائے۔ کڑوے تیل کے علاوہ ریت اور پانی کا بھی انتظام رکھا جائے۔ اس سنجیدہ تبادلہ خیال کے درمیان وہ بزرگ اپنی تجویز کسی راگ کے مستقل بند کی طرح بار بار دہراتے رہے۔

"ارے، بھائیو! ڈپٹی کمشنر سے ملو۔ پانی بھی نہ پیو، ڈپٹی کمشنر سے ملو۔ یہیں سے اٹھ کر کچھ لوگ اس کے پاس سے چلے جاؤ۔ میں بھی ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

آخر کار یہی طے ہوا کہ منتری جی پیچھے رک جائیں۔ تیل، کوئلہ اور لاٹھیوں کے بارے میں کیے گئے فیصلوں سے، گھر گھر چپراسی بھیج کر ممبروں کو مطلع کریں۔ چوکیداری کے لیے گورکھوں کا انتظام کریں۔ شوالے کے گھڑیال کی مرمّت کے لیے سناتن دھرم سبھا کے منتری سے بات کریں، یووک سبھا کو چوکس کریں، جبکہ انترنگ سبھا کی میٹنگ میں حصّہ لینے والے دیگر سب ہی لوگ اسی وقت تانگوں میں بیٹھ کر ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کی طرف روانہ ہو جائیں — وان پرستھی جی کو یہیں چھوڑ دیں، اس لیے روحانیت کا اپدیش دینے والے اور سفید بانا پہننے والے وان پرستھی جی کا یہ کام نہیں کہ دنیاوی بکھیڑوں میں عام لوگوں کے ساتھ گھسٹتے پھریں۔

گھر پہنچے تو دان ویر پردھان جی کو پتہ چلا کہ بیٹا گھر پر نہیں ہے۔ ان کا ماتھا ٹھنکا کہ وہ کہیں ابھی سے تو اس آندھی کی لپیٹ میں نہیں آ گیا جو شہر میں اٹھنے والی ہے۔

وہ جس وقت گھر کی طرف لوٹ رہے تھے، اسی وقت ان کا بیٹا رن ویر، اکھاڑے کے منتظم ماسٹر دیو ورت کے پیچھے پیچھے، شہر کی تنگ گلیوں میں ایک گلی کے بعد دوسری گلی پار کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ماسٹر دیو ورت کے بوجھل بوٹوں کی ٹاپ گلیوں کی دیواروں

ٹکرا ٹکرا کر گونج رہی تھی اور ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے پندرہ سالہ نوخیز رَن ویر کے دل میں امنگیں لہروں کی طرح اٹھ رہی تھیں اور رونگٹوں میں ہیجان سا پیدا ہو رہا تھا۔ آج اس کا امتحان ہوگا۔ اگر وہ امتحان میں پورا اترا تو اسے سند ملے گی۔

شہر کی کوئی گلی سیدھی نہیں تھی۔ ایک گلی تھوڑی دیر تک سیدھی چلتی، پھر چند گز کی دوری پر ایک اور ٹیڑھی گلی اس میں آملتی تھی۔ دونوں طرف کے ایک منزلہ مکان اس پر جھکے پڑتے تھے۔ ایسا لگتا کہ ان ہی کے بوجھ سے گلی ٹیڑھی ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی ایسا لگتا کہ اندھی گلی میں پہنچ گئے ہیں اور آگے چل کر گلی بند ملے گی۔ لیکن آخری سرے تک پہنچنے پر ایک پتلا سا راستہ دائیں یا بائیں طرف کو نکلتا ہوا دکھائی دیتا۔ دیوورت کے کھٹ کھٹ کرنے والے بوٹ سب ہی گلیاں پہچانتے تھے۔

رَن ویر عمر میں چھوٹا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی نگاہوں میں اشتیاق، تجسس اور عام قسم کا اعتماد جھلکتا تھا۔ اس میں وہ سنجیدگی نہیں تھی جو کسی خاص امتحان یا آزمائش کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ لیکن سنجیدگی نہ سہی، جوش تو تھا۔ ماسٹر جی کے حکم پر مر مٹنے کا حوصلہ تو تھا، قوت ارادی بھی تھی۔

رَن ویر جب اس سے بھی چھوٹا تھا تو مسحور ہو کر، ماسٹر جی کے منھ سے بہادروں کی کہانیاں سنا کرتا تھا۔ جب رانا پرتاپ کی آدھی بچی ہوئی روٹی بلی کھا گئی تھی اور انھیں پہلی بار اپنی بے بسی کی حالت کا احساس ہوا تھا۔ وہ شہر کے آس پاس کے پہاڑوں کو دیکھتا تو اسے ان پہاڑوں پر چیتک گھوڑا دوڑتا نظر آتا، کبھی کسی چٹان پر، گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے شواجی نظر آجاتے، دور ترکوں کے لشکر کی طرف دیکھتے ہوئے جب شواجی ملیچھ سردار سے بغل گیر ہوئے تھے۔ ماسٹر جی نے ہی رسّی میں طرح طرح کی گانٹھیں لگانا سکھایا تھا، مکان کی دیوار پھاند کر اوپر چڑھنا بھی سکھایا تھا۔ 'اگنی بان' اور 'میگھ بان' کی خوبیاں بتائی تھیں۔

"ہوا میں چھوڑا ہوا 'اگنی بان' آگے بڑھتا ہے، اس کی نوک رگڑ کے سبب چمکتی ہے، اس میں سے انگارے پھوٹتے ہیں۔ مہا بھارت کی جنگ میں ایسا ہی 'اگنی بان' چھوڑا گیا تھا۔ ہوا کو کاٹتا چلا جا رہا تھا۔ پھر وہ کوروں کے ایک سورما کی ڈھال میں جا لگا۔ ڈھال

میں سے انگارے پھوٹنے لگے۔ لیکن تیر پھر بھی آگے بڑھتا ہی چلا گیا۔‘ اگنی بان کی یہی خاصیت ہے کہ وہ گرتا نہیں۔ یہ بان گھومتا ہے‘ سارے میدانِ جنگ میں گھومتا ہے‘ گھومتا ہے اور چاروں طرف سے آگ کی لپٹیں اٹھنے لگتی ہیں۔ کہیں کسی سورما کے تاج کو چھولیا تو وہاں بھی آگ کی لپٹیں اٹھنے لگیں۔ کہیں کسی رتھ کی چھت سے جالگا تو چھت جلنے لگی۔ چاروں طرف گھومتا ہوا بان اس وقت تک گھومتا رہتا ہے جب تک دھوں دھوں کرکے چاروں طرف آگ نہیں جلنے لگتی ہے۔ پھر بان واپس آجاتا ہے‘ دشمن کی چھاؤنی کو جلاکر‘ جیتے ہوئے سپاہی کی طرح لوٹ آتا ہے۔ اس میں سے روشنی پھوٹ رہی ہوتی ہے۔ دیکھتے دیکھتے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ ہوا کو چیرتا ہوا آتا ہے‘ ایسا لگتا ہے جیسے ہوا کو آگ لگاتا جارہا ہے۔۔۔‘

ماسٹر جی کے منھ سے سنا تھا کہ وید میں سب لکھا ہے‘ ویمان (ہوائی جہاز) بنانے کا طریقہ‘ بم بنانے کا طریقہ۔ ان ہی کے منھ سے یوگ شکتی کی عظمت کی تعریف بھی سنی تھی۔ ‘ جس انسان میں یوگ شکتی ہے وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ ہمالیہ کی وادی میں ایک یوگی راج یوگ سادھنا کررہے تھے۔ وہ یوگ میں مرتبہ کمال کو پہنچ چکے تھے۔ ایک دن جب وہ مراقبہ میں تھے تو ایک ملیچھ ان کا دھیان ہٹانے کے لیے وہاں جا پہنچا۔ ملیچھ لوگ تو گندے ہوتے ہیں‘ وہ نہاتے نہیں ہیں‘ پاخانہ کرکے ہاتھ نہیں دھوتے۔ ایک دوسرے کا جھوٹا کھالیتے ہیں۔ وقت پر پاخانہ کو نہیں جاتے ہیں۔ تو وہ گندا ملیچھ یوگی جی کے سامنے کھڑا ہوکر انھیں گھورنے لگا۔ اس کا گندا سایہ پڑنے کی دیر تھی کہ یوگی جی نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ آنکھوں میں سے ایسی مقدّس روشنی نکلی کہ ملیچھ وہیں کھڑا کھڑا بھسم ہوگیا۔۔۔‘

رن ویر کی آنکھوں کے سامنے بار بار ملیچھ گھوم جاتے تھے۔ پڑوس میں سڑک کے کنارے بیٹھا موچی ملیچھ ہے۔ گھر کے سامنے تانگہ ہانکنے والا گاڑی بان ملیچھ ہے۔ میری ہی جماعت میں پڑھنے والا حمید ملیچھ ہے۔ گلی میں بھیک مانگنے والا فقیر ملیچھ ہے۔ پڑوس میں رہنے والا خاندان بھی ملیچھ ہے۔ ایسا ہی کوئی ملیچھ یوگی راج کی سادھنا میں خلل ڈالنے کے لیے ہمالیہ پہنچ گیا ہوگا۔

آج اپنے آٹھ ساتھیوں میں سے اکیلے رن ویر کو امتحان کے لیے چُنا گیا تھا۔

دیو ورت جی سے سب ہی کو ڈر لگتا تھا۔ وہ خاکی نیکر کے نیچے کالے رنگ کے ڈبل بوٹ پہنتے تھے، کڑکتی آواز میں بولتے تھے اور کسی کی بھی کسی بھی وقت پٹائی کر سکتے تھے۔ لیکن یہ امتحان خفیہ تھا۔ صرف اس حلقے کے کچھ نوجوان ہی اس کے بارے میں جانتے تھے اور وہ بھی یہ راز کسی کو نہیں بتاتے تھے۔

گلیاں اجڑی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔ ایک جگہ رن ویر کو ایسا لگا جیسے کچھ فاصلے پر گلی سخت اندھیرے میں گم ہو گئی ہو، لیکن قریب پہنچنے پر پتہ چلا کہ کسی گھر کی دیوار ٹوٹی ہوئی تھی اور کھپّے میں سے اندھیرا جھانک رہا تھا۔

ایک جگہ دیو ورت جی کے قدم رک گئے۔ رن ویر کا دل ابھی تک جوش اور امنگ سے بلّیوں اچھل رہا تھا، حالانکہ اس سنسان گلی میں پہنچ کر وہ کچھ سہم سا گیا تھا۔ لمبی دیوار میں مٹی سے اٹا ہوا ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ ماسٹر جی نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کو ڈھکیل کر کھول دیا۔

سامنے ایک چوڑا سا آنگن تھا جس کے پار ایک کوٹھری کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا۔ آنگن میں بائیں طرف اینٹوں، پتھروں کا ڈھیر لگا تھا۔ رن ویر کو یہ جگہ بڑی عجیب سی لگی۔

آنگن پار کر کے ماسٹر جی نے کوٹھری کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوٹھری کے اندر کوئی کھنکھارا پھر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

"میں ہوں، دیو ورت۔"

دروازہ کھلا۔ سامنے اسکول کا بوڑھا گورکھا چوکیدار کھڑا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

کوٹھری کے اندر اندھیرا تھا۔ اس میں ایک طرف ایک کھاٹ پڑی تھی اور اس پر ایک میلی سی دری بچھی تھی۔ دائیں طرف دیوار کے سہارے ایک لاٹھی رکھی تھی۔ پاس ہی ایک چلم الٹی رکھی تھی۔ دیوار میں کھونٹی پر چوکیدار کا خاکی رنگ کا لمبا گرم کوٹ ٹنگا ہوا تھا اور اسی کے اوپر، اس کھونٹی کے سہارے کالے رنگ کی میان میں بند کرچ (سنگین) لٹک رہی تھی۔

اتنے میں بائیں طرف سے مرغیوں کے کڑکڑانے کی آواز آئی۔ رن ویر نے گردن

گھما کر دیکھا۔ ایک بڑی سی ٹوکری میں سفید رنگ کی پانچ چھ مرغیاں بند تھیں۔

رَن ویر کو بازو سے پکڑ کر ماسٹر جی پچھلے آنگن میں لے آئے۔ وہ آنگن چھوٹا تھا اور دوسری طرف ساتھ والے مکان کی اونچی دیوار کھڑی تھی۔ گورکھا ایک ہاتھ میں مرغی اٹھائے اور دوسرے ہاتھ میں چھرا لیے ان کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

"ادھر دیوار کے پاس بیٹھ جاؤ، رن ویر! اور اس مرغی کو کاٹو۔ سند پانے سے پہلے تمھیں دماغی مضبوطی کا ثبوت دینا ہوگا۔"

انھوں نے رَن ویر کا بازو پکڑا اور اسے آگے لے آئے۔ "آریہ نوجوان کے لیے دماغی، زبانی اور عملی تینوں قسم کی مضبوطی کی ضرورت ہے۔ چھری ہاتھ میں لو، اور ادھر بیٹھ جاؤ۔"

رن ویر کو ایسا لگا جیسے چاروں طرف ایک بھیانک خاموشی چھا گئی ہو۔ بھیانک سنّاٹا۔ دائیں طرف ٹوٹی اینٹوں کا ڈھیر تھا جس پر جگہ جگہ مرغیوں کے پَر بکھرے پڑے تھے۔ ڈھیر کے پاس، نیچے کی طرف پتھر کی ایک سِل تھی جو مرغیوں کے خون سے کالی پڑ گئی تھی۔

"ادھر بیٹھ جاؤ۔ مرغی کا ایک پیر اپنے دائیں پیر کے نیچے دبا لو۔" رن ویر کے ہاتھ میں چھرا دیتے ہوئے انھوں نے مرغی کے دونوں پیر پکڑ کر ایک دوسرے کے نیچے کھونس دیے۔ ایک پَر کے نیچے دوسرا پَر کھونسا، پھر اوپر والے پَر کو مروڑ کر پہلے پَر کے نیچے کر دیا۔ مرغی زور سے کڑکڑائی لیکن پَر بندھ جانے کی وجہ سے پھڑپھڑانا بند ہو گیا۔

"لو پکڑو۔" ماسٹر جی نے کہا اور رَن ویر کے پاس بیٹھ گئے۔ "اب چلاؤ چھری۔"

لیکن رَن ویر کے ماتھے پر پسینہ آگیا تھا۔ اس کا چہرہ بری طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ ماسٹر جی سمجھ گئے کہ اسے متلی ہونے والی ہے۔

"رن ویر!" انھوں نے چلّا کر کہا اور ایک سیدھا تھپڑ اس کے گال پر دے مارا۔ رَن ویر دہرا ہو کر زمین پر جا گرا۔ اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ گورکھا ابھی تک ان کے پیچھے کھڑا تھا۔ رن ویر کو رونا آرہا تھا لیکن تھپڑ کھانے سے اس کی متلی بڑی حد تک کم ہو گئی تھی۔

"اٹھو، رن ویر!" ماسٹر جی نے ڈپٹ کر کہا۔
رن ویر اٹھا اور بوجھل تھکی تھکی آنکھوں سے ماسٹر جی کی طرف دیکھنے لگا۔
"اس میں کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ لو میں تمھیں دکھاتا ہوں۔"
اور انھوں نے مرغی کا پیرا اپنے دائیں بوٹ کے نیچے دبایا۔ مرغی کی آنکھیں پہلے ہی مندنے لگی تھیں۔ ماسٹر جی نے اس کا گلا اپنے بائیں ہاتھ میں لیا اور چھری کو صرف ایک بار اس کے گلے پر پھیر دیا۔ خون کی دھار پھوٹ پڑی۔ کچھ بوندیں ماسٹر جی کے ہاتھ پر بھی پڑیں۔ لیکن ماسٹر جی نے مرغی کو نہیں چھوڑا۔ مرغی کا سر الگ ہو کر ان کے بوٹ کے پاس ہی پڑا تھا، لیکن ماسٹر جی اس کی گردن کی نلی کو نیچے کی طرف دبائے رہے۔ سفید سی نلی باہر آنے کے لیے اچھل رہی تھی جسے ماسٹر جی انگوٹھے سے دبائے ہوئے تھے۔ مرغی کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ ماسٹر جی زور سے نلی کو دبائے رہے اور کچھ ہی دیر بعد مرغی کا جسم ساکت ہو گیا، اور خون سے لت پت مٹھی بھر پَر رن ویر کے سامنے پڑے رہ گئے۔ ماسٹر جی نے مرغی کو ایک طرف پھینک دیا، اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔
"اندر سے ایک اور مرغی لے آؤ۔" انھوں نے گو رکھا سے کہا۔
اسی وقت انھوں نے دیکھا کہ رن ویر نے بیٹھے بیٹھے قے کر دی ہے اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے بیٹھا ہانپ رہا ہے۔ ماسٹر جی کا دل چاہا کہ ایک تھپڑ اور رسید کر دیں لیکن چپ چاپ کھڑے رہے۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ دھیمی آواز میں بولے۔
"تمھیں ایک موقع اور دیا جاتا ہے۔ جو نوجوان ایک مرغی کو نہیں مار سکتا، وہ دشمن کو کیسے مار سکتا ہے۔"
تھوڑی دیر ہانپتے رہنے کے بعد رن ویر تھوڑا ہلکا پن محسوس کرنے لگا۔ پیٹ میں جو بے چینی پیدا ہوئی تھی وہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔
"تمھیں پانچ منٹ اور دیے جاتے ہیں، اس مدّت میں اگر تم اسے نہیں کاٹ سکے تو تمھیں سند نہیں دی جائے گی۔"
اور ماسٹر جی پلٹ کر کوٹھری کے اندر چلے گئے۔
پانچ منٹ بعد جب دیو ورت جی کوٹھری سے باہر آئے تو ایک مرغی دیوار کے پاس پھڑ پھڑا رہی تھی اور خون کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ رن ویر اپنا دایاں ہاتھ

گھٹنوں کے درمیان دبائے بیٹھا تھا۔ اس کیفیت کو دیکھ کر ماسٹر جی سمجھ گئے کہ مرغی نے ہاتھ پر چونچ ماری ہے اور رن ویر اسے صرف زخمی کر پایا ہے۔ اس کی گردن پوری طرح نہیں کاٹ پایا ہے۔ رن ویر بڑی مشکل سے مرغی کو دبوچ پایا تھا اور جیسے تیسے اس کی ہلتی گردن پر چھرا چلا دیا تھا' اور پھر خون نکلتا دیکھ کر ہی رن ویر نے اسے چھوڑ دیا تھا۔

مرغی بار بار زمین سے اچھل رہی تھی۔ ایک ایک گز اونچی اچھلتی اور نیچے گرنے پر اس کے پَر اور بھی بکھر جاتے اور گردن میں سے رِستے خون سے زمین پر ایک اور دھبا پڑ جاتا۔ اور مرغی پھر سے اچھلتی اور خون کے چھینٹے اڑنے لگتے۔

لیکن رن ویر امتحان میں پاس ہو گیا تھا۔

"اٹھو، رن ویر!" ماسٹر جی نے کہا اور پاس آکر رن ویر کی پیٹھ تھپتھپا دی۔ "شاباش! تمھارے اندر قوت ارادی تو ہے اگرچہ ہاتھ میں زیادہ طاقت نہیں ہے۔ تم سند پانے کے مستحق ہو۔" یہ کہتے ہوئے ماسٹر جی زمین کی طرف جھکے اور پتھر کی سِل پر پڑے خون سے اپنی انگلی بھگو کر رن ویر کے ماتھے پر خون کا ٹیکا لگا دیا۔

رن ویر ابھی تک بے سدھ سا کھڑا تھا۔ اس کا سر ابھی تک چکرا رہا تھا' لیکن اس نیم بے ہوشی کی حالت میں بھی ماسٹر جی کی بات سن کر اسے اطمینان ہوا۔

دیگر تمام چیزوں کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ لیکن نوجوانوں کو تیل ابالنے کے لیے بڑی کڑاہی نہیں مل رہی تھی۔ کھڑکی کے داسے پر ایک چھرا' ایک چھوٹی سی کرپان ساتھ ساتھ ملا کر رکھ دیے گئے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں دس لاٹھیاں رکھی تھیں جن کے سر پر پیتل کی موٹھ اور نیچے میخیں گاڑ دی گئی تھیں۔ دیوار پر ایک کیل کے ساتھ ایک تیر کمان لٹک رہے تھے۔ بودھ راج لیٹ کر تیر چلا سکتا تھا۔ آواز کی سمت میں تیر چلا سکتا تھا' آئینے میں عکس دیکھ کر تیر چلا سکتا تھا۔ لٹکتی رسّی کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ تیروں کے سرے لگانے کے لیے وہ دھات کی تکونی نوکیں بنوا لایا تھا اور اپنے ساتھیوں کے سامنے ان کی خصوصیات بیان کرتا رہتا تھا۔ "اس کی نوک پر سنکھیا رگڑ دیں تو یہ 'وِش بان' (زہر آلود تیر) بن جائے گا۔ اس کے آگے مشک اور کافور لگا دیں تو

اگنی بان (آتش تیر) بن جائے گا، جہاں وار کرے گا وہیں آگ نکلنے لگے گی۔ نیلا تھوتھا لگا دیں تو جہاں یہ تیر لگے گا وہاں سے زہریلی گیس نکلنے لگے گی۔

دھرم دیو کہیں سے کارتوسوں کی خالی پیٹی اٹھا لایا تھا۔ اسے بھی دیوار پہ لٹکا دیا گیا تھا تاکہ ہر طرف سے ہتھیاروں کی موجودگی کا احساس ملتا رہے۔ رن ویر نے کمرے کے اندر ہی دروازے اوپر بڑے بڑے حرفوں میں "شاستراگار" (ہتھیار گھر) لکھ دیا تھا۔

لیکن وان پرستھی جی نے تیل کے بارے میں جو حکم بھیجا تھا، اسے ابھی تک پورا نہیں کیا گیا تھا۔ "یوو ک سنگھ" کے ممبروں میں سے کسی کے گھر بھی اتنی بڑی کڑاہی نہیں تھی جس میں پورا ایک کنستر تیل ابالا جا سکے۔ یوں تو تیل کا ایک کنستر بھی حاصل کر لیا گیا تھا جو ایک دیوار کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ اس کے لیے نوجوانوں نے چار چار آنے جمع کیے تھے اور باقی کچھ پیسے بعد میں ادا کرنے کا وعدہ کر کے کنستر پنساری کی دکان سے اٹھا لائے تھے۔ تیل کی کڑاہی مندر میں بھی نہیں تھی جہاں آئے دن 'سہ بھوج' (اجتماعی کھانا) ہوا کرتے تھے۔

دریں اثنا سنگٹھن کے لیڈر بودھ راج کو اچانک خیال آیا۔ کڑاہی تو حلوائی کی دکان سے لائی جا سکتی ہے۔

"لیکن اس کی دکان پر تالا لگا ہے۔"

"حلوائی رہتا کہاں ہے؟"

"نئے محلّے میں رہتا ہے۔"

"کسی نے اس کا گھر دیکھا ہے؟"

بودھ راج نے خود بھی اس کا گھر دیکھ رکھا تھا لیکن وہ لیڈر کی حیثیت سے اس وقت یہ چھوٹا سا کام اپنے ذمّہ نہیں لینا چاہتا تھا۔

رن ویر نے آگے بڑھ کر کہا۔ "دکان کا تالا توڑ دو۔"

نوجوانوں کے بدن میں جھرجھری پیدا ہوئی لیکن یہ تجویز وقت کے مطابق تھی۔

بودھ راج کچھ دیر تک چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ کسی تنظیم کو چلانا بڑی ذمّہ داری کا کام ہے۔ تالا توڑتے ہوئے کوئی نوجوان پکڑا نہیں جانا چاہیئے، کسی کی نظر اس پر

نہیں پڑنی چاہیئے۔ بودھ راج کمسریٹ کے بابو مست رام کا بیٹا تھا۔ مقامی کالج میں فرسٹ ایئر میں پڑھتا تھا۔ منڈلی میں یہی ایک نوجوان کئی جیبوں والی فوجی قمیص پہنتا تھا۔

"ہاں تالا توڑ دو۔ مگر یہ کام چھپ کر کرنا ہوگا۔ کون تالا توڑنے جائے گا؟"

"میں جاؤں گا" رن ویر نے آگے بڑھ کر کہا۔

بودھ راج نے رن ویر کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور سر ہلا دیا۔

"تمھارا قد چھوٹا ہے۔ تالا اوپر کو لگا ہوگا تو تمھارا ہاتھ بھی نہیں پہنچے گا۔"

"نہیں۔ تالا نیچے کو لگا ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔ میں نے کئی بار دیکھا ہے"

رن ویر بہت بڑھ چڑھ کر بات کرتا تھا۔ یہ بات بودھ راج کو بری لگتی تھی۔ لڑکا چست بھی تھا۔ بہت تیز دوڑتا تھا۔ ہر کام بہت پھرتی سے کرتا تھا۔ ہاں اس میں ڈسپلن کی کمی تھی۔

بودھ راج دل میں اس بات کو مانتا تھا کہ رن ویر جیسے بھی ہوگا کڑاہی لے آئے گا، لیکن وہ لاپرواہی برت سکتا ہے۔ کہیں کوئی غلطی بھی کر سکتا ہے جس سے منڈلی کے لیے خطرہ پیدا ہو جائے۔

"تم اور دھرم دیو دونوں جاؤ" اس نے اپنا فیصلہ سنایا "لیکن دھیان رہے، کسی کو پتہ نہ چلنے پائے کہ تم تالا توڑ کر کڑاہی لائے ہو۔ اور اس وقت جاؤ جب سڑک خالی ہو اور دونوں ایک ساتھ مت جاؤ۔ الگ الگ جاؤ"

چوراہے سے آگے بڑھتے ہی نالے کے پار بائیں طرف حلوائی کی دکان تھی۔ دکان کے پیچھے رن ویر کو کچھ ہلتا نظر آیا۔ اسے حلوائی کی پگڑی دکھائی دی۔ تو کیا اس کا مطلب ہے کہ حلوائی آ گیا ہے اور دکان کھولنے والا ہے لیکن حلوائی تو وہیں دکان کے پیچھے گھوم رہا ہے۔ کیا بات ہے، حلوائی وہاں پر کیا کر رہا ہے؟ کیا حلوائی ہے یا کوئی اور آدمی ہے؟ کوئی ملیچھ تو اس دکان لوٹنے نہیں چلا آیا؟ رن ویر نے دھیان سے دیکھا۔ حلوائی ہی تھا۔ اپنی دکان کا پچھلا دروازہ کھول رہا تھا

سڑک خالی تھی۔ اس وقت یوں بھی سڑک خالی رہتی تھی۔ کوئی اکا دکا خوانچے والا آ جائے تو آ جائے یا کبھی تانگہ۔ اس سڑک پر صرف شام کے وقت

رونق ہوتی تھی۔

دونوں نوجوان باری باری سڑک پار کر گئے۔

"تم اسے باتوں میں لگا لینا۔ میں اندر جا کر کڑاہی اٹھا لاؤں گا۔" رن دیر نے کہا

"اس کی ضرورت ہی نہیں ہو گی۔ وہ ہمارا ہندو بھائی ہے، اپنے آپ دے دے گا۔"

"میں اس سے کڑاہی مانگوں گا، تم نہیں مانگنا۔"

"چل بے چل۔ بونے! تو اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟"

پیچھے کی طرف سے ہر دو نوجوان دکان کی طرف بڑھے۔ دکان کا دروازہ کھلا تھا لیکن حلوائی باہر نہیں کھڑا تھا۔ وہ ضرور اندر چلا گیا ہو گا۔

سڑک کے کنارے ہوتے ہوئے بھی دکان کے اندر اندھیرا تھا۔ تیل، گھی اور میل سے چیکٹ تختوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ دکان کے اندر سے باسی سموسوں کی بو آ رہی تھی۔ رن دیر نے اندر جھانک کر دیکھا۔

"کیا ہے۔" اندر سے آواز آئی۔ "آج دکان بند ہے۔"

دونوں نوجوان اندر داخل ہو گئے۔ ایک طرف کو کھڑا حلوائی میدے کا ٹین بوری میں انڈیل رہا تھا۔ دروازے کے باہر کسی کا چہرہ دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔

"آؤ۔ آؤ۔" حلوائی نے مسکرا کر کہا۔ "آج کچھ نہیں بنایا۔ میں نے سوچا کہ تھوڑی رسد نکال کر گھر لیتا جاؤں۔ شہر کی فضا اچھی نہیں ہے۔ بیٹا تمھیں بھی گھر میں بیٹھنا چاہیئے۔ باہر نہیں گھومنا چاہیئے۔"

"اٹھا لو، وہ کڑاہی۔" رن ویر نے دھرم دیو کو حکم دیا۔

دھرم دیو نے پچھلی دیوار کے ساتھ لگی کڑاہیوں کی طرف دیکھا۔

"قوم حفاظت کے لیے کڑاہی لے جائی جا رہی ہے۔ سنکٹ ختم ہونے پر لوٹا دی جائے گی۔"

بات حلوائی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ "کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟ کس لیے کڑاہی کی ضرورت پڑ گئی۔ کیا کوئی بیاہ شادی ہے؟"

لیکن دونوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"بیچ والی کڑاہی اٹھا لو۔ وہ سامنے رکھی ہے۔" رن ویر نے پھر کہا۔

"ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ بتاؤ بات کیا ہے؟ کدھر لے جا رہے ہو کڑاہی؟"

"بعد میں پتہ چل جائے گا۔ اٹھاؤ جی کڑاہی۔"

"واہ! ایسے بھی کوئی کرتا ہے' نہ پوچھا' نہ مانگا۔ اپنے آپ کڑاہی اٹھالی۔ پہلے بتاؤ۔ بات کیا ہے اور تم کون ہو؟"

رن ویر نے جھٹ اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا' اور پھر چلا کر بولا۔ "تم نہیں دو گے کڑاہی؟" اور وہ اچھلا۔

اس سے پہلے کہ حلوائی کچھ کہے اس کے دائیں گال پر خون کی دھار بہہ رہی تھی۔ ایک بار اچھلنے کے بعد رن ویر کا ہاتھ پھر کرتے کی جیب میں چلا گیا تھا۔ حلوائی دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپے "ہائے ہائے" کرتا ہوا پیروں کے بل بیٹھ گیا۔ خون کی بوندیں برابر اس کے گال سے ٹپک ٹپک کر فرش پر گر رہی تھیں۔

"اس بات کا پتہ کسی کو نہ چلے ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔"

دھرم دیو کڑھائی اٹھائے نالہ پار کر گیا تھا۔ رن ویر تھوڑا ٹھٹک کر اس کے پیچھے کچھ فاصلے پر چل رہا تھا۔ رن ویر سوچ رہا تھا' کسی کو مار ڈالنا مشکل نہیں ہے۔ اسے میں آسانی سے قتل کر سکتا تھا۔ ہاتھ اٹھایا اور بس! ہاں لڑنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ بھی جب اگلا آدمی مقابلہ کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے۔ لیکن چھرا گھونپ کر مار ڈالنا آسان کام ہے۔ اس میں کوئی مشکل نہیں۔

گھر کی ڈیوڑھی میں پہنچ کر دھرم دیو رک گیا۔

"تم نے اسے مارا کیوں؟" رن ویر کے پہنچنے پر دھرم دیو نے پوچھا۔

"اس نے حجت بازی کیوں کی؟"

دھرم کا گلا سوکھ رہا تھا اور زبان ہکلا رہی تھی۔ "اگر کسی نے دیکھ لیا ہوتا تو؟ اگر حلوائی چلانا شروع کر دیتا تو؟" دھرم دیو نے تھوک نگلنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہم کسی سے ڈرتے نہیں ہے۔ کرے جو کرنا چاہتا ہے۔ تم بھی کر لو' جو تم کرنا چاہتے ہو۔" رن ویر نے دبنگ آواز میں کہا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

7

"دفتر میں ملنے کی بجائے آپ لوگ گھر پر ملنے کے لیے آئے ہیں۔ یقیناً کوئی بہت ضروری کام رہا ہو گا۔" رچرڈ نے مسکرا کر کہا۔

چپڑاسی نے چق اٹھا دی۔ شہریوں کے خیر سگالی وفد کے ممبران ایک ایک کر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ رچرڈ دروازے کے پاس ہی کھڑا رہا اور کمرے میں رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ گہری نظروں سے وفد کے ممبروں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر میز کے پیچھے کرسی پر جا بیٹھا اور بیٹھتے ہی ایک پنسل ہاتھ میں لے لی۔ چار آدمی پگڑی والے تھے، ایک رومی ٹوپی والا تھا۔ دو گاندھی ٹوپی والے تھے۔ رچرڈ نے خیر سگالی وفد کی بناوٹ سے ہی سمجھ لیا تھا کہ ان سے نبٹنا مشکل نہیں ہو گا۔

"کہیئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

ممبروں کو ڈپٹی کمشنر کا اخلاق بہت اچھا لگا۔ اس سے پہلا کمشنر تو سیدھے منھ بات بھی نہیں کرتا تھا۔

اب تک رچرڈ نے تقریباً سب ہی ممبروں کا جائزہ لے لیا تھا۔ پولس کی رپورٹوں سے وہ سیاسی آدمیوں کے بارے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کون کون لوگ ہوں گے۔ گاندھی ٹوپی والا یہ ڈھیلا ڈھالا سا آدمی بخشی ہو گا، جو سولہ برس تک جیل کاٹ چکا تھا۔ اور وہ ایک سرے پر بیٹھا رومی ٹوپی والا آدمی حیات بخش ہے، مسلم لیگ کا کارکن۔ ساتھ میں کشن کالج کا امریکی پرنسپل ہربرٹ بھی آیا ہے اور یہ لوگ ساتھ میں پروفیسر رگھوناتھ کو بھی پکڑ لائے ہیں کیوں کہ یہ میرا واقف کار ہے۔ باقی لوگ مختلف اداروں سے آئے ہوں گے۔

رچرڈ نے بخشی سے مخاطب ہو کر کہا۔
"مجھے خبر ملی ہے کہ شہر کے اندر کچھ تناؤ پایا جاتا ہے۔"
"ہم اسی سلسلے میں آپ سے ملنے آئے ہیں۔" بخشی جی بولے۔ بخشی جی بڑے جوش میں تھے۔ صبح کے سارے واقعات کے سبب وہ بہت چڑے ہوئے تھے۔ خود ہی پیش قدمی کر کے وہ سب سے پہلے لیگ کے صدر کے پاس پہنچے۔ پھر وہاں بے رخی دیکھ کر انھوں نے ڈپٹی کمشنر کے پاس خیر سگالی وفد لے جانے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے ایک ایک ممبر کو گھر سے پکڑ پکڑ کر اکٹھا کیا تھا اور اپنے ساتھ لائے تھے۔ ڈپٹی کمشنر کے پاس آنے میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔
"سرکار کی طرف سے فوراً ایسی کارروائی ہونی چاہیئے جس سے حالات قابو میں آجائیں، ورنہ اس شہر میں چیلیں منڈلائیں گی۔" انھوں نے وہی جملہ دہرا دیا جو بار بار ان کے ذہن میں گھوم رہا تھا۔ دوسرے ممبر بھی فکر مند تھے لیکن بخشی جی طرح مشتعل نہیں تھے۔
اسی وقت پروفیسر اور رچرڈ کی نظریں ملیں۔ پروفیسر ہی ایک ایسا ہندوستانی تھا جس کے ساتھ رچرڈ کا تھوڑا بہت اٹھنا بیٹھنا تھا۔ دونوں کو انگریزی ادب اور ہندوستانی تاریخ سے دلچسپی تھی اور رچرڈ کو پروفیسر ہی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی لگا کرتا تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں دونوں مسکرا دیے، جیسے کہہ رہے ہوں، یہ لوگ ہمیں بھی دنیاوی کاموں میں گھسیٹ لائے ہیں حالانکہ ہماری دنیا تو دوسری ہے۔
رچرڈ نے سر ہلایا اور میز کو پنسل سے ٹھکورا۔
"سرکار تو بدنام ہے۔ میں ایک انگریز افسر ہوں۔ برٹش سرکار پر تو آپ کو بھروسا ہی نہیں ہے، اس کی باتوں کو تو آپ کہاں سنیں گے۔" رچرڈ نے طنز سے کہا اور پنسل میز پر ٹھکورتا رہا۔
"مگر طاقت تو برٹش سرکار کے ہاتھ میں ہے اور آپ برٹش سرکار کے نمائندے ہیں۔ شہر کی حفاظت کی ذمہ داری تو آپ کی ہے۔" بخشی جی بولے اور بولتے ہوئے ان کی ٹھوڑی کانپ گئی اور جوش سے بھرا چہرہ لٹک گیا۔
"طاقت تو اس وقت پنڈت نہرو کے ہاتھ میں ہے۔" رچرڈ نے مسکرا کر کہا، "پھر

بخشی جی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا" آپ، لوگ برٹش سرکار کے خلاف بولیں تب بھی قصور برٹش سرکار کا' اور اگر آپس میں لڑیں تب بھی قصور برٹش سرکار کا۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جاری رہی لیکن وہ پھر جیسے اچانک سنبھل گیا" بہر حال کہیئے ہمیں اس مسئلے کو مل کر سلجھانا چاہیئے۔" اور اس نے حیات کی طرف دیکھا۔

"اگر پولس محتاط رہے تو کچھ نہیں ہوگا" حیات بخش بولا" ویسے مسجد کے سامنے جو کچھ پایا گیا ہے اس کے پیچھے ہندوؤں کی بہت بڑی شرارت ہے۔"

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس میں ہندوؤں کی شرارت ہے؟" دان ویر لکشمی نارائن نے اچھل کر کہا اور بولتے بولتے ان کی آواز اونچی ہو گئی۔

رچرڈ کے لیے معاملہ اپنے آپ سلجھتا جا رہا تھا۔

"ایک دوسرے کو الزام دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" رچرڈ نے کہا" آپ لوگ ظاہر ہے' معاملے کو سلجھانے کے لیے میرے پاس آئے ہیں۔"

"بیشک۔" حیات بخش بولا" ہم بھی نہیں چاہتے کہ شہر میں فساد ہو' مار کاٹ ہو۔"

لکشمی نارائن کو بڑا اکیلا پن محسوس ہوا۔ انھیں اپنے ساتھیوں پر بہت غصہ آیا۔ وہ بھی ساتھ میں ہوتے تو اس وقت تنہا انھیں مسلمانوں کے خلاف نہ بولنا پڑتا۔ ڈپٹی کمشنر کو دس باتیں بتاتے کہ جامع مسجد میں کیسے اسلحہ اکٹھا کیا جا رہا ہے۔ کیسے ایک گائے کو کاٹ ڈالا گیا ہے۔ یہاں اکیلے بولنا تو نکّو بننے والی بات تھی۔ شاید یہی بہتر ہوتا کہ ہندو سکھوں کا ایک الگ وفد ڈپٹی کمشنر سے ملتا اور ان کے سامنے سیاہ سفید کھول کر رکھتا۔

بخشی جی نے رچرڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا" اگر شہر میں پولس گشت کرنے لگے' جگہ جگہ فوج کی چوکیاں بٹھا دی جائیں تو دنگا فساد نہیں ہوگا۔ حالات قابو میں آجائیں گے۔"

رچرڈ نے سر ہلایا اور پھر مسکرا کر بولا" میں ڈپٹی کمشنر ہوں' فوج کا انتظام میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ یہاں چھاؤنی تو ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ فوج میرے حکم سے کام کرتی ہے۔"

"چھاؤنی برطانوی سرکار کی ہے اور حکومت بھی برطانوی سرکار کی ہے۔" بخشی جی نے کہا۔ "اگر آپ فوج بٹھادیں تو صورتِ حال قابو میں آجائے گی۔"

رچرڈ نے سر ہلا کر کہا۔ "فوج کو میں حکم نہیں دے سکتا۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے۔ ڈپٹی کمشنر کو ایسا کوئی حق نہیں ہے۔"

"آپ، فوج نہیں بٹھا سکتے تو شہر میں کرفیو لگادیں، اس سے حالات بدل جائیں گے۔ پولس کی چوکیاں بٹھادیں۔"

"اس چھوٹی سی بات کی وجہ سے شہر میں کرفیو لگادینے سے کیا شہر میں گھبراہٹ نہیں پھیلے گی؟ آپ کیا سمجھتے ہیں؟"

رچرڈ نے یہ بات ایسے لہجے میں کہی جیسے ان سے مشورہ مانگ رہا ہو۔ لیکن ساتھ ہی اس نے ریک میں سے ایک کاغذ اٹھایا اور اس پر پنسل سے کچھ لکھ دیا۔ پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔

"سرکار اپنی طرف سے جو کارروائی کر سکتی ہے ضرور کرے گی۔" رچرڈ نے تسلّی دینے والے لہجے میں کہا۔ "لیکن آپ لوگ شہر کے لیڈر ہیں۔ لوگ آپ کی بات دھیان سے سنیں گے۔ آپ کو چاہیئے کہ آپ مشترک طور پہ لوگوں سے اپیل کریں کہ وہ امن قائم رکھیں۔"

دو سر فوراً ہلنے لگے۔ "صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔"

رچرڈ کی بات جاری تھی۔ "مسلم لیگ اور کانگرس دونوں کے لیڈر یہاں پر موجود ہیں۔ آپ سردار جی کو بھی ساتھ لے لیجیے اور سب مل کر امن کمیٹی بنائیے اور کام شروع کر دیجیے۔ سرکار آپ کی ہر طرح سے مدد کرے گی ...."

"وہ تو ہم کریں گے ہی۔" بخشی جی نے پھر کہا۔ "مگر اس وقت حالت نازک ہے۔ اگر مار کاٹ شروع ہو گئی تو اسے سنبھالنا مشکل ہوگا۔ اگر ایک ہوائی جہاز ہی شہر کے اوپر سے اڑ جائے تو لوگوں کو کان ہو جائیں گے کہ سرکار باخبر ہے۔ فساد روکنے کے لیے یہ بھی کافی ہوگا۔"

رچرڈ نے ایک بار پھر سر ہلایا، مسکرایا اور کاغذ پر پنسل سے پھر کچھ لکھ دیا۔ "ہوائی جہازوں کا محکمہ بھی میرے ماتحت نہیں ہے۔" رچرڈ نے مسکرا کر کہا۔

"آپ کے ماتحت سب کچھ ہے صاحب، اگر آپ کچھ کرنا چاہیں۔"

'اتنا بھی چپ رہنا ٹھیک نہیں ہے' رچرڈ نے سوچا۔ 'یہ آدمی بڑھتا ہی جا رہا ہے۔'

"اصل میں آپ کا میرے پاس آنا ہی غلط تھا۔ آپ کو تو پنڈت نہرو یا ڈیفنس منسٹر سردار بلدیو سنگھ کے پاس جانا چاہیئے تھا۔ سرکار کی باگ ڈور تو اب ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔" یہ کہنے کے بعد وہ ہنس دیا۔

ڈپٹی کمشنر کا رُخ دیکھ کر باقی لوگ چُپ ہو گئے، لیکن بخشی جی پھر جوش سے بولے۔

"ہمیں خبر ملی ہے کہ ابھی گھنٹہ بھر پہلے آپ کے انگریز پولس افسر رابرٹ صاحب نے زبردستی ایک مسلمان خاندان کو ایک گھر سے نکالا ہے۔ اس بات سے اس علاقے میں کشیدگی بڑھ گئی ہے کیوں کہ وہ مسلمان ایک ہندو مالک مکان کا کرایہ دار تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ شہر کی حالت کو دیکھتے ہوئے اس قسم کی کارروائی کو ملتوی کیا جا سکتا تھا۔"

رچرڈ کو اس واقعہ کا علم تھا بلکہ پولس افسر نے کارروائی سے پہلے رچرڈ سے مشورہ بھی کیا تھا اور رچرڈ نے یہ کہہ دیا تھا کہ عدالت کے فیصلے پر عمل کرنا روزمرہ کی معمولی کارروائی ہے۔ اسے ملتوی کرنے کی کوئی تُک نہیں۔ لیکن اس نے وفد کے ممبروں پر یہ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ اس واقعہ کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ پنسل اٹھا کر کاغذ پر کچھ لکھنے کے بعد اس نے کہا "میں دریافت کروں گا۔" اور پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔

اس پر ہربرٹ، جو بڑی عمر کا امریکی پادری اور مقامی مشن کالج کا پرنسپل تھا، دھیمی آواز میں بولا "شہر کی حفاظت کا سوال سیاسی سوال نہیں ہے۔ یہ سیاسی جماعتوں کے اپنے اپنے مفاد سے اوپر اٹھ کر غور کیا جانے والا سوال ہے۔ شہر کے سب ہی لوگوں کا، سب ہی شہریوں کا سوال ہے۔ اس کی خاطر اپنی اپنی پارٹیوں کو بھول جانا ہوگا۔ اس معاملے میں سرکار کی ذمہ داری بھی بہت بڑی ہے۔ ہم سب کو مل کر شہر کی صورتِ حال کو سنبھال لینا چاہیئے۔ ہمیں اسی وقت شہر کا دورہ کرنا چاہیئے اور لوگوں کو سمجھانا چاہیئے۔ ان سے اپیل کرنی چاہیئے کہ وہ آپس میں نہ لڑیں۔"

رچرڈ نے فوراً اس تجویز کی تائید کرتے ہوئے اسے اور زیادہ ٹھوس الفاظ میں

پیش کیا۔" میری تجویز ہے کہ ایک بس لے لی جائے اور اس پر لاؤڈ اسپیکر لگا دیا جائے۔ آپ لوگ اس میں بیٹھ جائیں اور شہر بھر میں گھوم کر لوگوں تک اپنی آواز پہنچائیں۔"

رچرڈ کے منھ سے یہ بات نکلنے کی دیر تھی کہ باہر باغ کی طرف سے طرح طرح کی گھبراہٹ بھری آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"پُل کے پار ایک ہندو کو قتل کر دیا گیا ہے۔" باہر بیٹھے چپراسی سے کوئی کہہ رہا تھا۔

"سب ہی بازار بند ہو گئے ہیں۔"

خیر سگالی وفد کے ممبروں کے کان کھڑے ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر کا بنگلہ شہر سے بہت دور تھا۔ اگر سچ مچ فساد برپا ہو گیا ہے تو ان کے لیے اپنے اپنے گھر تک پہنچنا ناممکن ہو جائے گا۔ تب ہی دور، بنگلے کے پار کسی تانگے کے سرپٹ دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ سڑک پر کسی کے بھاگتے قدموں کی بھی آواز آئی۔

"لگتا ہے شہر میں گڑبڑ شروع ہو گئی ہے۔" لکشمی نارائن نے گھبرا کر کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"جو بھی ممکن ہوا، کیا جائے گا۔" رچرڈ نے کہا۔" گڑبڑ شروع ہو گئی ہے تو بری بات ہے۔"

ایک ایک کر کے سب ہی ممبر اٹھ کھڑے ہوئے اور چق اٹھا کر باہر آنے لگے۔ ڈپٹی کمشنر بھی دروازے تک ان کے ساتھ آیا۔

"آپ کو بھیجنے کا انتظام ہم کریں گے۔ پولس کے کچھ سپاہی آپ کے ساتھ جائیں گے۔" رچرڈ نے کہا اور میز پر رکھے ٹیلیفون کی طرف رخ کیا۔

"آپ ہماری فکر نہ کریں۔ ضروری یہ ہے کہ شہر میں گڑبڑ نہ ہو۔ بخشی جی نے باہر آتے ہوئے کہا۔" اب بھی وقت ہے، آپ کرفیو لگا دیں۔"

صاحب نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

بنگلے میں سے نکلتے ہی خیر سگالی وفد کے ممبروں کے دماغوں میں جیسے دھول اڑنے لگی۔ پھاٹک پار کرتے ہی انھوں نے ایک دوسرے سے بولنا بند کر دیا تھا۔ کچھ دور تک وہ

ایک ساتھ چلتے رہے۔ پھر اچانک لکشمی نرائن اور سردار جی ایک ساتھ سڑک پار کرنے لگے۔
لکشمی نارائن نے سر سے پگڑی اتار کر بغل میں دبالی اور تیز رفتار سے سڑک پار کرنے لگا۔
بنگلے کے باہر سڑک پر پہنچنے پر دائیں طرف کو ڈھلان پڑتی تھی جو سیدھی اس پُل تک چلی گئی تھی جو شہر کو چھاؤنی سے الگ کرتا تھا۔
ہربرٹ اپنی سائیکل پر آیا تھا۔ بوڑھا آدمی اب بھی سائیکل چلاتا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے سائیکل چلاتا ہوا ڈھلان اتر گیا۔ ایک بار اس کے دل میں آیا کہ پوچھے کہ اس کمیٹی کی میٹنگ کب ہو گی لیکن ان لوگوں کو گھبرایا ہوا دیکھ کر چپ ہو گیا۔ اگر فساد پھوٹ پڑا ہے تو میٹنگ اب کیا ہو گی۔
حیات بخش بھاگ نہیں رہا تھا صرف تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا اور بار بار پلٹ کر پیچھے دیکھ رہا تھا۔ پیچھے کی طرف گھوم گھوم کر تقریباً سب ہی لوگ دیکھ رہے تھے۔
"کوئی بات نہیں، آرام سے چلو، علاقہ مسلمانی ہے۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔
سڑک کے پار سردار جی تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے آگے نکل گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے تقریباً دس گز کے فاصلے سے لکشمی نارائن چلا آرہا تھا۔ جسم بھاری ہونے کی وجہ سے اس کے لیے تیز چلنا مشکل ہو گیا تھا اور وہ رومال سے بار بار اپنی گردن پونچھ رہا تھا۔
بخشی جی اور مہتا تھوڑی دیر تک گیٹ پر ٹھٹکے کھڑے رہے، پھر وہ بھی ڈھلان اترنے لگے۔
"آؤ، تانگہ کر لیں۔ پیدل پہنچنے میں دیر لگے گی۔" مہتا جی نے کہا۔ بخشی رک گیا۔ ایک تانگہ پیچھے سے آرہا تھا۔ مہتا نے گھوڑے کی ٹاپ سنی۔ وہ سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا اور ہاتھ ہلا ہلا کر اسے رک جانے کے لیے اشارہ کرنے لگا۔
"کہاں جانا ہے؟" سانولے رنگ کے کم عمر گاڑی بان نے گھوڑے کی لگام کھینچ کر کہا۔
"اڈے تک چلو۔"
"دو روپے ہوں گے۔"
کس بات کے دو روپے؟ مذاق ہے۔" بخشی جی نے پرانی عادت کے مطابق کہا۔ تانگے والا آگے بڑھنے کے لیے تیار ہوا۔

"بیٹھو۔ بیٹھو۔ بخشی جی۔ یہ جو مانگتا ہے دے دو۔ یہ سودا کرنے کا وقت نہیں ہے۔ چلو بیٹھو۔" اور مہتا جی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے "جلدی سے جلدی شہر پہنچو۔"

انھیں تانگے پر چڑھتے دیکھ کر لکشمی نارائن بھی مڑ کر ان ہی کی طرف جانے لگا۔ لیکن تانگہ چل پڑا تھا۔ لکشمی نارائن سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے دیکھتے ہی رہ گئے۔

"ہندو، ہندو کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے گا۔ پرانے زمانے سے یہی کچھ ہوتا رہا ہے، واہ رے ہندو۔"

لکشمی نارائن نے رنج کے ساتھ دل ہی دل میں کہا اور چھڑی ٹیکتا ہوا الٹے قدموں پٹری کی طرف واپس چلا گیا۔

اسی دوران، باقی تین آدمی ایک دوسرے سے الگ، ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر ڈھلان اتر رہے تھے۔ لکشمی نارائن سے کچھ آگے حکیم عبدالغنی تھے جو کانگرس کمیٹی کے ممبر اور پرانے کارکن تھے۔ ان کے آگے سردار جی تھے اور سب سے آگے حیات بخش۔ حیات بخش نے کوٹ اتار کر اپنے کندھے پر ڈال لیا تھا۔

تانگہ میں بیٹھتے ہی بخشی جی نے کہا، "کچھ اور لوگوں کو تانگہ میں بٹھا لو۔"

"کسی کو مت بٹھاؤ، بخشی جی۔ یہی، بائیں ہاتھ کی سڑک سے نکل چلو۔ وہ لوگ اپنا انتظام کر لیں گے۔" مہتا بولا۔ پھر دلیل پیش کرنے کی کوشش کرنے لگا "کس کس کو بٹھاؤ گے؟"

بخشی جی نے محسوس کیا کہ انھوں نے تانگہ میں بیٹھ کر غلطی کی ہے۔ انھیں مہتا پر اور خود اپنے اوپر غصّہ آنے لگا کہ وہ کیوں مہتا اور دوسرے لوگوں کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ یہاں اکٹھے آئے تھے، اکٹھے جانا چاہیئے تھا لیکن پھر بھی وہ بیٹھے رہے۔

تانگہ جب حیات بخش کے پاس سے گزرا تو حیات بخش ہنس کر بولا۔

"بھاگتے ہو، کراڑو! پہلے اشتعال پیدا کرتے ہو، پھر بھاگتے ہو!"

بخشی جی کے ساتھ اس کی بے تکلّفی تھی۔ اسی شہر میں دونوں بڑے ہوئے تھے۔ الگ الگ سیاسی عقائد کے باوجود وہ ایک دوسرے سے ہنس کر ملتے تھے، دونوں کا آپس میں بڑا مذاق چلتا تھا۔

پھر حیات بخش نے گھوم کر پیچھے دیکھا۔ اپنے پیچھے سردار جی کو آتے دیکھ کر بولا۔

"بخشی جی تو نکل گئے! امن کروانے چلے تھے! یہ تو خصلت ہے ان لوگوں کی۔"
لیکن سردار جی خاموش رہے۔ سرپنچا کیے چلتے رہے۔
سب پیچھے چلتے ہوئے لکشمی نارائن کا دل چاہا کہ آگے بڑھ کر جیسے تیسے حیات بخش کے ساتھ ہولیں۔ یہ علاقہ مسلمانی ہے اور مسلمان کے ساتھ چلتے ہوئے وہ بے خطر راستہ پار کر جائیں گے۔ حیات بخش کو سب ہی لوگ جانتے ہیں۔
"ٹھہرو جی۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" اس نے بلند آواز میں کہا۔
اس کی آواز سن کر تینوں آدمی اپنی اپنی جگہ رک گئے۔ لیکن لکشمی نارائن اپنی چھڑی سے کھٹ کھٹ کرتے سیدھے نکلے چلے گئے اور آخر کار حیات بخش تک جا پہنچے۔
"بہت بری بات ہوگی، اگر شہر میں گڑبڑ ہو گئی۔" اس نے کہا، اور حیات بخش کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ حیات بخش لکشمی نارائن کا مقصد سمجھ گیا اور اس میں حیات بخش کا بھی فائدہ تھا کیوں کہ پُل پار کرنے کے بعد تھوڑی دور جانے پر ہندوؤں کا محلّہ شروع ہو جاتا تھا اور حیات بخش کا گھر اس سے بھی آگے تھا۔ لکشمی نارائن ساتھ ہوگا تو ہندوؤں کا محلّہ وہ پار کرا دے گا۔ یوں تو حیات بخش بھی جانتا تھا کہ ڈر اور خطرے والی بات نہیں۔ سب ہی لوگ شہر کے جانے پہچانے بزرگ تھے۔ کوئی آسانی سے ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔
تانگہ میں بیٹھے بخشی جی بڑے رنج اور اضطراب کے عالم میں تھے۔ جب کبھی خطرہ یا مصیبت کا سامنا ہوتا تو وہ بڑبڑاتے، ساتھیوں سے غصّہ کے لہجے میں بات کرتے۔ ان کا دماغ کام کرنا بند کر دیتا تھا۔ جذبات کے بہاؤ کے سامنے سب ہی کچھ ڈھے جاتا تھا۔
"چیلیں اڑیں گی، مہتا جی! شہر پر چیلیں اڑیں گی۔" انھوں نے ایک بار پھر کہا، اور جھانک جھانک کر تانگہ سے باہر دیکھنے لگے۔
"اب تو جو ہوگا، دیکھا جائے گا، پہلے شہر تو پہنچو۔"
اس پر بخشی جی تنک کر بولے۔ "شہر پہنچ کر کیا ہو جائے گا۔ اب تو سر پر آ گئی۔"
مہتا گھبرایا ہوا ضرور تھا لیکن بخشی جی کی طرح بوکھلایا ہوا نہیں تھا۔
"ڈپٹی کمشنر نے بات تو سنی۔ پچھلا ڈپٹی کمشنر تو سیدھے منھ بات بھی نہیں

کرتا تھا۔

"یہ کیا کرے گا، کھوتی کا سر؟" بخشی جی چڑ کر بولے۔" اس نے ہماری کون سی بات سنی ہے۔"

پھر بخشی کا دماغ دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔

"کسی کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔" مہتا بولا۔

"مسلمان کا نہیں تو کیا ہندو کا کیا جا سکتا ہے؟" بخشی جی نے پھر تنک کر کہا۔

"دیکھو بخشی جی، بات چھوٹی سی ہے لیکن دانشمند کو اسی سے پتہ چل جاتا ہے۔ مبارک علی ضلع کانگرس کمیٹی کا ممبر ہے کھادی کا کرتا اور کھادی کی شلوار پہنتا ہے لیکن سر پر پشاوری ٹوپی پہنتا ہے۔ گاندھی ٹوپی نہیں پہنتا۔ مظفر کو چھوڑ کر کوئی بھی کانگرسی مسلمان گاندھی ٹوپی نہیں پہنتا۔"

بخشی نے جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھا اور پگڑی کو بغل کے نیچے سے نکال کر گود میں رکھ لیا۔

"ہندو سبھا والوں نے محلہ کمیٹیاں بنا لی ہیں، ہم سے تو وہ بھی نہیں ہو سکتا، محلے محلے میں امن کمیٹیاں ہی بنا لیتے۔" مہتا نے گردن پونچھتے ہوئے کہا۔

"ڈوب مرو، مہتا جی! چلو بھر پانی میں ڈوب مرو۔" بخشی جی نے بپھر کر کہا۔

"کیوں؟ ڈوب کیوں مروں؟ میں نے کیا کیا ہے؟"

"دو کشتیوں میں ٹانگیں رکھنا اچھا نہیں ہوتا۔ تم ہمیشہ یہی کرتے رہے ہو؟ ایک ٹانگ کانگرس میں، دوسری ہندو سبھا میں۔ تم سمجھتے ہو کسی کو معلوم نہیں، سب ہی کو معلوم ہے۔"

"اگر فساد ہو گیا تو تم مجھے بچانے آؤ گے؟ نالے کے پار کا سارا علاقہ مسلمانی ہے اور میرا گھر نالے کے سرے پر ہے۔ فساد ہو گیا تو تم مجھے بچاؤ گے یا بابو جی آکر بچائیں گے؟ اس وقت تو محلے میں ہندوؤں کا آسرا ہے۔ چھرا مارنے والا مجھ سے یہ نہیں پوچھے گا کہ تم کانگرس میں یا ہندو سبھا میں تھے؟ اب چپ کیوں ہو گئے؟"

"ڈوب مرو، مہتا جی، ڈوب مرو۔ یہی وقت ہوتا ہے جب آدمی کے عقائد کی آزمائش ہوتی ہے۔ تم نے بہت مایا اکٹھی کر لی ہے۔ تمھاری عقل پر چربی چڑھتی

جارہی ہے۔ تمھارا گھر مسلمانوں کے محلّے کے پاس ہے تو کیا میرا گھر ہندوؤں کے محلّے میں ہے؟"

"تمھارا کیا ہے، تم تو سادھو ہو، بیراگی ہو۔ تمھارے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ تمھیں کوئی مار کر کیا کرے گا؟" مہتا نے کہا۔ پھر وہ بھی ابل پڑا۔ "کہا تھا لطیف کو کانگرس کے دفتر سے نکالو۔ میں لکھ کر دے سکتا ہوں کہ وہ خفیہ پولس کا آدمی ہے اور ہم سب کی رپورٹ دیتا ہے۔ ڈائریاں لکھتا ہے۔ تمھیں بھی معلوم ہے اور مجھے بھی۔ پھر بھی تم آستین میں سانپ پال رہے ہو۔ مبارک علی لیگیوں کے ساتھ سانٹھ گانٹھ کررہا ہے۔ تم سے بھی پیسے لیتا ہے اور لیگ والوں سے بھی۔ پکّی اینٹوں کا مکان اس نے بنوا لیا ہے، لیکن تم لوگ تو اچّھے ہو۔ تم سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھتے۔"

"لے دے کے دو تین مسلمان تو ہمارے بیچ میں کام کرتے ہیں۔ انھیں بھی نکال دیں۔ تمھاری عقل تو ٹھکانے ہے یا نہیں۔ ایک لطیف برا ہے تو سب ہی برے ہو گئے؟ حکیم جی برے ہیں جو تم سے بھی پہلے سے کانگرس کے لیے کام کررہے ہیں۔ عزیز احمد برا ہے؟ ....."

تانگہ ڈھلان طے کرچکا تھا اور پُل کی طرف گھوم گیا تھا۔

دائیں طرف اسلامیہ اسکول بند پڑا تھا۔ سڑک پر آمد و رفت کم تھی۔ اسلامیہ اسکول کی عمارت کے باہر چار پانچ آدمی گانٹھ باندھے کھڑے تھے۔ کبھی کبھی کوئی تانگہ یا سائیکل سوار سڑک پر سے گزر جاتا۔

پیچھے، ابھی وہ چاروں آدمی ڈھلان سے اتر رہے تھے۔ بجلی دفتر کے سامنے حیات بخش کو مولا داد سڑک کے کنارے کھڑا مل گیا۔ داڑھی والا مولا داد بجلی کمپنی میں کلرک تھا اور مسلم لیگ کا بھی کارکن تھا۔

"کیا کر آئے ہو؟" اس نے حیات بخش سے پوچھا۔ "ڈپٹی کمشنر سے ملنے گئے تھے نا؟"

"مل آئے ہیں۔ وہاں پر، اس کے پاس بیٹھے ہی تھے کہ باہر شور ہوا۔ سب ہی نے سوچا، گڑبڑ ہو گئی ہے اور میٹنگ برخاست ہو گئی۔ سب ہی لوگ وہاں سے نکل آئے۔ شہر کی کیا خبر ہے؟"

"کشیدگی بڑھ رہی ہے۔ سنتے ہیں، رتّے کے پاس کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ ادھر پیچھے کیا حال ہے؟"

"پیچھے ٹھیک ہے۔"

اتنے میں حکیم عبدالغنی اور سردار بشن سنگھ بھی پہنچ گئے۔ کچھ فاصلہ الگ الگ طے کرنے کے بعد دونوں ایک ساتھ چلنے لگے تھے۔ حکیم جی کانگریسی مسلمان تھے اس لیے بشن سنگھ کو ان کے ساتھ ساتھ چلنے میں ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔

"فساد نہیں ہونا چاہیے۔" لکشمی نارائن بولا۔ "بہت بری بات ہے۔"

مولی داد نے بڑی تیکھی نظر سے لکشمی نارائن کی طرف دیکھا۔ "آپ لوگوں کا بس چلے تو آپ فساد کروا کے ہی چھوڑیں گے۔ ہم ہی لوگ برداشت کیے جا رہے ہیں۔" پھر اس کی نظر حکیم جی پر پڑی اور انھیں دیکھتے ہی مولی داد کا پارہ چڑھ گیا۔ "یہ ہندوؤں کا کتّا بھی آپ کے ساتھ گیا تھا؟ یہ کس کی نمائندگی کرنے گیا تھا؟"

تینوں خاموش ہو گئے۔ حکیم جی سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے منھ اونچا کیے ہوئے پُل کی سمت میں دیکھنے لگے۔ لیکن مولی داد حکیم جی کو دیکھتے ہی تلملا اٹھا تھا۔

"مسلمانوں کا دشمن ہندو نہیں ہے۔ مسلمانوں کا دشمن وہ مسلمان ہے جو دُم ہلاتا ہندوؤں کے پیچھے پیچھے چلتا ہے، ان کے ٹکڑوں پر پلتا ہے..."

دیکھیے، مولی داد صاحب۔" حکیم جی نے بڑے ٹھہراؤ کے ساتھ کہا۔ "آپ کا جو دل چاہے مجھے کہیے لیکن سب سے اہم سوال ہندوستان کی آزادی کا ہے، انگریز سے اقتدار چھیننے کا ہے، ہندو مسلمان کا نہیں۔"

"چپ رہ کتّے!" مولی داد چیخ کر بولا۔ اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"چھوڑو۔ چھوڑو۔ جانے دو، یہ وقت جھگڑا کرنے کا نہیں ہے۔"

ایک لمحہ کے لیے لکشمی نارائن کی ٹانگوں میں پانی بھر گیا۔ لیکن حیات بخش بزرگ آدمی تھا، اس نے حالات سنبھال لیے۔ "جائیے۔ جائیے۔ حکیم جی! اگر آپ کے سرپرست تو نکل گئے ہیں، تانگہ پر بیٹھ کر۔ آپ کو اکیلا چھوڑ گئے ہیں۔"

حکیم جی دھیرے دھیرے سرکنے لگے تھے۔ سردار جی بھی ان کے ساتھ جانے لگے۔ لکشمی نارائن

جیوں کا تیوں کھڑا رہا۔

"گھر جارہے ہو؟" مولیٰ داد نے حیات بخش سے کہا۔ "لیگ کے دفتر میں نہیں چلو گے؟"

"میں بعد میں پہنچ جاؤں گا۔ تم چلو۔"

مولیٰ داد سمجھ گیا کہ حیات بخش نے کیوں لکشمی نارائن کو اپنے ساتھ لے رکھا ہے۔ بڑے احترام کے ساتھ دل پر ہاتھ رکھ کر لکشمی نارائن سے بولا۔ "خاطر جمع رکھیے لالہ جی! ہمارے رہتے ہوئے کوئی بھی آپ کا بال بانکا نہیں کر سکتا۔"

حیات بخش اور لکشمی نارائن آگے بڑھ گئے۔

بارہ بجے کے قریب لیزا ٹہلتی ہوئی برآمدے میں کھلنے والے دروازے کی طرف آ گئی، پردے کو تھوڑا سا ہٹا کر باہر جھانک کر دیکھا۔ برآمدے کے باہر چلچلاتی دھوپ سارے باغ کو ڈھانکے ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا، جیسے کانچ چمک رہا ہے، یا زمین سے کوئی چیز کانپ کر نکل رہی ہے، ہوائیں تھرتھرا رہی ہے۔ ابھی سے دھوپ اتنی تیز ہو گئی تھی۔ اس نے پردہ آتش دان کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کی نظر ایک بُت پر پڑی جو آتش دان کے وسط میں رکھا تھا۔ بڑھی ہوئی توند والا کوئی ہندو دیوتا، جس کے ماتھے پر لال اور سفید لکیریں کھنچی ہوئی تھیں، بیٹھا ہنس رہا تھا۔ اسے دیکھ کر لیزا کو متلی آنے لگی۔ اسے یہ بُت بڑا گھناؤنا لگا۔ رچرڈ اسے کہاں سے اٹھا لایا ہے؟

وہ بڑے کمرے میں آ گئی۔ جگہ جگہ رکھے مجسمے اور بُتوں کو دیکھ کر اسے بیزاری کا احساس ہوا، جیسے وہاں مجسمے نہیں بلکہ مردہ بُدھوں کے سر رکھے ہوں، جنھیں تنہائی میں دیکھ کر اسے جھرجھری سے ہونے لگتی تھی۔ کتابوں اور مورتیوں سے بھرے اس گھر میں اسے گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ کمرے میں گھومتی تو ایسا لگتا جیسے بُدھ کی مورتیاں کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہوں۔ رچرڈ کے چلے جانے کے بعد جیسے ان سب چیزوں پر بے کیفی سی چھا جاتی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ اکیلی رہ جاتی تھی اور سارا دن اسے ان ہی مورتیوں اور کتابوں کے درمیان گزارنا پڑتا تھا۔ دن بھر وہ تنہائی میں ان ہی کو دیکھ دیکھ کر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چکر کاٹتی رہتی تھی۔ بُدھ کے مجسمے کے سامنے جا کھڑی

ہوئی۔ دل بہلانے کے لیے بجلی کا بٹن دبا دیا۔ سچ مچ بدھ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کھل اٹھی۔ بجلی بجھا دی، مسکراہٹ اوجھل ہو گئی۔ ایک بار پھر بٹن دبایا، مسکراہٹ پھر واپس آگئی۔ کبھی کبھی ایسا لگتا، جیسے مجسمہ اسے کنکھیوں سے گھورے جا رہا ہے۔ وہ فوراً بجلی بجھا دیتی۔

لیزا اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اندر پہنچتے ہی اسے ہلکی سی ٹن ٹن کی آواز سنائی دی۔ پلنگ کے عین پیچھے، کھڑکی کے سامنے کانسے کی بنی چھوٹی سی گھنٹی لٹک رہی تھی۔ جب کبھی ہوا کا جھونکا آتا، گھنٹی ٹن ٹن کرنے لگتی۔ بہت ہی دھیمی اور میٹھی سی ٹن ٹن کی آواز اس میں سے سنائی دیتی تھی، جیسے وہ آواز کہیں دور سے آرہی ہو۔ ہر وقت کمرے میں یہی میٹھی میٹھی ٹنٹناہٹ سنائی دیتی رہتی۔ گھر میں یہی چیز نئی تھی۔ لیزا کی واپسی سے پہلے ہی رچرڈ نے یہ گھنٹی کہیں سے لاکر اس کے کمرے میں ٹانگ دی تھی۔ لیزا کو تحفہ دینے کے لیے، اسے خوش کرنے کے لیے وہ اس گھنٹی کو کہیں سے لے آیا تھا۔

اسی وقت کھٹاک کی آواز سنائی دی۔ لیزا نے گھوم کر بائیں طرف دیکھا۔ اسے پہلے تو کچھ نظر نہیں آیا۔ پھر اس کی نگاہ ڈریسنگ ٹیبل پر گئی۔ وہاں ایک چھپکلی اوندھی پڑی اور زور زور سے ہل رہی تھی، جیسے تڑپ رہی ہو۔ لیزا سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ چھپکلی دیوار پر لگی بجلی کی بتی کے پاس سے گری تھی۔ جلدی ہی چھپکلی نے حرکت بند کر دی۔ لیزا سمجھ گئی کہ وہ مر گئی ہے۔ گرمی بڑھ رہی تھی اور آئے دن چھپکلیاں مر رہی تھیں۔ بے شمار کمروں والا یہ بنگلہ بہت پرانا تھا۔ جب انگریزی عملداری نے پنجاب میں قدم جمائے تھے تب ہی یہ بنگلہ تعمیر ہوا تھا۔

دو برس پہلے ایسے ہی ایک بنگلے میں نوکروں کے کوارٹروں میں سے ڈیڑھ گز لمبا سانپ نکلا تھا۔ وہ کبھی چارپائیوں کے نیچے گھس جاتا، کبھی لہراتا ہوا برآمدے کی دیوار کے ساتھ رینگنے لگتا۔ لیکن اس واقعہ کے بعد لیزا کے لیے اپنے کمرے میں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ ڈر کے مارے اس نے کئی دن تک الماری نہیں کھولی تھی، کہیں الماری میں کوئی زہریلا سانپ نہ بیٹھا ہو۔ اور وہ اسی حالت میں ولایت چلی گئی تھی۔

لیزا نے دروازے کے پاس لگی کال بیل کا بٹن دبایا اور خود کمرے میں سے باہر آگئی۔

جب لیزا ہندوستان واپس آئی تھی تو بہت سے منصوبے بنا کر آئی تھی۔ وہ ہندوستان کی دست کاری کے نمونے اکٹھے کرے گی، خوب سیر کرے گی، خوب گھومے گی، تصویریں

اتارے گی، شیر کی پیٹھ پر بیٹھ کر فوٹو کھنچوائے گی۔ ساڑی پہن کر گھوما کرے گی، اور جانے کیا کیا!
لیکن اسے ملی تھی چلچلاتی دھوپ، بڑے بنگلے کی قید، کبھی نہ ختم ہونے والا دن، گوتم بدھ کی مورتیاں اور چھپکلیاں اور سانپ۔

بنگلے کے باہر کی زندگی میں ویسی ہی یکسانیت تھی۔ کلب، انگریز افسروں کی بیویاں، کمشنر کی بیوی — کمشنر خود اتنی کمشنری نہیں کرتا تھا جتنی اس کی بیوی کرتی تھی۔ بریگیڈیئر کی بیوی کا سب ہی عورتوں کے ساتھ چھوٹے اور بڑے کی بنیاد پر میل ملاپ۔ اب سے پہلے بڑے افسروں کی بیویاں نہ زیادہ تھیں کیوں کہ اس زمانے میں رچرڈ ایک چھوٹا افسر تھا۔ سنیچر کی رات کو کلب میں ڈانس ہوتا، آئے دن پارٹیاں ہوتیں، لیکن لمبے دن پھر بھی کاٹے نہیں کٹتے تھے۔ اسی زمانے میں اسے بیئر پینے کی لت پڑ گئی تھی۔ کمروں میں آتے جاتے وہ اکتا جاتی اور پھر بیئر کا گلاس بھر لیتی اکتاہٹ سے بچنے کا اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔

"تمھاری رگوں میں ضرور جرمن خون ہوگا، جو تمھیں بیئر اتنی زیادہ پسند ہے۔"
رچرڈ مذاق میں کہتا لیکن لیزا کی یہ عادت بڑھتی ہی گئی۔ کبھی کبھی لنچ کے وقت رچرڈ گھر آتا تو لیزا کی آنکھیں چڑھی ہوتیں اور وہ الٹی صوفے پر پڑی ہوتی۔ بوس وکنار اور ہچکیوں کے درمیان وہ بار بار قسمیں کھاتی کہ اب زیادہ بیئر نہیں پیے گی لیکن اگلے دن پھر وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔

اب کی بار وہ زیادہ تندرست ہو کر آئی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ اب کی بار وہ نہ صرف رچرڈ کی دلچسپیوں میں شامل ہوگی بلکہ اس کے سرکاری کام میں بھی دلچسپی لے گی اور عوامی دلچسپیوں کے کاموں میں بھی حصّہ لے گی۔

جانوروں کی حفاظت کے لیے بنایا جانے والا ادارہ کیا کام کرے گا، اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ مجھے اس میں کیا کام کرنا ہوگا؟ ... لیزا کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ جب خانساماں آئے تو وہ اس سے بیئر لانے کے لیے کہے۔ خانساماں نیا تھا۔ اسے لیزا کی کمزوری کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ کیا وہ خود گلی گلی، سڑک سڑک گھوے گی، گھوڑوں اور آوارہ کتّوں کو ایک ایک کر کے مرواتی پھرے گی؟ یہ کیسا کام ہوگا؟ یا پھر وہ ضلع کی خاتون اوّل کے طور پر صرف صدر بنی رہے گی اور کام نچلے لوگ کریں گے۔

لیزا کے دل کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ ایک طرف اکتاہٹ کا ڈر اور دوسری طرف ضلع کی خاتونِ اوّل، ڈپٹی کمشنر کی بیوی ہونے کا فخر، درجنوں نوکر چاکر، اتنا بڑا بنگلہ، جو ایک طرف بھائیں بھائیں کرتا تھا تو دوسری طرف برتری کا احساس بھی دلاتا تھا۔

"میم صا۔ آ۔ ب۔"

خانساماں اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"ہمارے کمرہ میں ڈریسنگ ٹیبل پر چھپکلی مرا ہے۔ اسے اٹھاؤ، جاؤ۔" اس نے دبدبہ سے کہا۔

خانساماں نے سلام کیا۔ "حضور!" کہا اور چلا گیا۔

لیزا چلتی ہوئی پھر برآمدے میں کھڑکی کے پاس آ گئی۔ پردہ اٹھاتے ہی پھر تپتے کانچ جیسی چوندھیاتی دھوپ کا سامنا ہوا۔ لیکن ساتھ ہی برآمدے میں ایک طرف پڑی چھوٹی سی بنچ پر رچرڈ کے دفتر کا بابو بیٹھا نظر آیا، جو خط چھانٹ رہا تھا۔ سیاہ رنگت والا کم عمر بابو، جس کے سفید دانت بہت چمکتے تھے اور جو رچرڈ کی ہر ایک بات پر "یس سر، یس سر" دوبار کہتا تھا، اور دایئں بایئں سر ہلاتا تھا۔ اسے دیکھ کر لیزا مسکرا دی۔ بابو انگریزی جانتا تھا اور اس سے انگریزی میں باتیں سن کر لیزا کو بڑا مزہ آتا تھا۔

لیزا ڈائنگ روم کے راستے سے برآمدے میں آ گئی۔

"بابو۔" رچرڈ کی دیکھا دیکھی لیزا نے بھی اسے بابو ہی کہہ کر پکارا اور دروازے کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

بابو اپنی فائل سنبھالتا ہوا بھاگ کر لیزا کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ "یس سر! یس میڈم!" بابو کا چہرہ سانولا تھا اور دانت بے حد سفید تھے۔ اس کے جسم کا ہر عضو جیسے اس کے دھڑ کے ساتھ پیچوں سے جوڑا گیا تھا، کیوں کہ اس کا کوئی نہ کوئی عضو ہر وقت جھٹکا کھا کر ٹیڑھا ہو جاتا تھا، کبھی دایاں کندھا جھک جاتا تو کبھی بایاں گھٹنا جھک جاتا لیکن منھ ہر وقت کھلا رہتا اور سفید دانت ہمیشہ جھلملاتے رہتے۔

"یو ہنڈرڈ، بابو؟"

"یس میڈم!" بابو نے ذرا جھینپ کر کہا۔

لیزا اپنے اندازے کی درستی پر کھل اٹھی۔

"آئی گیسڈ رائٹ!"

"یس میڈم!"

لیزا اس کی طرف دیکھتی رہی۔ دیکھتے دیکھتے وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ اس نے کس بنیاد پر کہا تھا کہ وہ ہندو ہے۔ پوشاک میں اس نے پتلون، کوٹ اور ٹائی پہن رکھے تھے۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ کون سے نشان ہوتے ہیں جن سے ایک ہندو کو پہچانا جاتا ہے۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے سر کے بالوں میں کچھ ڈھونڈھتی رہی۔ بابو جھینپ گیا۔ تیس سالہ بابو گذشتہ دس سال سے دفتر میں اسٹینو کا کام کر رہا تھا۔ لیزا ہی پہلی ڈپٹی کمشنر کی بیوی تھی جو بے تکلفی سے اس کے ساتھ باتیں کرنے لگی تھی۔ دیگر ڈپٹی کمشنروں کی بیویاں اس کے ساتھ بڑی بے رخی اور حقارت سے پیش آیا کرتی تھیں۔

برآمدے کے سرے پر باورچی خانہ کی طرف جانے والے چھوٹے سے آنگن میں خانساماں، باغ کا مالی اور باورچی کھڑے تھے اور ان ہی کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔

"نو، اِٹ اِز نٹ ڈیئر۔" لیزا بولی۔ بابو کے جسم میں سر سے پیر تک جھرجھری ہوئی۔ جھینپ کی حالت میں اس کے مسکراتے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"یو آر نو ہندو، یُو ٹولڈ اے لائی!"

"نو میڈم! آئی ایم اے ہندو، اے برہمن ہندو۔"

"او، نو۔ دین وہیر اِز یور ٹُفٹ؟"

بابو ڈر رہا تھا۔ شہر میں فساد کا اندیشہ تھا، اور بڑی مشکل سے بچتا بچاتا دفتر پہنچا تھا، لیکن لیزا کی بات سن کر اسے تسلّی ہوئی۔ کالے چہرے میں اس کے سفید دانتوں کی لڑی چمک اٹھی۔

"آئی ہیو نو ٹُفٹ میڈم!"

دین یُو آر نو ہنڈو!"

لیزا نے اپنی پہلی (کلمے کی) انگلی اس کی طرف ہلاتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "یو ٹولڈ اے لائی!"

"نو میڈم۔ آئی ایم اے ہندو۔"

"ٹیک آف یور کوٹ، بابو!" لیزا نے کہا۔

" اوہ۔ میڈم "۔ بابو پھر جھینپ گیا۔

" ٹیک آف۔ ٹیک آف۔ ہری "۔

بابو نے مسکراتے ہوئے کوٹ اتار دیا۔

" ویری گڈ۔ ناؤ اَن بٹن یور شرٹ "۔

" واٹ میڈم؟ "

" ڈونٹ سے' واٹ میڈم۔ سے آئی بیگ یور پارڈن میڈم۔ آل رائٹ۔ اَن بٹن یور شرٹ "۔

بابو بے بسی کے انداز میں لیزا کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر اس نے نکٹائی کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک ایک کر کے تین بٹن کھول دیے۔

" شو می یور تھریڈ "۔

" واٹ میڈم؟ "

" یور تھریڈ' واٹ میڈم! شو می یور ہنڈو تھریڈ! "

بابو سمجھ گیا' میم صاحب 'یگیو پوِیت' کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ بابو کے پاس 'یگیو پویت' نہیں تھا۔ دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد کالج میں آنے پر اس نے چٹیا کٹوا دی تھی اور بارھویں جماعت میں داخل ہونے پر 'یگیو پوِیت' اتار پھینکا تھا۔

" آئی ہیو نو تھریڈ میڈم "۔ اس نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا تھا۔

" نو تھریڈ؟ دین یو آر نو ہنڈو! "

" آئی ایم اے ہنڈو "۔ آئی سوِیر بائی گاڈ۔ آئی ایم اے ہندو "۔ وہ پھر سے ڈرنے لگا تھا۔

" نو یو آر نو ہنڈو' یو ٹولڈ اے لائی۔ آئی شیل ٹیل یور باس اباؤٹ اٹ! "

بابو کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ قمیص کے بٹن بند کر کے کوٹ پہنتے ہوئے اس نے گھبرا کر کہا۔ " آئی ٹیل یو سِنسیرلی میڈم' آئی ایم اے ہندو۔ مائی نیم اِز روشن لال "۔

" روشن لال؟ بٹ دی گکس نیم اِز روشن ڈین۔ اینڈ ہی اِز اے مسلمان "۔

" یس میڈم! " بابو نے کہا۔ اس کے لیے سمجھانا مشکل ہو گیا تھا۔ " ہی اِز

روشن دین میڈم ! آئی ایم روشن لال۔ آئی ایم اے ہندو۔ ہی از اے مسلم۔"
"نو رچرڈ ٹولڈ می، یو پیپل ہیو ڈِفرنٹ نیمس۔"
پھر بابو کی طرف انگلی اٹھاکر بنا دئی غصّہ سے بولی۔" نو بابو، یو ٹولڈ اے لائی ! آئی شیل ٹیل یور باس۔"
بابو کا گلا سوکھ رہا تھا اور دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ شہر میں گڑبڑ کی وجہ سے ہی تو یہ پوچھ تاچھ نہیں ہو رہی ہے۔ میم صاحب چاہتی کیا ہیں ؟
اچانک لیزا اٹھی۔
"گو بابو! آئی شیل ٹیل ایوری تھنگ ٹو یور باس۔"
بابو نے برآمدے کے فرش سے اپنی فائل اٹھائی اور پیچھے کو مڑ گیا۔
ابھی وہ برآمدہ طے کر رہا تھا کہ لیزا نے پھر آواز لگائی۔
"بابو!"
بابو مڑا۔
"کم ہیئر۔"
بابو نزدیک آنے پر لیزا نے سنجیدہ کیفیت بنا کر پوچھا۔" ویئر از یور باس ؟"
"اِن دی آفس میڈم۔ ہی از ویری بزی میڈم۔"
"آل رائٹ۔ گو! یو اینڈ یور باس۔ گو! گیٹ آوٹ آف ہیئر۔" اس نے چلاّ کر کہا۔
"یس میڈم۔" اور بابو پھر کانپتا ہوا مڑ گیا۔
بابو کے چلے جانے کے بعد لیزا کو متلی سی ہونے لگی۔ اس کا شگفتہ مزاج بیزاری اور نفرت میں بدلنے لگا۔ بابو کو کندھے جھکائے جاتا دیکھ کر لیزا کو ایسا لگنے لگا جیسے کوئی لسلسا جانور چلا جا رہا ہو۔ نہ جانے رچرڈ کس طرح ان لوگوں کے ساتھ دن بھر کام کرتا ہے۔ ایک ہوک سی اس کے دل میں اٹھی اور وہ ان ہی قدموں بنگلے کے اندر جانے کے لیے مڑ گئی۔

8

شہر میں سب کام جیسے بٹے ہوئے تھے۔ کپڑے کی زیادہ تر دکانیں ہندوؤں کی تھیں، جوتوں کی مسلمانوں کی۔ موٹر لاریوں کا کام مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اور اناج کا کام ہندوؤں کے ہاتھ میں ـــــ چھوٹے چھوٹے کام ہندو بھی کرتے تھے اور مسلمان بھی۔

شوالے کا بازار کسی دلہن کے چہرے کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہاں روزانہ جیسی رونق تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہیں کوئی تناؤ پایا جاتا ہے۔ سناروں کی دکانوں پر دیہات سے آئی متعدد برقعہ پوش عورتیں چاندی کے زیور خریدنے، بنوانے کے لیے جگہ جگہ بیٹھی تھیں۔ حکیم لابھ رام کی دکان پر دوائیاں کوٹنے والے دو کشمیری مسلمان ناک منھ لپیٹے کھرل میں دوائیاں کوٹ رہے تھے۔ کبڑے حلوائی کی دکان پر تقریباً روزانہ کی جیسی بھیڑ تھی۔ خوانچے والا سنت رام آج بھی ٹھیک ایک بجے اپنی گاڑی دھیرے دھیرے چلاتا ہوا، صرافوں کا بازار طے کر کے شوالے کے بازار میں آ گیا تھا، اور روزانہ کی طرح خدا بخش اور اس کے دو بھائیوں کے لیے آدھی چھٹانک کے حلوے کے پتّے بنا کر بھیج رہا تھا۔

ماحول ساکن تھا۔ صبح کے واقعہ سے پیدا ہونے والا تناؤ کچھ دب گیا تھا، کچھ بکھر گیا تھا۔ سڑکوں پر چہل پہل تھی۔ خدا بخش کی دکان کے سامنے، گلی کے سرے پر، کمیٹی کا کارندہ سیڑھی لگا کر دیوار میں لگے لیمپ کی چمنی صاف کر رہا تھا اور لیمپ میں تیل ڈال رہا تھا۔ شہر کا کاروبار حسبِ معمول جیسے موسیقی کی دھنوں پر چل رہا ہو۔ جب ابراہیم عطر فروش کندھوں اور پیٹھ پر طرح طرح کی بوتلیں لٹکائے

ایک گلی سے دوسری گلی میں عطر پھلیل کی آواز لگاتا، اپنی یکساں چال سے گزرتا جاتا تو ایسا لگتا جیسے شہر کی اس دُھن پر اس کے پاؤں اٹھ رہے ہیں، اسی دُھن پر عورتیں اپنے گھڑے لے کر گھروں سے نکل کر گلی کے نل پر جاتیں۔ اسی دھن کی لے پر سڑکوں پر تانگے چلتے، اور اسی دُھن پر بچّے اسکول جاتے۔ ایسا لگتا جیسے شہر کا سارا کاروبار کسی شیریں اور ٹھیک دُھن پر چل رہا ہے۔ اگر ایک کڑی ٹوٹ جائے تو ساز کے سارے تار ٹوٹ جائیں گے یا پھر یوں کہیے کہ شہر کی یہ ہلچل مل کر ایک ایسی مسلسل موسیقی پیدا کرتی تھی جو شہر کے دل کی دھڑکن کے ساتھ ساتھ دھنیں سناتی تھی۔ شہر میں لوگ جوان ہوتے تو اسی لے پر۔ بوڑھے ہوتے ہیں تو اسی لے پر۔ اسی لے پر نسلیں اپنی زندگی گزارتی چلی جاتی ہیں۔ آپ اسے موسیقی کہہ لیجیے یا نازک سا توازن، جس میں افراد کے باہمی رشتے اور انسانی طبقوں اور فرقوں کے باہمی رشتے پیوست رہتے ہیں۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا کہ شہر کی زندگی میں لہریں نہیں اٹھتی تھیں۔ کانگرس کی کوئی تحریک چلتی تو زبردست لہریں اٹھتی تھیں۔ ہر سال گورو پُرب کے موقع پر جب سکّھوں کا جلوس نکلتا تو شہر میں تناؤ پیدا ہو جاتا۔ جامع مسجد کے سامنے سے جلوس باجا بجاتا ہوا نکلے گا یا نہیں، اس پر پتھراؤ ہو گا یا نہیں۔ مسلمانوں کے تعزیے نکلتے اور چھاتیاں پیٹتے "یا حسین" کے نعرے لگاتے، پسینے سے تر، مسلمانوں کی منڈلیاں نکلتیں تب بھی شہر میں تناؤ آجاتا۔ لیکن اس کے بعد بڑی جلدی تناؤ ڈھیلا بھی پڑ جاتا اور لوگوں کی زندگی پھر اسی لے پر چلنے لگتی۔ ماحول دوبارہ پُر سکون ہو جاتا اور لوگ پھر سے ہنس ہنس کر دن گزارنے لگتے۔

درزی خدا بخش کی دکان پر سردار حاکم سنگھ کی بیوی شکایت کر رہی تھی "بے بخشیا، توں کپڑے کی دیسیں مرسیں یا پھیرے ہی پوندا رہسیں؟"

(کبھی ہمارے کپڑے بھی سی کر دے گا، یا روز تیری دکان کے چکر ہی کاٹتی رہوں؟)

خدا بخش مسکرا دیا۔ شہر کی سب ہی ہندنیاں، سردارنیاں، خاص کر کھاتے پیتے گھروں کی عورتیں اسے "بخشا" ہی کہہ کر پکارتی تھیں۔ بخشے کی دکان پر شادی کے لیے سیے جانے والے کپڑوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا۔

"جدّ میں کہندا رہا، بی بی بھیجو کپڑے، بھیجو کپڑے، تُساں کچھ نہ کیتا۔ ساریاں سردیاں لنگھا دِتیاں۔ ہُن دُکت تاں لگدے۔ سولہ ہتھ تاں نہیں میرے۔"
(جب میں کہتا تھا، بی بی لاؤ کپڑے، لاؤ کپڑے، تو آپ نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ سارا جاڑا بیت گیا۔ اب تو وقت لگے گا ہی، میرے سولہ ہاتھ نہیں ہیں۔)

"کیوں جاڑا کیسے بیت گیا؟"

"کیوں بھلا، شوراَم کے بیٹے کے بیاہ سے پندرہ دن بعد آپ نے اپنی بیٹی کی سگائی کی تھی کہ نہیں؟ تب کون سا مہینہ چل رہا تھا؟"

حاکم سنگھ کی بیوی ہنسنے لگی۔

"ہاں بھئی! تو سب جانتا ہے۔ اب بول، بیٹی کا سوٹ کب دے گا؟"

"کارج کب ہے؟"

"واہ جی، بیٹی کی سگائی کا دن اسے یاد ہے۔ بیاہ کا دن نہیں معلوم۔"

"پچیس کو ہے نا۔ آج کون سی تاریخ ہے؟ پانچ تاریخ۔ دے دوں گا۔"

"دے دوں گا نہیں۔ بتا کب دے گا۔ بیاہ کارج والے دن تو چکر لگوائے گا۔ میں تجھے جانتی نہیں ہوں جیسے! وِدّیا کے بیاہ پر بھی تو نے ایسا ہی کیا تھا۔ اُدھر بارات آنے والی تھی، اِدھر زری کے سوٹ کے لیے میں بار بار آدمی بھیج رہی تھی۔ ٹھیک ٹھیک بتا۔ کب دے گا؟"

وہ ابھی یہ بات کر ہی رہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے بختی کی جھولی میں کپڑے کا ایک پُلندا پھینکا۔ ہرے رنگ کا ریشمی کپڑا، ساتھ میں تلّے کا بارڈر۔ "بختیا! کپڑے کو ناپ لینا، اور ضرورت ہو تو بدھا سنگھ کی دکان سے میرا نام لے کر لے لینا۔"

یہ ایک عورت تھی۔ بختے نے کپڑے کے ایک کونے پر لب لگا کر اسے بھگو دیا، پھر کان پیچھے ٹھونسی ہوئی پنسل نکال کر کپڑے کو آنک لیا اور بغل والی الماری میں ڈال دیا۔ یہ الماری بیاہ شادی کے لیے سلنے والے کپڑوں سے بھری پڑی تھی۔

"دے دوں گا، دے دوں گا۔ میں خود گھر پر پہنچا آؤں گا۔"

"تو باتیں بہت کرتا ہے۔ اب کی وقت پر کپڑے نہیں دیے تو پھر میں تیری دکان پر قدم نہیں رکھوں گی۔"

اور حاکم سنگھ کی بیوی دکان سے چلی گئی۔

عورت چلی گئی تو خدا بخش کی نظر شوالے کی دیوار پر پڑی۔ کوئی آدمی اس پر چڑھا ہوا تھا۔ خدا بخش نے دھیان سے دیکھا۔ گورکھا چوکیدار تھا۔ لیکن یہ وہاں کیا کر رہا ہے۔ دیوار کے پیچھے شہر کا پرانا مندر تھا، جس کا کلس دور دور سے چمکتا نظر آتا تھا۔ اسی مندر کی دیوار کے اوپر ایک گھڑیال لگا تھا۔ گورکھا چوکیدار اسی گھڑیال کو صاف کر رہا تھا۔

"دیکھو تو وہ کیا ہے؟" خدا بخش نے اپنے کارندے سے کہا، جو اس کے پاس ہی بیٹھا مشین پر کپڑا سی رہا تھا۔

"گھڑیال درست کیا جا رہا ہے۔" کارندے نے کہا۔

"یا اللہ!" خدا بخش کے منہ سے نکلا۔

"شہر میں فساد کا ڈر ہے...."

پھر دونوں چپ ہو گئے۔

1926ء کے فساد کے بعد یہ گھڑیال لگوایا گیا تھا۔ تب سے اب تک اس کی چمک بہت کچھ جاتی رہی تھی۔ دھوپ اور بارش کے سبب اس کے آس پاس کی دیوار پر سے بھی پلستر اکھڑ گیا تھا۔ گذشتہ فسادات کے زمانے میں خدا بخش بیس بائیس برس کا نوجوان تھا، تب اسے ڈنٹر پیلنے اور کسرت کرنے کا شوق تھا۔ ان دنوں وہ اپنے باپ کی درزی کی دکان پر بیٹھتا تھا۔ ان ہی دنوں یہ گھڑیال یہاں لگایا گیا تھا۔ اب خدا بخش ادھیڑ عمر کا ہو چلا تھا اور شہر میں شاید ہی کوئی ایسا بیاہ ہوتا ہوگا جس کے کپڑے سلنے کے لیے اس کے پاس نہ آتے ہوں۔ دیوار پر چڑھا ہوا گورکھا، رام بلی بھی وہی پرانا چوکیدار تھا، جس کے ہاتھوں گھڑیال لگایا گیا تھا۔ گذشتہ فسادات کے بعد اپنی مستعدی، جذبہ خدمت اور ایمانداری کی بدولت وہ ابھی یہاں کام کر رہا تھا۔ بیس برس کی مدت میں اس کا جسم گدرا گیا تھا۔ چہرے پر لکیریں پڑ گئی تھیں۔ کنپٹیوں کے بال سفید ہونے لگے تھے لیکن شوالے کی چوکیداری وہ اب بھی پہلے کی جیسی مستعدی سے کرتا تھا۔

گھڑیال کی ہلکی سی ٹن ٹن سنائی دی۔ خدا بخش کی نظر دیوار پر پڑ گئی۔ گورکھا گھڑیال کے ساتھ نئی رسّی باندھ رہا تھا۔ گھڑیال اسی وجہ سے ہل گیا تھا اور ٹن ٹن کی آواز آئی تھی۔ گورکھے نے گراریوں میں تیل لگا دیا تھا اور گھڑیال چمکا رہا تھا۔

"اس گھڑیال کی آواز سن کر روح کانپ جاتی ہے۔" خدا بخش نے کہا۔ "پہلے فساد میں جب یہ بجا تھا تو منڈی میں آگ لگی تھی اور شعلے آدھے آسمان کو ڈھانکے ہوئے تھے۔"

دیوار پر گورکھا ابھی تک گھڑیال کو صاف کیے جا رہا تھا جیسے کوئی تیوہار یا پرو آنے والا ہو، اور گھڑیال اس طرح چمکنے لگا تھا جیسے پیتل کا منجھا ہوا برتن چمکتا ہے۔ ساتھ میں نئی موٹی رسّی جھولنے لگی تھی۔

خدا بخش کی نظر گھڑیال سے ہٹ کر ساتھ والی سنار کی دکان پر گئی جہاں ادھیڑ عمر کا ایک آدمی اور اس کی بیوی، جو شاید کسی گاؤں سے آئے تھے، اپنی بیٹی سے کانٹوں کی جوڑی لینے پر اصرار کر رہے تھے۔

"تجھے پسند ہیں تو لے کیوں نہیں لیتی؟ جلدی کر۔ ہمیں اور بھی دوسرا بہت سارا سامان خریدنا ہے، گاؤں بھی لوٹنا ہے۔"

بیٹی کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ بار بار کانٹوں کو اپنے کان کے پاس لے جاتی اور شرما کر اپنی ماں کو دکھانے لگتی۔

"کیسے لگتے ہیں، ماں؟"

"شرماتی ہچکچاتی لڑکی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کانٹوں کی جوڑی اس پر پھبتی ہے یا نہیں۔ وہ انھیں خریدے یا نہیں۔

خدا بخش کی نظر ایک بار پھر مندر کی دیوار کی طرف اٹھی۔ اب وہ بوڑھا چوکیدار دیوار سے نیچے اتر رہا تھا، اور چمچماتے گھڑیال سے لگی رسّی دیوار پر جھول رہی تھی۔ خدا بخش کے منھ سے ایک بار پھر "یا اللہ" نکلا اور اس نے منھ پھیر لیا۔

ادھر فضل دین نان بائی کی دکان پر محفل جمی تھی۔ ڈھلتی دوپہر کے وقت کام ہلکا

ہو جانے پر آس پاس کے یار دوست باتیں کرنے آجاتے اور حقے کے دور میں، دنیا کی باتیں چلتیں۔

باتوں کا سلسلہ شروع تو اسی واقعہ سے ہوا تھا جو آج شہر میں بحث کا موضوع بنا ہوا تھا، مگر بات میں سے بات نکلتی گئی اور اس نکتے پر جا پہنچی جہاں بوڑھا کریم خاں کہنے لگا کہ حاکم کے دل کی تھاہ پانا عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتا۔ حاکم دور کی سوچتا ہے اور اس کے ہر فعل کے پیچھے دور اندیشی پائی جاتی ہے۔ جو کچھ وہ دیکھ سکتا ہے، اسے عام آدمی نہیں دیکھ سکتا۔

"حضرت موسیٰؑ نے ایک دن حضرت خضرؑ سے کہا۔" کریم خاں کہہ رہا تھا، "کہ تم مجھے اپنا شاگرد بنا لو۔ سن جیلانی، بڑا سبق آموز قصہ ہے۔"

"موسیٰؑ کم عمر تھے۔ ابھی وہ پیغمبر نہیں بنے تھے۔ خضرؑ تو پہلے ہی پیغمبر تھے، سب لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔" کریم خاں کہے جا رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہمیشہ مسکراتی رہتی تھیں اور جب وہ ہنستا تو اپنے گھٹنوں پر چپت مارتا۔ یہ دیکھ کر آس پاس بیٹھے سب ہی لوگ مسکرانے لگتے۔

"تو ایک دن موسیٰؑ نے خضرؑ سے کہا کہ تم مجھے اپنا شاگرد بنا لو۔ خضرؑ نے کہا 'اچھی بات ہے، بنا لیں گے مگر ایک شرط پر۔' 'وہ کیا؟' موسیٰؑ نے پوچھا۔ 'شرط یہ ہے کہ تم بولو گے نہیں۔ میں کچھ بھی کروں۔ تم اپنا منھ نہیں کھولو گے۔' موسیٰ نے کہا 'منظور ہے۔' تو خضرؑ نے انھیں اپنا شاگرد بنا لیا۔"

"اب خضر انھیں سکھانا چاہتے تھے، کیا سکھانا چاہتے تھے؟ یہی کہ دیکھتا تو خداوند عالم ہے، ہم انسان تو کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے۔ ہم تو اپنے دماغ گھس گھسا کر اسباب اور باعث، کھوجتے رہتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاتھ کچھ بھی نہیں لگتا۔ کیوں کہ دیکھتا تو خداوند کریم ہے۔ تو خضرؑ نے کہا کہ تم بولو گے نہیں، میں کچھ بھی کروں، کچھ بھی بولوں، تم اپنا منھ بند رکھو گے۔"

حقہ کریم خاں نے آگے سرکا دیا تھا۔ اب اس پر جیلانی پھونکیں مار رہا تھا۔ ڈھلتی دوپہر میں بھشتی دکان کے سامنے چھڑکاؤ کر گیا تھا اور مٹی کی سوندھی سوندھی بُو ہوا میں پھیلی ہوئی تھی۔ سڑک پر آمد و رفت کم ہو گئی تھی۔ کچھ لوگ جامع مسجد

میں عصر کی نماز ادا کرنے کے لیے جاتے ہوئے ایک ایک کرکے سامنے سے گزرتے نظر آئے۔

"تو کیا ہوا کہ دوسرے ہی دن خضرؑ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کی طرف جانے لگے۔ موسیٰ بھی ساتھ ساتھ تھے۔ بعد میں موسیٰ بہت بڑے پیغمبر بنے لیکن اس وقت تو وہ خضر کے شاگرد تھے۔ سن جیلانی، کان کھول کر سن۔ بڑا سبق آموز قصّہ ہے ـــــ تو دونوں چل پڑے۔ اب راستے میں ندی پڑتی تھی۔ اور کنارے پر ایک کشتی بندھی تھی جس میں بیٹھ کر لوگ ندی پار کرتے تھے۔ اب کیا ہوا کہ دونوں نیچے اترے اور کشتی میں بیٹھ گئے اور ملاح انھیں پار لے جانے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں موسیٰؑ نے دیکھا کہ خضر کشتی کے تلے میں چھید کر رہے ہیں۔ کشتی بالکل نئی تھی جیسے آج ہی بن کر آئی ہو، اور خضرؑ اس کے پیندے میں سوراخ کیے جا رہے ہیں۔ ایک چھید کر لینے کے بعد انھوں نے ایک اور چھید کر دیا۔ پھر ایک اور ـــــ اور موسیٰ چلّائے۔ 'واللہ آپ کیا کر رہے ہیں، کشتی ڈوب جائے گی، ہم دونوں ڈوب جائیں گے.....!'

"خضر نے انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھ کر انھیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ لیکن موسیٰؑ پریشان ہو رہے تھے کیوں کہ ناؤ میں پانی بھرنے لگا تھا اور وہ ڈر رہے تھے کہ ناؤ اب ڈوبی کہ اب ڈوبی۔ لیکن وہ خاموش ہو گئے، کیوں کہ خضر کو زبان دے چکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد خضر نے ایک ایک کرکے سب ہی چھید بند کر دیے۔ لیکن اتنی دیر میں کشتی کا پیندا بہت کچھ خراب ہو چکا تھا.... اب دونوں پار ہوئے۔ پار ہوئے تو ـــــ اللہ رحم کرے ـــــ دونوں چلے جا رہے تھے۔ کسی جگہ چھوٹا سا لڑکا زمین پر بیٹھا کھیل رہا تھا۔ بچّے کے پاس سے گزرے تو خضر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بچّے کو اٹھا کر اس کی گردن مروڑ دی۔

"یہ کیا؟ یہ کیا؟ موسیٰ چلّائے۔ معصوم بچّے کو مار ڈالا۔!' لیکن خضرؑ چُپ رہے۔ انھوں نے پھر انگلی ہونٹوں پر رکھ دی اور موسیٰ کو خاموش رہنے کا حکم دیا۔

"سبحان اللہ۔ بولوں نہیں۔ آپ نے ایک بے گناہ بچّے کی گردن مروڑ دی۔ نہ جان، نہ پہچان۔ اس گاؤں میں آپ نے پہلے کبھی قدم نہیں رکھا۔ اس معصوم بچّے سے بھلا آپ کی کون سی عداوت تھی؟ موسیٰ بہت پریشان تھے۔ اندر سے تو وہ پیغمبر ہی تھے۔!'

ابھی انھیں پیغمبری ملی نہیں تھی ۔" کریم خاں نے سر ہلا کر کہا۔" اب خدا رحم کرے، دونوں آگے جانے لگے۔ گاؤں پار کیا۔ اب جو گاؤں کی حد بندی پر پہنچے تو وہاں پر ایک ٹوٹی پھوٹی دیوار تھی۔ موسیٰ تو ایک ہی چھلانگ میں اسے پار کر گئے لیکن پیچھے مڑ کر دیکھا کہ خضر دیوار کے پاس کھڑے ہیں اور آس پاس گری اینٹیں اٹھا اٹھا کر دیوار کے پاس رکھ رہے ہیں، اور دیوار کی چُنائی کر رہے ہیں۔ موسیٰ پلٹ آئے۔" بزرگو! آپ نے اس بچّے کو موت کے گھاٹ اتار دیا جس نے زندگی نے دو دن بھی نہیں دیکھے تھے اور اس دیوار کو جو برسہا برس سے ٹوٹی پڑی ہے، پھر سے کھڑا کر رہے ہیں۔ یہ کیا ماجرا ہے۔ آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔"

" خضر نے پھر انگلی اٹھا کر موسیٰ کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ موسیٰ خاموش ہو گئے۔ وہ پھر آگے بڑھے، چلتے گئے چلتے گئے۔ ایک باغ میں پہنچے جہاں چشمہ بہہ رہا تھا اور سایہ دار پیڑ تھا۔ دونوں نے منھ ہاتھ دھوئے اور پیڑ کے نیچے بیٹھ گئے۔ اب خضر کہنے لگے۔" سنو برخوردار! وہ جگہ جہاں میں نے کشتی میں چھید کیا تھا اور تم بگڑ بیٹھے تھے، دراصل اس علاقہ کا حاکم بڑا ظالم ہے، وہ اپنی تفریح کی خاطر غریب ملاّحوں کی نئی کشتیاں چھین لیا کرتا ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اس کشتی میں چھید کر دوں تو حاکم کے آدمی اسے چھین کر نہیں لے جائیں گے۔ پُرانی سمجھ کر وہیں چھوڑ جائیں گے اور کشتی والے کا روزگار برقرار رہے گا۔ موسیٰ چُپ چاپ سنتے رہے پھر بولے۔ لیکن آپ نے بے گناہ بچّے کو کیوں مار ڈالا؟ " سنو۔ ابھی بتاتا ہوں۔ وہ بچہ حرام کا بچّہ تھا، حلال کا بچّہ نہیں تھا۔ جس آدمی کی اولاد ہے، وہ بڑا ظالم ہے ــــ ظالم اور ناپاک۔ میں نے اس بچّے کو اس لیے قتل کر دیا کہ وہ بھی بڑا ہو کر ظالم بنتا اور بے گناہ لوگوں پر ظلم ڈھاتا۔ اب کہو۔ میں نے اچھّا کیا یا برا؟"

موسیٰ گہری سوچ میں پڑ گئے، ان کا سر جھک گیا۔" مگر آپ نے ٹوٹی دیوار کی مرمّت کیوں کی؟ اس سے کسی کو کیا فائدہ؟"

" وہ بھی سنو،" خضر بولے۔" میں نے جس ٹوٹی پھوٹی دیوار کی مرمّت کی ہے، اس کے نیچے خزانہ دفن ہے۔ بہت بڑا خزانہ۔ مگر گاؤں والوں کو اس کا علم نہیں ہے۔ گاؤں والے بہت غریب اور ضرورت مند ہیں۔ میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے دیوار کو پکّا کر دیا ہے۔ جب وہ لوگ اپنے ہل چلاتے ہوئے یہاں پہنچیں گے تو یہ دیوار ان کے

راستے میں رکاوٹ ثابت ہوگی اور وہ ایک دن اسے توڑ دیں گے اور ایک ایک اینٹ اٹھا کر کھیتوں کے باہر پھینکیں گے۔ اس طرح انھیں دیوار کے نیچے دفن خزانہ مل جائے گا اور وہ مالا مال ہو جائیں گے۔ ان کے تن پر کپڑا ہوگا اور گھر میں روٹی ہوگی۔ اب بتاؤ، میں نے کیا برا کیا؟...''

کریم خاں نے یہ قصہ سنانے کے بعد سر ہلاتے ہوئے ایک ایک ساتھی کی طرف دیکھا، پھر بولا۔ ''تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جو بات حاکم دیکھ سکتا ہے، وہ عام لوگ ہم اور تم نہیں دیکھ سکتے۔ انگریز حاکم کی آنکھ چاروں طرف دیکھتی ہے، ورنہ کیا یہ ممکن تھا کہ مٹھی بھر فرنگی سات سمندر پار سے آکر اتنے بڑے ملک پر حکومت کریں؟ انگریز بہت دانش مند ہیں، دور اندیش ہیں...''

''بیشک بیشک!'' آس پاس بیٹھے لوگوں نے سر ہلائے۔

اسی دکان میں نتھو بھی ایک طرف بیٹھا تھا۔ قہوہ کی پیالی سامنے رکھے، ہاتھ میں لمبا سا رس کا ٹکڑا اٹھائے، ڈبو ڈبو کر کھا رہا تھا اور دھیان سے کریم خاں کا قصہ سن رہا تھا۔ قصہ سن کر اسے اطمینان ہوا۔ جب سے وہ اس سوٴر کے ڈربے میں سے نکلا تھا، وہ کبھی شہر کے ایک حصے میں تو کبھی دوسرے حصے میں چکر کاٹ رہا تھا۔ جہاں بیٹھتا وہاں لوگ سوٴر کا تذکرہ کرتے سنائی دیتے تھے۔ راہ چلتے لوگوں کی باتیں سن سن کر اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ کبھی کبھی ایسا لگتا جیسے لوگ کسی دوسرے ہی سوٴر کی بات کر رہے ہیں، وہ اس سوٴر کی بات نہیں کر رہے ہیں جسے اس نے مار ڈالا تھا۔ لیکن پھر کسی کسی وقت لوگوں کی باتیں سن کر اس کا دل بیٹھ جاتا۔ یہاں، اس نان بائی کی دکان پر بھی بات سوٴر سے شروع ہوئی تھی لیکن اس بزرگ کی باتوں سے نتھو کو اطمینان ہوا تھا۔ اگر جھگڑا فساد نہ ہو تو یہ بڑا معمولی سا واقعہ بن کر رہ جائے گا۔ سرکار کی آنکھیں اگر سب کچھ دیکھتی ہیں تو کوئی انہونی بات نہیں ہوگی۔

نتھو نے ایک بار پھر اپنی جیب چھو کر دیکھی۔ نوٹ چرمرایا۔ اسے تسلّی ہوئی۔ بھلا ہو مراد علی کا، جو پہلے ہی ساری کی ساری رقم دے گیا تھا۔ ورنہ اگر صرف اٹھنّی ہاتھ پر رکھ کر باقی پیسے بعد میں دے دوں گا تو نتھو چمار اس کا کیا بگاڑ لیتا۔ مراد علی زبان کا پکّا نکلا تو نتھو کو بھی زبان کا پکّا ہونا چاہیے تھا لیکن وہ ڈربے میں سے بھاگ آیا تھا، جبکہ

مراد علی سے اس نے قسم کھا کر کہا تھا کہ وہ اسی جگہ پر اس کا انتظار کرے گا۔ اس کوٹھری میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا لیکن شہر میں پہنچنے کی دیر تھی کہ اس کا خون سرد پڑ گیا۔ جگہ جگہ سؤر کا ذکر ہو رہا تھا۔

وہ اندر ہی اندر بڑا پریشان تھا۔ طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں چکر کھا رہے تھے۔ گھبراہٹ جتنی بڑھتی جاتی' خیالات میں اتنا ہی انتشار پیدا ہوتا جاتا' بات کرے تو کس سے' اور پوچھے تو کیا؟ اس کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا تھا' مراد علی نے سلوتری (مویشیوں کے ڈاکٹر) کا نام لے کر سؤر مروایا تھا اور مسجد کے سامنے ڈلوا دیا تھا۔ لیکن کیا معلوم' وہ کوئی دوسرا سؤر ہو۔ اس نے مسجد والے سؤر کو دیکھا تو نہیں تھا۔ اس کا دل بے چین ہو جاتا۔ اگر یہ وہی سؤر ہے تو کیا ہوگا؟ اگر لوگوں کو پتہ چل گیا کہ اسی نے سؤر کو مارا ہے تو کیا ہوگا؟ اسی بے چینی میں کبھی تو اس کا دل چاہتا کہ بھاگ کر گھر چلا جائے اور اندر سے کنڈی چڑھا کر پڑا رہے۔ کبھی اس کا دل چاہتا کہ گلیوں میں بھٹکتا' گھومتا پھرے۔ کبھی کچھ' کبھی کچھ۔ میں گھر میں نہیں جاؤں گا۔ میں گھر نہیں جاؤں گا رات پڑتے ہی موتیا رنڈی کے پاس جاؤں گا۔ وہ ایک روپیہ مانگے گی تو میں پانچ روپیہ دے دوں گا۔ رات بھر اس کے پاس رہوں گا۔

لیکن سڑکوں کی خاک' دن بھر چھانتے رہنے کے بعد اسے اپنی بیوی کی یاد ستانے لگی۔ اس وقت وہ گھر پر ہوتا تو اپنے ساتھی چماروں کے ساتھ بیٹھ کر چلم پیتا' دو باتیں کرتا۔ نہیں' میں اپنے ڈیرے پر جاؤں گا' نہاؤں گا' کرتا بدلوں گا۔ گھر والی کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کروں گا۔ جاتے ہی اسے باہوں میں بھرلوں گا۔ مراد علی کا نام لینے کی ضرورت نہیں' اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ اس سارے گھناؤنے قصے کو سنانے کی ضرورت نہیں۔ اس کی چھاتی پر سر رکھوں گا تو چین ملے گا۔ رنڈی کے پاس جاؤں گا تو لڑ کر بولے گی' برا بھلا کہے گی۔ گھر والی خاموش رہنے والی عورت ہے۔ ڈھارس بندھانے والی' سکھ پہنچانے والی۔ نتھو نے دل میں کہا' دو روپے موتیا رنڈی کو دینے کی بجائے گھر والی کے لیے کچھ لے لوں گا' وہ خوش ہو جائے گی' کہے گی تم کیا لائے' میرے پاس سب کچھ ہے۔ وہ کبھی کچھ نہیں مانگتی۔ اسے محسوس ہوا' جیسے دور بیٹھے ہوئے بھی وہ اسے اپنی باہوں میں لیے ہوئے ہے اور اس کی ساری کلفت دور ہوتی جا رہی ہے۔ دکھ سے

چھٹکارا پانے کے لیے آدمی سب سے پہلے عورت کی طرف مڑتا ہے۔ عورت کو بانہوں میں لینے پر اس کی سب تکلیفیں دور ہو جائیں گی، اسے ہمیشہ اس بات کا یقین رہتا ہے۔ وہ بڑے صبر والی عورت ہے۔ اس کے سینے میں پیار بھرا ہے۔

قہوہ خانہ دھوئیں سے اٹا پڑا تھا۔ دکان کے باہر دو بنچیں رکھی تھیں جن پر بوجھ ڈھونے والے مزدور بیٹھے ٹین کی پلیٹوں میں کھانا کھا رہے تھے۔ دال کی طشتری سامنے رکھے، بنچ کے آر پار ٹانگیں لٹکائے، نان توڑ رہے تھے۔ سڑک پر بھشتی پھر سے چھڑکاؤ کر رہا تھا۔

اسی وقت دور سے ڈھول بجنے کی آواز آئی۔ باہر بیٹھے مزدوروں نے پیچھے مڑ کر سڑک کی طرف دیکھا۔ ڈھول بجنے کی آواز تھی اور برابر نزدیک آتی جا رہی تھی۔ قہوہ خانہ کے اندر بیٹھے لوگ چپ ہو گئے۔

"کیا ہے؟" کسی نے پوچھا۔

"منادی ہے۔" کسی نے جواب دیا۔ "ادھر ہی آ رہا ہے۔"

اتنے میں ایک تانگہ، جس پر کانگرس کا جھنڈا لہرا رہا تھا، اور اندر بیٹھا کوئی آدمی ڈھول پیٹ رہا تھا، لگ بھگ نائی کی دکان کے سامنے آ کر رک گیا۔ اگلی سیٹ پر سے ایک آدمی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تب ہی ڈھول پٹنا بند ہو گیا اور وہ آدمی اٹھ کر منادی کرنے لگا۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

"صاحبان!

آج شام کے چھ بجے گنج منڈی میں ضلع کانگرس کمیٹی کی طرف سے ایک عام جلسہ ہوگا جس میں ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں انگریزی سرکار کی طرف سے پھوٹ ڈالنے کی کوشش کا پردہ فاش کیا جائے گا اور سارے شہر کے عوام سے اپیل کی جائے گی کہ امن کو برقرار رکھیں۔ بھاری تعداد میں شامل ہو کر جلسے کی رونق بڑھائیں۔"

تانگے کی پچھلی سیٹ پر جرنیل ڈھول تھامے بیٹھا تھا۔ منادی کرنے والا شنکر تھا، جو منادی ختم کر لینے کے بعد اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ ڈھول پھر بجنے لگا اور لہراتے جھنڈے کے ساتھ تانگہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

تانگہ جب دور نکل گیا تو ایک مزدور دوسرے سے بولا۔ "گنج منڈی توں اک

بابو نی پنڈ چکی آرہا سی' جے بابو کہن لگا۔ ' آزادی آون والی ہے' میں ہنس کے کہا۔
آدے آزادی بابو جی' ساڈے کے' اساں ہُن وی پنڈ چکنی ایں' پچھوں وی پنڈ
چکاں گے۔" یہ کہہ کر مزدور قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور اس کے لال لال مسوڑھے چمک اٹھے۔
(بابو نے کہا' آزادی آنے والی ہے۔ میں نے کہا' آئے آزادی لیکن ہمیں کیا؟
ہم تو پہلے بھی بوجھ ڈھوتے ہیں۔ آزادی کے بعد بھی بوجھ ڈھوئیں گے۔)
" اساں ہُن وی پنڈ چکنی تے۔ پچھوں وی پنڈ چکنی!" اور پھر وہ ہنسنے لگا۔
تب ہی قہوہ خانہ کے اندر بیٹھا ایک ادھیڑ عمر کا' داڑھی والا آدمی بولا۔" وہ آدمی
پکڑا گیا ہے یا نہیں جس نے مسجد کی توہین کی تھی؟ خنزیر کا بچّہ! اس کے ہاتھ پاؤں میں کیڑے پڑیں۔"
"بہت برا ہوا ہے۔" کوئی بدبدایا۔
نتھو نے سنا اور سر سے پاؤں تک لرز اٹھا۔
پھر کوئی اور آدمی بولا۔" سنا ہے کوئی گائے بھی ماری گئی ہے۔ گندے نالے کے پاس
کوئی مار کر پھینک گیا ہے۔"
" یہ بھی برا ہوا ہے۔"
اس پر چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا ہنس مکھ بزرگ کریم خاں وعظ کہنے لگا۔
" قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ انسان کی کھیتیاں میرے حکم سے کھڑی ہیں' انسان
کے سب ادارے میرے حکم سے کھڑے ہیں۔ میرا حکم نہیں ہوگا تو لہلہاتی کھیتیاں جھلس
جائیں گی۔ میرے حکم سے باڑھ آئے گی۔ شہر کے شہر تباہ ہو جائیں گے۔" اور پھر بوڑھے
نے کہا۔" سب ہی کچھ مالک کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں۔
سارے کام پاک پروردگار کے حکم سے ہوتے ہیں۔ اس کا جو حکم ہوگا' وہی ہوگا۔"
آس پاس بیٹھے لوگوں نے سر ہلائے۔ حقّے کا دور برابر چلتا رہا۔ باہر ایک مزدور اونچی
آواز میں گانے لگا۔

"ادئے اڑی اڑی کیہا تکنے
باہر سِتھنے نے چوڑیاں"

(کیوں' تم جھک جھک کر میری شلوار کی چُنّٹوں کو کیوں گھورے جا رہے ہو؟)
یہ وہی مزدور تھا جو ذرا دیر پہلے کھی کھی کر کے بابو کے ساتھ ہوئی اپنی بات

جیت کو دہرا رہا تھا۔ اس کے ہمنوڑ اور بے پروا مزاج کو دیکھ کر نتھو کو رشک ہوا۔
اسی وقت سڑک پر ایک بار پھر ہلچل ہوئی۔ چلتے چلتے لوگ کھڑے ہونے لگے اور سب کی نظریں دائیں طرف مڑ گئیں، جس طرف جامع مسجد تھی۔
"پیر صاحب تشریف لائے ہیں! گولڈا شریف کے پیر آئے ہیں۔" ـــــــ سڑک پر کھڑے کسی آدمی نے نان بائی سے کہا اور دل پر ہاتھ رکھ کر پیر صاحب کا انتظار کرنے لگا۔
نان بائی بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ قہوہ خانہ کے اندر بیٹھے سب ہی لوگ باہر آ گئے اور سڑک پر جیسے پلکیں بچھائے پیر صاحب کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔
ایک قد آور، داڑھی والا آدمی نمودار ہوا۔ لمبا کالا کرتا، گلے میں بڑے بڑے موتیوں والے تین چار ہار، پگڑی کے پیچھے گردن پر گرتے ہوئے لمبے بال، ہاتھ میں تسبیح، چوڑے گورے چہرے سے نور برس رہا تھا۔ دائیں بائیں اور پیچھے بہت سے مُرید چلے آ رہے تھے۔
نان بائی بڑھ کر آگے گیا اور سر جھکا کر، زانو پر ہاتھ رکھ کر سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا ہو گیا۔ پیر صاحب نے اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ نان بائی نے اسے جھک کر آنکھوں سے چوما، پھر اپنا دایاں ہاتھ دل پر رکھے رکھے، پہلے کی طرح آگے کی طرف ہاتھ باندھے جھکا جھکا کھڑا ہو گیا۔ پیر صاحب نے ہاتھ ذرا اوپر اٹھایا اور بغیر کچھ بولے آگے بڑھ گئے۔ سڑک پر کھڑے تقریباً سب ہی آدمی باری باری ان کے پاس گئے۔ سب ہی نے اپنی آنکھوں سے پیر صاحب کے ہاتھ چومے۔ سب ہی کو پیر صاحب نے دعا دی۔
"بہت پہنچے ہوئے پیر ہیں۔" نان بائی نے اپنی جگہ پر واپس آتے ہوئے کہا۔ "واللہ! چہرے پر کتنا جلال ہے۔ پیشانی سے نور برستا ہے۔"
دیگر لوگ بھی واپس آ گئے تھے۔ کچھ لوگ وہیں سے اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے گئے۔ قہوہ خانہ میں اب پیر صاحب کا ہی تذکرہ تھا۔
"بہت پہنچے ہوئے ہیں، دل کی بات جان لیتے ہیں۔" نان بائی کہے جا رہا تھا۔ پھر وہ تختے پر بیٹھ گیا اور اندر کی طرف منھ کر کے بولا۔ "میں ایک بار زیارت کرنے گولڈا شریف گیا۔ پیر صاحب کے حضور میں پہنچا تو مجھے دیکھ کر کہنے لگے، کچھ دانے اٹھا لے۔ دیکھتا کیا ہے؟، سامنے گیہوں کے دانوں کا ڈھیر تھا۔ میں نے یوں ہی مٹھی میں کچھ دانے

اٹھالیے۔ یہ دیکھ کر پیر صاحب نے فرمایا" بس! صرف ایک سو ستر دانے؟ کچھ زیادہ اٹھالیتا!
"میں ہکّا بکّا، وہیں بیٹھ کر دانے گننے لگا۔ پورے ایک سو ستّر دانے تھے۔
اس پر کریم خاں بولا" ان کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے۔ میرا پوتا ہے، اب تو بڑا ہو گیا ہے۔ جب چھوٹا سا بچّہ تھا تو اسے 'کن پیڑے' ہو گئے تھے۔ دونوں گال سوج گئے۔ کسی نے کہا۔ گولڑا شریف لے جاؤ۔ پیر صاحب نے اشارہ کیا، بچّے کو میرے پاس لٹا دو۔ میں نے لٹا دیا۔ پھر انھوں نے پاس رکھا ہوا بڑا سا چھُرا اٹھایا اور اسے ایک ایک بار بچّے کے دونوں گالوں کو چھوا دیا۔ پھر ہاتھ کے پنجے پر اپنے منھ سے لب لیا اور بچّے کے دونوں گالوں پر لگا دیا۔ بس اتنا ہی۔ میں پیر صاحب کی قدم بوسی کر کے بچّے کو اٹھا کر گھر لے آیا۔ گھر پہنچتے پہنچتے سُوجَن اتر چکی تھی اور بخار جا چکا تھا۔"
پیروں، دستگیروں کے ہاتھ میں بڑی شفا ہوتی ہے۔ اِدھر میسارڑی کے پاس بابا روڈا بیٹھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں بھی بڑی شفا ہے۔"
"لیکن پیر صاحب کافروں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ کافروں سے نفرت کرتے ہیں پہلے تو پیر صاحب کے پاس ہر شخص جا سکتا تھا۔ اگر کوئی کافر علاج کے لیے آتا تو چھڑی کی نوک اس کی نبض پر رکھتے تھے، چھڑی کا دوسرا سرا کان پر لگاتے تھے اور نبض سن لیتے تھے۔ لیکن اب وہ کسی کافر کو نزدیک نہیں آنے دیتے۔"
"اکثر گرمی کے موسم میں شہر نہیں آتے۔ اب کی بار ہی آئے ہیں۔"
"پیروں کے لیے گرمی سردی کیا!"
"ممکن ہے، ان تک خبر پہنچی ہو۔ وہ جو مسجد کو ناپاک کیا گیا ہے۔"
"انھیں ہر بات کی خبر رہتی ہے۔ انھیں کوئی بتانے تھوڑا ہی گیا ہو گا۔ انھیں اپنے آپ ہی پتہ چل جاتا ہے۔ اپنے آپ علم ہو گیا ہو گا، اور پہنچ گئے ہوں گے۔"
"ان کی نظر چاہیے۔ پیر فقیر کی بد دعا لگ جائے تو شہر کے شہر تباہ ہو جاتے ہیں۔"
"بجا ہے۔"
"وعظ فرمائیں گے؟"
"کیا معلوم۔ جمعہ تک رہے تو ضرور فرمائیں گے۔"
"جو آئے ہیں تو جمعہ تک تو ٹھہریں گے ہی۔ وعظ تو کہیں گے ہی۔ جو آئے ہیں تو شہر کو

تو پاک کر کے ہی جائیں گے۔"

ننھو وہاں سے نکلا تو دوپہر ڈھلنے لگی تھی۔ اس کا دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ ایک طرح کی ڈھک ڈھکی جو صبح سے اس کو پریشان کرتی رہی تھی، ایک انجانا سا خوف جو اس کے دل کو کریدتا رہا تھا، اب بہت کچھ دور ہو گیا تھا۔ شہر بھر میں رونق تھی۔ چہل پہل تھی۔ لوگ سؤر پھینکنے والے کی بات تو کرتے تھے مگر اسے 'سر پھرا'، یا 'پاگل'، کہہ کر۔ ایک دو گالیاں دیتے اور پھر اس واقعے کو بھول بھی جاتے تھے۔ پھر وہ ہی کیوں اتنی سی بات کو اپنی چھاتی کا بوجھ بنا تا پھرے؟ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس کے بارے میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو پائی۔ سب ہی لوگ اس واقعے کو کسی جنونی کا پاگل پن یا کسی "کراڑ" کی شرارت کہہ رہے ہیں۔ مراد علی ہی اس کے بارے میں جانتا ہے! تو کیا وہ کسی سے کہے گا کہ مسلمان ہوتے ہوئے اس نے یہ برا کام کروایا ہے؟

ننھو کو آس پاس کی چیزیں اچھی لگیں۔ ایک چھوٹی سی دکان کے سامنے ایک دیہاتی آدمی اپنی بیوی سے نئے جوتوں کی جوڑی لینے پر اصرار کر رہا تھا۔" لے لو نا جی۔ میں جو کہہ رہا ہوں۔ تمھارے پاس ایک بھی جوڑی نہیں ہے۔ وہ جوتی پھٹ چکی ہے۔"

اور پاس بیٹھی، سر سے پیر تک برقع سے ڈھکی اس کی بیوی اپنی میٹھی آواز میں انکار کیے جا رہی تھی۔" مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میرا کام چل رہا ہے۔ تمھارے پاس اچھا جوتا نہیں ہے۔ تم لے لو، ایک اچھا سا جوڑا۔ تمھیں زیادہ چلنا پڑتا ہے۔"

ننھو آگے بڑھ گیا۔ اسے راحت کا احساس ہوا۔ وہ سڑک پار کر کے دائیں طرف آگیا، اور دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ نان بائیوں کی دکانوں کی ایک اور قطار آگئی تھی۔ بڑے دیگچوں اور دیگوں میں سے اٹھتی گوشت اور مسالوں کی بو، اور نانوں کے ڈھیر کے ڈھیر۔ دکانیں کھچا کھچ بھری تھیں۔ زیادہ تر لوگ، مزدور، بوجھ ڈھونے والے یا آس پاس کے دیہات سے آنے والے خاندان تھے۔ دن بھر کے کام یا خرید و فروخت کے بعد کھانے پر ٹوٹ رہے تھے۔ یہ بازار شہر کے ایک سرے پر تھا۔ کھانا کھانے بعد کسان لوگ اپنی اپنی بیل گاڑیوں پر بیٹھ کر شہر کے باہر ان لمبی راہوں پر نکل جائیں گے جو انھیں ان کے گاؤں کو لے جاتی ہیں۔

نان بائیوں کی دکانوں کے پیچھے اسے جامع مسجد کی اونچی شاندار عمارت دکھائی دی۔ ڈھلتی دوپہر میں مسجد اور بھی زیادہ دُھلی دُھلی اور صاف لگ رہی تھی۔ وہی روز کا سا

نظارہ تھا۔ سیڑھیوں پر بھکاری، لیٹنے، سستانے والے مزدور، آنے جانے والے لوگوں کا تانتا۔ اچانک اس نے دیکھا، بڑے محرابی دروازے میں سے سینکڑوں لوگ ایک ساتھ نکل آئے ہیں۔ لوگوں کا ہجوم جوق در جوق باہر آرہا ہے۔ وہ پھاٹک سے نکل کر آتے ہیں، سیڑھیوں کے سرے پر اپنا اپنا جوتا پہنتے یا ہاتھ میں لیے سیڑھیاں اترنے لگتے ہیں ننھو دیکھتا رہ گیا۔ صرف عید کے روز اتنے بہت سے لوگ مسجد میں سے نکلتے نظر آیا کرتے تھے۔ تو کیا آج کوئی وعظ تھا؟ اسے اچانک خیال آیا، کیا گولڑا شریف کے پیر صاحب تو وعظ کہنے نہیں آئے تھے؟ کیا وعظ سننے کے بعد ہی تو لوگ واپس نہیں آرہے تھے؟ اس کا دل پھر دھک سے رہ گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے مسجد میں یہ سینکڑوں لوگ اسی کے گناہ کا تذکرہ کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ گولڑا کے پیر صاحب بھی اسی کی خبر پاکر شہر میں آئے ہوں گے۔

ننھو جامع مسجد کے سامنے سے گزرا۔ جس جگہ مسجد کی دیوار ختم ہوئی تھی وہاں بغل میں ایک گندا نالا بہتا تھا۔ شہر بھر کا گندا پانی اکٹھا ہوکر اسی نالے کے راستے سے شہر کے باہر جاتا تھا۔ ننھو نالے کے کنارے لگے جنگلے کا ڈنڈا پکڑ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی نظر نیچے کی طرف گئی تو اس نے دیکھا جنگلے سے ذرا نیچے، نالے کے کنارے ایک چبوترا سا تھا اور اس پر ایک آدمی ننگ دھڑنگ لیٹا ہوا تھا۔ سیاہ رنگ کا آدمی، داڑھی اور سر پر سوکھے کھچڑی بال الجھے ہوئے۔ گلے میں تعویذ۔ نالے کی دیوار کے ساتھ اپنا ٹین کا ڈبا لٹکا کر لیٹ گیا تھا۔ چبوترا تنگ سا تھا۔ سونے کی حالت میں کروٹ بدلنے پر وہ سیدھا نالے میں گر سکتا تھا۔ یہ بھی شاید کوئی پہنچا ہوا فقیر ہوگا، ننھو نے دل ہی دل میں سوچا اور اس کی طرف دیکھتا رہا۔

اچانک فقیر اٹھ بیٹھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ننھو کی طرف دیکھنے لگا، اور دیکھتے ہی دیکھتے دائیں بائیں زور زور سے سر ہلانے لگا، ویسے ہی جیسے جنونی لوگ سر ہلاتے ہیں۔

ننھو نے منھ پھیر لیا اور بازار کی طرف دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس نے پھر مڑ کر دیکھا تو فقیر نے سر ہلانا چھوڑ دیا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ننھو کی طرف دیکھتے ہوئے اسے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ ننھو سہم گیا۔ وہ ڈر گیا، کہیں یہ فقیر اس پر کوئی جادو، ٹونا نہ کردے یا اسے بددعا نہ دے دے۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک اکنی نکال کر

فقیر کے سامنے پھینک دی اور وہاں سے چلنے لگا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے فقیر نے اکنی اٹھالی اور نالے میں پھینک دی۔ پھر اس کی طرف گھورتے ہوئے انگلی ہلا ہلا کر اسے اپنی طرف بلانے لگا۔ ننھو ڈر گیا، اور کانپ کر وہاں سے ہٹ گیا۔

'بڑا بازار' میں بڑی چہل پہل تھی۔ ننھو کے لیے یہ علاقہ سب سے زیادہ پُر کشش تھا۔ سوڈا واٹر کی دونوں دکانوں پر رنگا رنگ کی لاتعداد بوتلیں چمک رہی تھیں۔ نیچے اجلے کپڑے پہنے دکان دار، پالتھی مارے، لیمو پانی کے گلاس بھر بھر گاہکوں کو دے رہے تھے۔ سڑک کی پٹڑی پر، پھولوں کے گجرے بیچنے والے ابھی سے آ بیٹھے تھے۔ سوڈا واٹر کی دکانوں کی بغل میں سیخ کباب والے بیٹھے تھے اور نزدیک ہی ٹھیکہ شراب والوں کی دکان تھی۔ وہیں پر قصائی گلی آکر سڑک میں ملتی تھی، جہاں رنڈیاں بیٹھی تھیں۔ ننھو سڑک کے کنارے ٹھٹکا کھڑا رہا۔

دکان کے سامنے سڑک پر بہت سے تانگے کھڑے تھے۔ چھچماتے ساز، گھوڑوں کے سروں پر ناچتی کلغیاں، میلے کا سا منظر تھا۔ کبھی کبھی کوئی تانگہ سڑک کے بیچ میں آکر رک جاتا۔ گھوڑے کا کسمساتا جسم، گویا ساز تڑانے کے لیے انگڑائیاں لے رہا ہوتا اور تانگہ میں کوئی طرّے والا رئیس اپنے دو ایک دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوتا۔

ننھو چار مطمئن ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے سب ہی لوگ مست ہیں اور اپنے لیے خوشیاں بٹور رہے ہیں۔ ننھو دیر تک وہاں ٹہلتا رہا۔ پھر جب شام ہونے لگی اور بازار میں رونق اور بھی بڑھ گئی تو وہ لپک کر سیخ کباب والے کی دکان پر جا پہنچا۔ وہاں سے اس نے اٹھنی کے کباب لیے اور سیدھا دیسی شراب کے ٹھیکے والی دکان میں بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ مزا لے لے کر کھانے لگا اور گھونٹ گھونٹ شراب پینے لگا۔

شام کے سائے اتر آئے اور بڑا بازار کی بتیاں جل اٹھیں۔ چھڑکاؤ سے پھر ایک بار سوندھی سوندھی مٹی کی خوشبو آنے لگی اور پھولوں کے گجروں کی خوشبو کے ساتھ مل کر ننھو کے دل و دماغ پر مستی کی عجیب سی کیفیت پیدا کرنے لگی۔ ننھو کو احساس نہیں تھا کہ اس نے کب پھولوں کا گجرا خرید کر گلے میں ڈال لیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ کب دیسی شراب کی دکان سے اٹھ کر راجا بازار کا کھلا علاقہ طے کرتا ہوا رنڈیوں کی گلی میں آ پہنچا تھا۔

اسی وقت اچانک اسے سامنے کی طرف سے مراد علی آتا دکھائی دیا۔ گھٹنوں تک لمبا کوٹ، ہاتھ میں پتلی چھڑی، ٹھگنا، گٹھے جسم والا، کالی کالی مونچھوں والا مراد علی۔ کیا وہ سچ مچ مراد علی تھا، یا ننھو کوئی خواب دیکھ رہا تھا؟ اس کی آنکھوں کے سامنے مراد علی کسی بھوت پریت کی طرح منڈلاتا سا دکھائی دیا، جو گلی گلی، کوچہ کوچہ گھومتا پھرتا تھا، چھڑی ہلاتا ہوا۔ کیا سچ مچ مراد علی نام کا بھی کوئی آدمی ہے جو اس شہر میں رہتا بستا ہے، یا صرف پرچھائیں ہے جو ایک گلی سے دوسری گلی میں گھومتی رہتی ہے، اور لوگوں نے اس کا نام مراد علی رکھ چھوڑا ہے؟ نہیں یہ مراد علی ہی تھا، منڈی کی طرف سے گلی کے راستے چلا آرہا تھا۔ ننھو شراب کے نشے میں نہ ہوتا تو کسی گھر کے چبوترے کی آڑ میں چھپ جاتا لیکن ننھو کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ وہ سیدھے گلی کے بیچوں بیچ آگیا۔ اس نے زیادہ نہیں پی رکھی تھی۔ چمڑا رنگنے والے چمار کے لیے دو کلھڑ شراب تو پانی کے برابر ہوتی ہے۔ دن بھر اکیلا گھومتے رہنے کے بعد اب جاکر اسے کوئی جان پہچان کا آدمی ملا تھا۔ اسے اچانک فخر کا احساس ہوا، ہم جس کام کو ہاتھ میں لیتے ہیں، پورا کر کے چھوڑتے ہیں۔

"سلام حضور!"

ننھو نے آگے بڑھ کر ہنستے ہوئے کہا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

مراد علی پل بھر کے لیے ٹھٹکا۔ اس کی تیکھی نظروں نے ننھو کو دیکھا اور سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آگیا۔ بغیر کچھ کہے یا ننھو کے سلام کا جواب دیے، وہ آگے بڑھ گیا۔

"سلام حضور! میں ننھو ہوں۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" یہ کہہ کر ننھو ہنس دیا۔

مراد علی اتنی دیر میں آگے جا چکا تھا۔

ننھو حیران سا گلی کے بیچوں بیچ کھڑا رہا۔ پھر وہاں سے چلّا کر بولا، "حضور مراد علی صاحب!"

لیکن مراد علی نہیں رکا۔

اچانک ننھو کے دل میں خیال آیا، مجھے کم سے کم مراد علی کو یہ تو بتا دینا چاہیئے کہ میں نے ان کا کام کر دیا ہے۔ وہ اس غلط فہمی میں تو نہ رہیں کہ میں یہاں گھوم رہا ہوں اور ان کا کام پورا نہیں کیا ہے۔

ننھو لڑکھڑاتا ہوا، مراد علی کے پیچھے ہولیا۔ آگے اور زیادہ اندھیرا تھا۔ مگر دور مراد علی

کا ہیولا اسے برابر نظر آ رہا تھا وہ گرتا پڑتا بڑھتا گیا۔ جیسے تیسے بھاگنے لگا۔ حضور کو یہ بتانا تو بہت ضروری ہے کہ کام پورا ہو گیا ہے۔

اسے ایسا لگا جیسے وہ مراد علی کے نزدیک پہنچ رہا ہے، دراصل گلی سنسان ہوتی جا رہی تھی، اسے لگا کہ مراد علی نے اپنی چال دھیمی کر دی ہے۔

"حضور! وہ کام ہو گیا تھا۔ وقت پر بھیج دیا تھا۔ ہنھ گاڑی والے آ گئے تھے۔۔۔"

تب ہی ننھو نے دیکھا کہ مراد علی رک گیا ہے اور اپنی چھڑی اٹھائے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس نے سوچا ابھی مراد علی اس کی طرف آئے گا۔ مگر اس نے چھڑی کو اونچا کیوں اٹھایا ہے؟ اور وہ کچھ بھی بولتا کیوں نہیں؟ اندھیری گلی کے ایک سرے پر دونوں کھڑے ایک دوسرے کو گھورے جا رہے تھے۔

ننھو نے ایک بار پھر کہا۔ "آپ کا کام ہو گیا تھا حضور! ٹھکانے لگا دیا تھا ہم نے۔۔۔"

اس کے کہنے کی دیر تھی، اسے لگا کہ مراد علی پھر پلٹ کر آگے آگے جانے لگا ہے۔ قدم بڑھائے آگے چلتا جا رہا ہے۔ گلی کے سرے پر ڈھلان آ گئی ہے اور وہ ڈھلان پر چڑھتا جا رہا ہے۔

ننھو نے نظر اٹھائی۔ مراد علی پھر دور جا چکا تھا۔ گلی میں سے نکل کر شوالے کی طرف جانے والی اونچی ڈھلان پر چڑھتا جا رہا تھا۔ پیٹھ پیچھے سے ننھو کو پھر یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بھوت پریت بڑھتا چلا جا رہا ہے، لیکن آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔

دروازہ کھولنے پر ننھو کو دہلیز پر کھڑا دیکھا تو اس کی بیوی کی جان میں جان آئی۔ لیکن آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ "تم ایسے نہیں کیا کرو جی۔" وہ روتی ہوئی کھاٹ پر جا بیٹھی۔ "میرا دل ڈوب رہا تھا۔ میں سوچوں تم گئے تو کہاں گئے۔ یہ بھی کوئی طریقہ ہے، پریشان کر دیا۔"

ساڑھی کے پلّو سے آنکھیں پونچھ کر وہ اس کی طرف دیکھنے لگی اور پھر اچانک مسکرا دی۔ "یہ کیا سوانگ بنا کر آئے ہو؟ کان میں پھولوں کا گجرا لٹکا رکھا ہے۔ کس کے پاس گئے تھے؟"

مگر ننھو خاموش رہا اور پھر چپ چاپ جا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"شراب پی ہے تو ہنستے گاتے کیوں نہیں ہو؟ پہلے جب پیتے تھے تو ہنستے ہوئے

گھر لوٹتے تھے۔"

ننھو کی بیوی بھگوان سے صبر کا وردان لے کر آئی تھی۔ ننھو غصہ میں آ کر کبھی بک بک جھک جھک کرتا بھی تو وہ کچھ بولتی نہیں تھی۔ اتنا ہی کہتی۔ "کہہ لو۔ کہہ لو۔ دل ہلکا کر لو۔" یا پھر ایک طرف کو سمٹ کر کھڑی ہو جاتی اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہتی۔ "بس بس اور کچھ مت کہو۔ بعد میں تمھیں خود ہی پچھتانا ہوگا۔" اب کسی کے گوشت میں تو کوئی کانٹا چبھوئے لیکن مٹی کے لوندے میں کوئی کیا کانٹا چبھوئے؟ اس کی اچھی عادت کی وجہ سے ننھو بھی چپ رہنے لگا تھا۔ پڑوس کی کوٹھریوں میں کچھ نہیں تو بیس چمار اور ان کے خاندان رہتے تھے اور سب ہی گھر والوں سے ننھو کی بیوی کا میل ملاپ تھا۔ سب ہی کا دکھ سکھ بانٹتی تھی۔ وہ اپنے تھوڑے میں مطمئن رہنے والی، بھگوان سے ڈرنے والی عورت تھی۔ کچھ لوگوں میں فطری طور پر ہی کچھ ایسی سوجھ بوجھ ہوتی ہے کہ وہ اپنی حالت کو اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں اور زندگی سے ایسی کوئی چیز نہیں مانگتے جس کے ملنے کی امید نہ ہو۔ اس لیے ان کا مزاج ہمیشہ شگفتہ رہتا ہے۔

ننھو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا۔

"تم بولتے کیوں نہیں؟ تم اتنی دیر باہر رہے۔ میں مچھلی کی طرح تڑپتی رہی ہوں۔"

ننھو نے آنکھ اٹھا کر بیوی کی طرف دیکھا۔ ایک طوفان سا اس کے دل میں اٹھا۔ اچانک اس نے سر کو جھٹکا دیا۔ "بھاڑ میں جائے مراد علی اور اس کا سودا۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "ہم تو گھر لوٹ آئے ہیں۔"

"باڑے والے میرے بارے میں پوچھتے تھے؟"

"ہاں پوچھتے تھے۔ ایک آدھ بار پوچھا تھا۔"

"تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا، کام پر گئے ہیں۔ آتے ہوں گے۔"

"کیا بار بار پوچھتے تھے؟

"نہیں جی! لوگ کام پر جاتے نہیں ہیں کیا؟ شام کو برابر والی نے پوچھا تو میں نے کہا، گھوڑے کی کھال اتارنے گئے ہیں۔"

ایک ہلکی سی مسکراہٹ ننھو کے ہونٹوں پر دوڑ گئی۔

"مگر تم کہاں گئے تھے؟"

"پھر بتاؤں گا۔"

ننھو کی بیوی اس کے منھ کی طرف دیکھتی رہی۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ننھو اس سے کوئی بات چھپائے۔ مگر چپ رہنا ہی بہتر تھا۔ چپ رہوں گی تو کچھ دن بعد اپنے آپ بتا دے گا۔

"نہیں پوچھوں گی۔ تم نہیں چاہتے تو نہیں پوچھتی۔۔ کھانا کھاؤ گے؟ میں ابھی منٹوں میں گرم گرم روٹیاں سینکے دیتی ہوں۔ چائے کے ساتھ روٹی کھا لو۔"

اور وہ چارپائی سے اتر آئی۔ لیکن کسی جذباتی ہیجان کے تحت ننھو نے اسے روک لیا اور اپنی طرف کھینچ کر اپنے پاس بٹھائے رکھا۔ "نہیں تم ادھر ہی بیٹھو۔"

بیوی اس کے ساتھ لگ کر بیٹھی رہی۔

"تم نے کھانا کھایا؟" ننھو نے جوش میں اس کے بال سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں کھایا۔"

بیوی کو ننھو کا برتاؤ عجیب سا لگا۔

"جھوٹ بولتی ہو۔ سچ بتا۔ کھانا کھایا؟"

بیوی نے آنکھ اٹھا کر ہنستے ہوئے کہا۔ "ہم نے بنایا تھا، لیکن ہم سے کھایا نہیں گیا۔"

"صبح کو کھایا تھا یا نہیں؟"

"کھایا تھا۔"

"پھر جھوٹ! سچ سچ بتا، کھایا تھا؟"

اس نے شوہر کی طرف دیکھا اور ہنس دی۔ "نہیں کھایا تھا۔ میں تمھاری راہ دیکھ رہی تھی، کھاتی کیسے؟"

"اور جو آج رات بھی نہیں آتا تو؟"

"آتے کیوں نہیں۔ مجھے معلوم تھا، تم آؤ گے۔"

کوئی انجانی سی خلش تھی، جو ننھو کے دل کو ابھی تک محسوس رہی تھی۔ اسی دھڑ پکڑ کی وجہ سے وہ سڑکوں پر چکر لگاتا رہا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے شراب بھی پی تھی۔ بیوی کے پاس بیٹھے ہوئے بھی کوئی خوف اندر ہی اندر اس کا کلیجہ چاٹ رہا تھا۔ اچانک

ننھو کو کھٹکا سا محسوس ہوا، اور اسے لگا جیسے مراد علی دروازے کے باہر کھڑا ہے اور اس کی چھڑی کی نوک دروازے پر رکھی ہے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پھر اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو دلاسا دیتے ہوئے کہا: مراد علی نے مجھے پہچانا نہیں ہوگا۔ ورنہ بات تو کرتا۔ چپ چاپ چل دیا۔ اس نے ضرور یہی سمجھا ہوگا کہ کوئی شرابی ہے جو نشے میں دُھت، اسے پریشان کرنے آیا ہے۔ آخر پانچ روپے کا نوٹ وہ میرے ہاتھ میں دے کر گیا تھا!

"میں جانتی تھی تمھیں کوئی پریشانی ہے۔ تم خوش نہیں ہو، اس لیے میں گھبرا رہی تھی۔"
ننھو نے مڑ کر بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔
"لوگ کہتے تھے شہر میں گڑبڑ کا ڈر ہے۔ کسی نے سؤر مار کر مسجد کے آگے پھینک دیا تھا۔ اس سے بھی میں گھبرا رہی تھی۔ میں کہوں، کوئی گڑبڑ ہو گئی تو میں تمھیں کہاں ڈھونڈھنے جاؤں گی۔"

ننھو ٹھٹک کر بیوی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

"کون سا سؤر؟ کیسا سؤر؟"

"سؤر کیسے ہوتے ہیں؟" اس کی بیوی ہنس دی۔ وہ خوش تھی کہ ننھو واپس آگیا ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ دونوں بیٹھے رہیں اور اسی طرح باتیں کرتے رہیں۔

"کالا تھا یا سفید؟" ننھو نے پوچھا۔ اس کے کان بیوی کے جواب کی طرف لگے ہوئے تھے۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"تم نے دیکھا تھا؟"

"میں سؤر دیکھنے جاؤں گی؟ مجھے کیا پڑی ہے؟"

"باڑے میں سے کسی نے دیکھا ہے؟"

"تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو جی! باڑے کے لوگ سؤر دیکھنے جائیں گے؟ سنی سنائی بات لوگوں نے کہہ دی۔"

رات گہری ہونے لگی تھی۔ آس پاس کی کوٹھریوں میں سے آوازیں آنی لگ بھگ بند ہو چکی تھیں۔

"باہر سوؤ گے یا اندر؟" بیوی نے کنکھیوں سے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں؟"

"تمھارا کیا بھروسا؟ باہر سوتے ہیں تو اٹھا کر اندر لے آتے ہو۔ ہم نے کہا کہ پہلے ہی پوچھ لیں۔ جو تمھاری نیت خراب ہو تو پہلے ہی اندر پڑے رہیں۔ ویسے اندر گرمی بہت ہے۔" اور وہ بیٹھی بیٹھی اپنے بال کھولنے لگی۔

"تم نے کچھ نہیں بتایا، کھانا کھاؤ گے یا نہیں؟ چائے بنا دوں؟ تم اتنے گم صُم کیوں بیٹھے ہو؟ کل تم نہیں تھے، گھر کاٹنے کو دوڑتا تھا۔"

بیوی کو لاپرواہی سے بال کھولتے دیکھ کر ایک درد بھرے ہیجان کی لہر نتھو کے تن بدن میں اٹھی اور اس نے پاگلوں کی طرح اپنی بیوی کو باہوں میں بھر لیا اور اس کے گال، اس کے ہونٹ، اس کے بال، اس کی آنکھیں بار بار چومنے لگا۔ یہ جذبات کا طوفان مسلسل بڑھتا گیا اور اس کا رواں رواں اپنی بیوی کے گدرائے جسم اور اس کی گرم گرم سانسوں میں کھونے لگا۔

"میں تین بار روئی ہوں، آج کے دن۔ برآمدے میں کھڑی گھنٹوں تمھاری راہ دیکھتی رہتی تھی، پھر اندر آکر رو دیتی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے اب تم لوٹ کر نہیں آؤ گے۔"

بیوی کی باہوں میں نتھو کھوتا جا رہا تھا۔ دین دنیا کو بھولتا جا رہا تھا۔ اس کے بھوکے بے چین ہونٹ تشنگی بجھانے کے لیے بھٹکتے ہوئے کبھی تو بیوی کے ہونٹوں سے جا لگتے اور کبھی پستانوں سے جا ٹکراتے۔ ہانپتا ہوا، وہ بیوی کے انگ انگ میں پناہ، سکون اور خود فراموشی کی تلاش میں جیسے بھٹک رہا تھا۔

تب ہی میدان کے پار کتے زور زور سے بھونکنے لگے، اور دور کہیں سے دبا دبا سا شور کانوں میں پڑنے لگا۔ نتھو کو تو کسی بات کا ہوش نہیں تھا، لیکن نتھو کی بیوی کی نظر چھت کے نیچے دیوار پر گئی۔ روشن دان کے سامنے کی دیوار پر ہلکی سی روشنی تھرک رہی تھی جیسے کوئی لال سی پرچھائیں ناچنے لگی ہو۔ اسے ایسا لگا جیسے دیوار پر پڑنے والی روشنی کانپ رہی ہے۔ دور سے دبا دبا شور سنائی دینے لگا۔

"یہ کیا ہے جی؟" دیوار کی طرف دیکھتی ہوئی بیوی بولی۔ "وہ دیکھو تو دیوار پر، یہ کیسی روشنی ہے؟ لگتا ہے جیسے آگ کی لپٹ ہو۔ کہیں آگ لگی ہے کیا؟ سنو تو، یہ شور کیسا ہے؟"

نتھو نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک ہلکی سی کراہ اس کے منھ سے نکلی۔ کتے پہلے سے

بھی زیادہ زور سے بھونکنے لگے تھے اور دور سے سنائی دینے والا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی غیر واضح گونج فضا میں پھیل رہی تھی، بڑھتے چلے آرہے لشکروں کی آواز کی طرح۔ دیوار کے اوپری حصے میں پرچھائیاں زیادہ تھرتھرا رہی تھیں اور زیادہ گہری ہو گئی تھیں جیسے آگ کے ہلتے ہوئے سائے ہوں۔

"کہیں آگ لگی ہے!" اس نے بھرّائی سی آواز میں کہا، اور اٹھ بیٹھا۔

اسی لمحہ، بھنبھناتے شور کے اوپر تیرتی سی کسی گھڑیال کے بجنے کی آواز آئی۔ دونوں کے لیے اجنبی سی آواز تھی۔ یوں تو روزانہ ہی شیخوں کے باغ میں لگی ہوئی گھڑی کی آواز آیا کرتی تھی۔ چوکے سے نبٹنے کے بعد جب نتھو کی بیوی اندر کرے میں آتی اور دونوں سونے کی تیاری کر رہے ہوتے، اس وقت اگر نو گھنٹہ بجتا تو بیوی اکثر دس گنا کرتی تھی، کبھی کبھی گیارہ بھی سننے کو ملتے۔ لیکن یہ شیخوں کی گھڑی کی آواز نہیں تھی۔ کسی گھڑیال کے بجنے کی آواز تھی جسے نتھو نے بھی پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ گھڑیال لگاتار بج رہا تھا اور بڑھتے شور میں اس کی ٹنٹنائی آواز کبھی تو صاف سنائی دیتی اور کبھی تھوڑی دیر کے بعد دب جاتی تھی۔ پھر شور کے اوپر تیرتی ہوئی سی اس کے کانوں تک پہنچ جاتی تھی۔

شور بڑھتا جا رہا تھا۔ باڑے کے اندر سے، کوٹھریوں میں سے آوازیں آنے لگی تھیں۔ لوگ جاگ جاگ کر کوٹھریوں سے باہر آرہے تھے۔

"منڈی میں آگ لگی ہے!" کوئی آدمی بہت زور سے چلّایا۔ اسی وقت اچانک کہیں دور سے ایک اور آواز آئی۔ آواز بہت اونچی تھی۔ بہت صاف تھی۔

"اللہ اکبر!"

نتھو کا جسم سر سے پاؤں تک جھنجھنا اٹھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے چھت کی طرف دیکھے جا رہا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے اسے لقوہ مار گیا ہو۔

"چلو باہر چلیں" اس کی بیوی نے سہمی سی آواز میں کہا۔ "باڑے والوں سے پوچھیں۔ مجھے یہاں تو ڈر لگ رہا ہے۔"

مگر نتھو اسے پکڑے رہا، اور خود بھی کھاٹ پر جما بیٹھا رہا۔

تھوڑی دیر بعد بڑھتے شور میں ایک اور آواز بہت سے گلوں میں سے ایک

ساتھ پھوٹ کر آئی۔

"ہر ہر مہادیو!"

آخری لفظ بہت لمبا کر کے بولا گیا تھا۔

اس بڑھتے شور اور لگاتار بجتے گھڑیال کے درمیان یہ اونچی آوازیں بار بار سنائی دینے لگی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا تیوہار منایا جانے لگا ہے۔

آخر نتھو کی بیوی سے نہیں رہا گیا۔ وہ نتھو سے ہاتھ چھڑا کر اٹھی اور دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ نتھو اب بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

یہی شور ایک ناقابل فہم آواز کی لہر بن کر، شہر کے باہر، دور رچرڈ کے بنگلے کی دیوار سے بھی ٹکرانے لگا تھا۔ اس مسلسل گہری ہونے والی گونج میں کچھ دیر بعد گھڑیال کی ٹن ٹن بھی تیرتی ہوئی آنے لگی تھی۔ رچرڈ اس وقت گہری نیند میں سویا ہوا تھا لیکن لیزا یہ آوازیں سن کر جاگ گئی تھی۔ پہلے تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے ان ہی کے کمرے میں لگی گھنٹی آہستہ آہستہ ٹنٹنانے لگی ہے، جس طرح دن کے وقت ہوا کا جھونکا آنے پر ٹنٹناتی تھی لیکن جب اس کی نیند پوری طرح ٹوٹی تو محسوس ہوا کہ یہ آواز الگ ہے۔ کبھی کبھی یہ آواز ہوا میں بالکل ڈوب جاتی۔ یوں لگتا جیسے ہوا اڑا کر لے گئی ہو۔ پھر اچانک زور کی آوازیں اندھیرے کے ناہموار فاصلوں میں سے تیرتی ہوئی سی آ جاتیں۔ لیزا کی آنکھوں میں نیند بھری تھی۔ اسے کبھی کبھی ایسا لگتا جیسے کسی ایسے جہاز کی گھنٹی بج رہی ہے جو طوفان میں سمندروں کی لہروں سے جنگ کرتا ہوا اپنا راستہ تلاش کر رہا ہے۔

اس نے کہنیوں کے بل اٹھ کر رچرڈ کی طرف دیکھا۔ رچرڈ ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا۔ اسے رچرڈ کے کردار کی خوبی ہی کہیے کہ تکیے پر سر رکھتے ہی سو جاتا تھا۔ پلنگ پر لیٹتے ہی وہ گہری نیند میں کھو جاتا تھا۔

لیزا کو کمرے کے اندھیرے میں گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ باہر گیٹ پر پہرہ دار کے بوٹ اس طرح آواز پیدا کر رہے تھے، جیسے کہ سڑک کوٹی جا رہی ہو۔

"یہ کیسی آواز ہے رچرڈ؟" اور لیزا اس کے جسم سے لگ کر لیٹ گئی۔

"ایں کیا ہے؟" رچرڈ جاگ گیا۔

"یہ کیسی آواز ہے؟"

"کچھ نہیں۔ سو جاؤ۔" اور رچرڈ نے کروٹ بدل لی۔

لیکن لیزا نے اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں "یہ کہیں کوئی گھڑیال سا بج رہا ہے رچرڈ۔" لیزا نے کہا۔ "جیسے کسی چرچ کی گھنٹی ہو۔"

رچرڈ جاگ گیا۔ اس نے دھیان سے سنا اور کہنیوں کے بل اٹھ بیٹھا۔

"چرچ کی گھنٹی کی آواز زیادہ گہری ہوتی ہے۔ یہ مندر کے گھنٹے کی آواز ہے۔ ہندوؤں کے مندر کے گھنٹے جیسی۔"

"یہ اس وقت کیوں بج رہا ہے رچرڈ۔ کیا ہندوؤں کا کوئی بڑا دن ہے؟ اس گھڑیال کی آواز سن کر ایسا لگتا ہے جیسے سمندر میں طوفان اٹھا ہو اور کوئی جہاز خطرے کی گھنٹی بجا رہا ہو۔"

رچرڈ خاموش رہا۔

شہر کی طرف سے آنے والا بھنبھناتا سا شور رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی آواز اس شور میں سے اوپر اٹھ جاتی، جیسے کوئی کسی کو بلا رہا ہو۔ پھر اسی شور کے سمندر میں ڈوب جاتی۔

اسی وقت اندھیرے کی لہروں پر تیرتی ہوئی ایک اور آواز آئی۔

"اللہ اکبر!"

رچرڈ کا سارا جسم ایک دم تن گیا۔ پھر تھوڑی دیر میں ہی ڈھیلا بھی پڑ گیا۔

"کیا آواز ہے؟ یہ کیسی آواز ہے؟ اس کا مطلب کیا ہے؟"

"اس کا مطلب ہے، گاڈ اِز گریٹ!"

"یہ آواز اس وقت کیوں بلند کی جا رہی ہے؟ ضرور کوئی مذہبی تیوہار ہوگا۔"

رچرڈ دل ہی دل میں ہنس دیا۔

"یہ مذہبی تیوہار نہیں ہے لیزا۔ دراصل شہر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فساد ہو گیا ہے۔"

"تمھارے رہتے ہوئے فساد ہو گیا ہے رچرڈ۔"

رچرڈ کو ایسا لگا جیسے لیزا سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ بے تکا سوال کر رہی ہے۔

"ہم ان کے مذہبی جھگڑوں میں دخل نہیں دیتے۔ لیزا تم تو جانتی ہو۔"

پل بھر کے لیے لیزا کو ایسا لگا جیسے وہ کسی بھیانک جنگل میں چاروں طرف سے گھری ہوئی

ہے، اور دور سے آنے والی آوازیں جیسے جنگل کی ہی آوازیں ہیں۔ سیاروں، گیدڑوں جیسے جانوروں کی آوازیں۔

"تم نے اسے بند کیوں نہیں کروایا، رچرڈ؟ یہاں مجھے ڈر لگتا ہے۔"

رچرڈ خاموش رہا۔ کہنیوں کے بل بیٹھا رہا۔ اس کا دماغ اس وقت تیزی سے سوچنے لگا کہ اس حالت میں اسے کیا کرنا ہوگا؟ سرکار کی پالیسی پر کس طرح خاطر خواہ عمل ہوگا۔

لیزا نے اپنی بانہہ اس کے گلے میں ڈال دی تھی "یہ لوگ لڑیں گے تو تمھاری جان کو بھی تو خطرہ ہے، رچرڈ۔" لیزا نے کہا اور اس کا دل رچرڈ کے لیے ہمدردی کے جذبات سے بھر گیا۔ دبلا پتلا رچرڈ خوں خوار لوگوں کے درمیان اکیلا گھوم رہا ہے۔ ایسے لوگوں پر حکومت کرنا کیا کوئی آسان کام ہے؟

دریں اثنا اندھیرے کی گپھاؤں سے نکلتی ہوئی گھڑیال کی ٹن ٹن سنائی دے جاتی تھی۔

"یہ لوگ آپس میں لڑیں، کیا یہ کوئی اچھی بات ہے؟"

رچرڈ ہنس دیا۔

"کیا یہ اچھی بات ہوگی کہ یہ لوگ مل کر میرے خلاف لڑیں، اور میرا خون کریں؟" رچرڈ نے کہا، اور کروٹ بدل کر ایک ہاتھ سے لیزا کے بال سہلانے لگا۔ "کیسا رہے، اگر اس وقت یہ آوازیں میرے گھر کے باہر اٹھ رہی ہوں اور یہ لوگ میرا خون بہانے کے لیے سنگینیں اٹھائے باہر کھڑے ہوں؟"

لیزا سر سے پاؤں تک لرز اٹھی۔ وہ رچرڈ کے اور قریب آگئی اور اندھیرے میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے یوں محسوس ہوا، جیسے انسانی اقدار کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اصل میں اہمیت فرماں روائی کی اقدار کی ہوتی ہے۔

اتنے میں رچرڈ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "شہر میں گڑبڑ ہے، لیزا۔ تم سو جاؤ۔ مجھے حالات معلوم کرنے ہوں گے۔"

اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔

9

"ایسا بے تکا گھر ہے' کوئی چیز کہیں ایک بار رکھ دو' پھر ملتی ہی نہیں چاہے ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے مرجاؤ۔" لالہ لکشمی نرائن الماری کے سامنے کھڑے بڑبڑا رہے تھے۔ الماری کے نچلے خانے میں کپڑوں کے نیچے انھوں نے ایک ننھی سی کلہاڑی رکھ چھوڑی تھی جو اس وقت نہیں مل رہی تھی' اور اُدھر شہر میں گڑبڑ شروع ہو گئی تھی۔ دوبارہ کوٹھری میں سے باہر آکر گھر والی سے پوچھنے جا چکے تھے کہ' تم نے کلہاڑی تو نہیں دیکھی؟ اور دونوں بار بیوی نے ایک سوال کے دو جواب دیے تھے۔

"دیکھو جی! میں داتن نہیں کرتی جو مجھے داتن کے لیے کلہاڑی سے کیکر کاٹنی ہو۔ لکڑیاں میں نہیں پھاڑتی کہ مجھے کلہاڑی کی ضرورت ہو گی۔ آپ کیوں بار بار مجھ سے پوچھتے ہیں؟"

"اب پوچھنا بھی گناہ ہے۔ کلہاڑی نہ ملے تو تم سے نہ پوچھوں تو پھر کس سے پوچھوں؟"

"دیکھو جی۔ کیوں پریشان ہوتے ہو۔ اوپر بھگوان بھی تو ہے۔ اس کے سہارے بیٹھے رہو۔ اس چھوٹی سی کلہاڑی سے تم کس کس کا بچاؤ کرو گے؟"

کلہاڑی سچ مچ چھوٹی سی تھی' زرد رنگ کے دستے پر سرخ اور سبز رنگ کے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ لالہ جی ایک بار اپنے بچوں کو ایک میلے میں لے گئے تھے اور وہاں سے یہ کلہاڑی لیتے آئے تھے۔ پھر چند روز تک صبح کو ہوا خوری کرتے وقت چھڑی کی بجائے اسے اپنے ساتھ لے جاتے رہے۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ اس سے کیکر کے پیڑ سے داتن کے لیے ٹہنی کاٹی جا سکتی ہے' چنانچہ وہ اسے روزانہ اپنے ساتھ

لے جانے لگے اور پھر گھر میں داتنوں (مسواک) کا ڈھیر لگنے لگا تھا۔ اپنے لیے تو انھیں صرف ایک داتون (مسواک) چاہیئے تھی، لیکن ٹہنی توڑو اور اسے تراشتے ہوئے گھر واپس آؤ تو ایک ٹہنی میں سے کتنے ہی داتون نکل آتے تھے۔ بچے ہوئے داتونوں کو جب ان کی بیوی کچرے کی ٹوکری میں پھینکنے جاتی تو انھیں برا لگتا۔

"تازہ داتون پھینکنے جا رہی ہو؟ کچھ تو دھیان کیا کرو۔"

"دیکھو جی! تازہ ہوں یا پرانے، یہ کسی کے مطلب کے تو ہیں نہیں، اب انھیں رکھ کر کیا کرو گے؟"

"تم خود داتن کیا کرو۔"

"میرے دانت ہلتے ہیں۔ تمھارے داتونوں کی مہربانی سے ہی ہلنے لگے ہیں۔ پہلے تو لوہے کی طرح مضبوط ہوا کرتے تھے۔" وہ کہتی اور سیڑھیوں کے پاس رکھی کوڑے کی بالٹی کی طرف جانے لگتی۔

"دیکھ نیک بخت۔ انھیں ایک دن اور پڑا رہنے دے۔ جب سوکھ جائیں گے تو میں کچھ نہیں کہوں گا لیکن ہرے داتونوں کو کون پھینکتا ہے؟"

اور آج وہی کلہاڑی کھو گئی تھی۔ کلہاڑی کے گھر میں ہونے کی وجہ سے انھیں حفاظت کا احساس رہتا تھا۔ اس کے نہ ملنے پر انھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ نہتے ہو گئے ہیں۔ اور گھر میں اس کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے ہتھیار کا نام دیا جا سکے۔ چند ایک مسہری کے ڈنڈے تھے، یا پھر رسوئی کے چاقو۔ تیل کے نام پر صرف ایک شیشی سرسوں کے تیل کی تھی اور کوئلہ نہ ہونے کے برابر۔ دان پر سنگھی جی سے وعدے کے باوجود لالہ جی ان چیزوں کا انتظام نہیں کر پائے تھے۔ انھیں دل ہی دل میں بھروسا تھا کہ سرکار فساد نہیں ہونے دے گی۔ اور اگر ہو بھی گیا تو اس کی آنچ ان تک بہت جلدی نہیں پہنچے گی۔

کلہاڑی اس وقت یودک سنگھ کے شسترا گار (اسلحہ خانہ) کی رونق بڑھا رہی تھی جہاں رن ویر نے تیر کمانوں کے "پھل" ایک کے ساتھ ایک رکھ کر سجا دیے تھے۔

"ایسا بے تکا گھر ہے۔ اب میں جاؤں تو کہاں جاؤں۔" وہ پھر بڑبڑائے۔

"تو نے کلہاڑی دیکھی ہے نانکو؟" انھوں نے نوکر کو بلا کر پوچھا۔

"نہیں پر تھی پتا جی! لیکن میں نے دیکھی نہیں۔"

"گھر میں تھی تو اب پر لگا کر اڑ گئی؟ تو مجھے چڑاتا ہے؟ تجھے بھی نہیں معلوم تو پھر کہاں گئی کلہاڑی؟"

"میں نے نہیں دیکھی پتا جی!" نانکو دہلیز پر کھڑا تھا۔

انترنگ سبھا کی میٹنگ میں اسی روز صبح کو جب شہر کی صورت حال پر بحث ہو رہی تھی تو انھیں ہندو فرقہ کی اجتماعی حفاظت کا خیال بار بار آرہا تھا۔ لڑکوں کو لاٹھی چلانا سکھاؤ۔ اس کام میں ایک دن کی بھی دیر مت کرو۔ میں اس کام کے لیے پانچ سو روپے دوں گا۔ لالہ جی نے کہا تھا، اور دیکھتے ہی دیکھتے، ان کی ترغیب پر، ڈھائی ہزار روپے اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس وقت تو انھیں دشمن سے لوہا لینے، اسے نیچا دکھانے کی دھن تھی۔ اپنے آپ کو وہ محفوظ سمجھتے تھے اور اصل میں وہ تھے بھی محفوظ۔ پیسے والے جانے پہچانے آدمی تھے۔ اونچے مکان میں رہتے تھے لیکن سب ہی پس ماندہ طبقے کے لوگ تھے۔ شہر کے بعض مسلمان تاجروں کے ساتھ لالہ جی تجارت کرتے تھے۔ ان کے ساتھ بھی مراسم تھے۔ پھر ڈر کس بات کا تھا۔ لیکن آگ لگ جانے پر شہر کا ماحول بدل گیا تھا اور سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی ان کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

"سنتی ہو، مجھے لگتا ہے کہ ہمارا ہونہار وہ کلہاڑا لوک سماج میں دے آیا ہے۔"

"تم جانو، اور تمھارا بیٹا جانے۔ مجھے تو تم لوگ بے وقوف سمجھتے ہو۔ میں تمھاری باتوں میں پڑوں ہی کیوں؟"

"تم سے کچھ کہہ کر گیا ہے؟"

"کون؟"

"کون کیا؟ رن ویر اور کون؟"

"مجھ سے کچھ نہیں کہہ کر گیا۔ تمھارے ہی حکم دن بھر سنتا رہتا ہے۔ اب میں کیا جانوں کہاں گیا ہے؟ اس قیامت کی رات میں بھی بیٹا گھر پر نہیں ہے۔"

لالہ جی ہاتھ جھٹک کر پھر کوٹھری کی طرف پلٹ گئے لیکن اب کوٹھری میں رکھے مسہری کے ڈنڈے اٹھائے اور باہر آگئے۔ ایک ڈنڈا انھوں نے نانکو کو دیا اور اس سے کہا کہ ہاتھ میں لے کر نیچے دروازے کے پاس بیٹھ جائے۔ دوسرا ڈنڈا انھوں نے اسی جگہ دیوار کے ساتھ ٹکا کر کھڑا کر دیا جہاں ان کی بیوی جوان بیٹی کے ساتھ چارپائی پر بیٹھی تھی۔ ایک ڈنڈا انھوں

نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ تھوڑی دیر اسے ہاتھ میں لیے کھڑے رہے، پھر اسے کچھ عجیب سی بات سمجھ کر اس ڈنڈے کو بھی دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلے گئے جہاں گھر کا پاخانہ بنا ہوا تھا۔

پچھلی بار فساد بھڑکا تھا تو صرف منڈی میں آگ لگی تھی، مار کاٹ نہیں ہوئی تھی، لیکن اب کی بار فضا میں زہر زیادہ تھا۔ لوگ بھڑکے ہوئے تھے۔ انترنگ سبھا کی میٹنگ تک تو لالہ جی خود بھی بھڑکے ہوئے تھے۔

آگ پہلے سے زیادہ پھیل چکی تھی۔ شمال مغرب کی طرف آسمان لال ہو رہا تھا۔ اسی لالی میں سے کوندتی ہوئی آگ کی لپٹیں کسی اژدہے کی زبان کی طرح لپلپا رہی تھیں۔ آگ اب شمال کی سمت میں دھیرے دھیرے پھیل رہی تھی، بالکل اس طرح جیسے دسہرے پر لنکا جلتی ہے۔ آگ برابر تیز ہو رہی تھی۔ نیچے کی طرف آگ کے بگولے چکر کھاتے نظر آتے، گٹھری کی مانند۔ پھر اچانک اس میں سے ناچتے ہوئے شعلے سیدھے آسمان کی طرف لپکتے۔ آسمان میں سرخی بڑھنے لگی تھی۔ کبھی کبھی لال دھول کا ایک بادل سا اوپر کو اٹھتا اور پھر بکھر جاتا، اور لال سے دھوئیں میں بدل کر آسمان میں پھیل جاتا۔ ستارے پھیکے پڑ چکے تھے۔ افق سے کچھ اوپر تک کا حصہ گہرا سرخ تھا لیکن اس کے اوپر کی سرخی میں زردی ملتی جا رہی تھی دھوئیں کا رنگ بھی جیسے سفید پڑتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی آگ کا کوئی بگولا سیدھا اوپر کو اٹھتا ہوا دور تک آسمان میں چلا جاتا، جیسے ایک بادل میں سے دوسرا بادل نکل رہا ہو اور چکر لگاتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا ہو۔

پاخانے میں سے نکل کر لالہ جی چھت کی منڈیر کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ دہکتے آسمان کے پس منظر میں مکانوں کی چھتوں پر کھڑے لوگوں کی شکلیں زیادہ صاف نظر آنے لگی تھیں۔ سب ہی لوگ آگ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دور تک پھیلے شہر کے گھروں کی منڈیروں اور برساتیوں کے چوکور ڈھانچے ایک تصویر کی طرح ابھر آئے تھے۔ لالہ جی کا گودام بڑا بازار کی ایک گلی میں تھا جو منڈی سے ذرا ہٹ کر جنوب مغرب کی طرف واقع تھی۔ انھیں یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہاں پر اندھیرا تھا۔ آگ اس طرف پھیل نہیں رہی تھی۔

لالہ جی نے منڈیر سے نیچے کی طرف جھانک کر دیکھا۔ پڑوس کی چھت پر تین آدمی کھڑے تھے۔ تینوں کا منہ آگ کی طرف تھا۔ فتح دین، اس کا بھائی اور ان دونوں کا بوڑھا باپ چھت

پر کھڑے تھے۔ فتح دین کی نظر آسمان کی لالی کو دیکھتی ہوئی پچھواڑے کی طرف مڑ گئی تو اسے لالہ جی کھڑے نظر آئے۔

"کیسا قہر ٹوٹا ہے، بابو جی! کیسی بری آگ لگی ہے۔" فتح دین نے کہا۔

لالہ جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس پر فتح دین نے یقین دہانی کے لہجے میں کہا "بے فکر رہو بابو جی۔ آپ کے گھر کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ پہلے ہم پر کوئی ہاتھ اٹھائے گا۔ پھر آپ پر اٹھنے دیں گے۔"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ پڑوسی تو انسان کے بازو ہوتے ہیں اور پھر آپ جیسے پڑوسی۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ یہ فسادی لوگ فساد کرتے ہیں۔ شریفوں کو پریشان کرتے ہیں۔ یہاں سب ہی کو ایک ہی شہر میں رہنا ہے۔ پھر لڑائی جھگڑا کس بات کا؟ کیوں بابو جی؟"

"بیشک، بیشک!"

لالہ جی کو فتح دین کی بات پر اعتبار تھا بھی اور نہیں بھی تھا۔ بیس برس یہاں رہتے ہو گئے تھے۔ ان لوگوں سے انھیں کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی لیکن، تھے تو آخر مسلمان۔ یوں ڈرنے کی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اگر کسی نے میرے گھر کو آگ لگائی تو میرا تو صرف ایک گھر جلے گا، مسلمانوں کا سارا محلہ جلے گا۔ پھر صبح حیات بخش نے، جو مسلم لیگ کا صدر تھا، یقین دلایا تھا کہ اس کے رہتے ہوئے کوئی اس کا بال بھی بانکا نہیں کر سکتا۔ گودام کے بارے میں بھی انھیں کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ گودام کے سارے مال کا بیمہ ہو چکا تھا پھر بھی حالت بگڑتے دیر نہیں لگتی اور ان مسلوں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

انھیں فکر تھی تو رن وِیر کی فکر تھی جو اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ جوشیلا لڑکا ہے، کہیں کوئی غلطی نہ کر بیٹھے۔ یوں تو ماسٹر دیو ورت نے گڑبڑ دیکھ کر اسے روک لیا ہو گا۔ شام کے وقت رن وِیر کہہ بھی گیا تھا کہ سب ہی لڑکے ماسٹر جی کے پاس ہیں۔ لیکن کیا معلوم، اس نے منڈی کا رخ کر لیا ہو۔

اسی وقت ان کے کانوں میں گھڑیال بجنے کی آواز آئی، جسے سن کر انھیں تسلّی ہوئی۔ انترنگ سبھا کی بیٹھک میں انھوں نے ہی صلاح دی تھی کہ خطرے کی گھنٹی کو ٹھیک کرا لیا جائے اور اس میں نئی رسّی ڈلوا دی جائے۔ انھیں آواز سن کر تسلّی ہوئی کہ ان کی صلاح کو عملی جامہ پہنا دیا گیا ہے، لیکن دوسرے ہی لمحہ آگ کے ان بگولوں کے درمیان گھڑیال کا بجنا انھیں

بے معنی اور بے مطلب لگا۔

" اِدھر خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے۔ اُدھر منڈی جل رہی ہے۔ ہندوؤں کا لاکھوں کا نقصان ہوا ہے۔ ہم ہندوؤں کو اسی چیز نے مارا ہے ...۔" وہ بڑبڑائے۔

وہ بیٹھ کے پیچھے دونوں ہاتھ باندھے ٹہل رہے تھے اور بڑبڑاتے جارہے تھے۔ کبھی کبھی، ان کا دل ڈوبنے لگتا۔ گھر میں جوان بیٹی تھی۔ اگر اس طرف گڑبڑ ہوگئی تو میں انھیں کہاں سنبھالوں گا۔ اور نہ جانے رن ویر کہاں گھوم رہا ہے۔

" بڑا بے وقوف لڑکا ہے۔ کسی کی نہیں سنتا۔ سماج سیوا' سماج سیوا کی رٹ لگائے رہتا ہے۔ جسے اپنے ماں باپ کی فکر نہیں' وہ سماج سیوا کیا کرے گا؟"

کبھی کبھی انھیں لگتا جیسے رن ویر نے اناج منڈی کا رُخ کیا ہے' جہاں آگ لگی ہے اور یہ خیال دل میں آتے ہی ان کے سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ جاتی۔

اور لوگوں کے بھی بیٹے ہیں' وہ بھی منڈلی میں جاتے ہیں' لاٹھی چلانا سیکھتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہ خطرے کے وقت گھر کے باہر گھوم رہے ہوں۔ بڑا بہادر سپاہی بنا پھرتا ہے۔ انھیں اپنے آپ پر غصّہ آیا۔ میٹنگ میں دوسرے لوگ خاموش بیٹھے رہتے ہیں' جبکہ میں بولتا رہتا ہوں۔ پانچ سو روپیہ بھی مجھ سے نکلوالیا اور کسی نے سَو سے زیادہ نہیں دیا۔ مجھ پر کوئی ایسی ویسی آن پڑی تو کوئی بھڑوا نزدیک نہیں آئے گا۔ یہاں مسلمانوں کے محلے میں کون میری مدد کرنے آئے گا؟

منڈیر کے پاس کھڑے لالہ جی نے گھر کے اندر جھانک کر دیکھا۔ نیچے گھپ اندھیرا تھا جنگلے کے پاس پڑی چارپائی پر پائینتی کی طرف ان کی بیٹی اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی تھی۔

" ہری کا نام لو۔" ماں کہہ رہی تھی۔" ہری کا نام لو۔ گائتری کا پاٹھ کرو۔"

اور بیٹی گود میں ہاتھ رکھے گائتری منتر کا پاٹھ کرنے لگی۔

اوپر سے لالہ جی نے دھیمی آواز میں پوچھا" رن ویر آیا؟ کیوں رن ویر کی ماں رن ویر آگیا ہے؟"

" نہیں جی۔ ابھی کہاں آیا ہے' کوئی نہیں آیا۔"

" اچھا دھیرے بول۔ تجھ سے دھیرے نہیں بولا جاتا۔"

لالہ جی چھت پر ٹہلنے لگے۔ بار بار دل کو حوصلہ دیتے۔ میرے گھر کو آگ لگائیں گے تو

ان کی ساری گلی جلے گی۔ لیکن، آخر کار ان سے نہ رہا گیا، بڑبڑاتے ہوئے سیڑھیوں سے اتر آئے۔ لیکن گھر والوں کے سامنے پہنچے تو ان کا رُخ بدل گیا۔

"اس طرح گم صم کیوں بیٹھی ہو، رن ویر کی ماں؟ گھبرانے کی کیا بات ہے، ہمّت سے کام لو۔"

رن ویر کی ماں چُپ رہی۔ اس کا دل بھی رن ویر کے خیال سے دھکڑ پکڑ کر رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ بھی پریشان تھی۔

"ہمیں ہمّت سے کام لینے کے لیے کہہ رہے ہیں اور خود تین بار پاخانہ ہو آئے ہیں۔" اس نے بدبدا کر کہا۔

لالہ جی جنگلے کے پاس سے ہٹ کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد بیوی کو کھٹکا سا ہوا۔

"وِدّیا، جا دیکھ تو، تیرے پتاجی کیا کرنے گئے ہیں۔"

ودیا اٹھ کر پتاجی کے کمرے کی طرف گئی۔ لالہ جی اپنی ڈھائی گز کی دھوتی اتار کر پاجامہ پہن رہے تھے۔ ودیا ان ہی قدموں اپنی ماں کے پاس لوٹ آئی۔

"وہ تو کہیں باہر جا رہے ہیں؟"

"ہے بھگوان! ان کا تو کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔" اور ماں کھاٹ سے اتر کر سیدھی اپنے شوہر کے کمرے میں جا پہنچی۔ "دیکھو جی! میرا اگڑا مرا دیکھو گے اگر گھر سے باہر قدم رکھو گے۔"

"تو کیا کروں؟ اس کی سدھ لوں یا گھر پر بیٹھا رہوں؟"

"اپنی جوان بیٹی کو میرے پاس اکیلی چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ دیکھو تو کیسا قہر کا وقت آیا ہے۔" بیوی نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بیٹا باہر گیا ہوا ہے اور میں چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھا رہوں؟ کچھ تو ہوش کی بات کر۔"

"بیٹا تمھارا ہے تو میرا بھی تو ہے۔ اس وقت اسے ڈھونڈھنے جاؤ گے تو کہاں جاؤ گے؟ اسکول بند پڑا ہوگا، مندر سے لوگ کب کے جا چکے ہوں گے۔ اسے کہاں ڈھونڈتے پھرو گے؟ سمجھ دار لڑکا ہے، ضرور کہیں رک گیا ہوگا۔ شام کو اس کا دوست بھی کہہ گیا تھا کہ سب ہی لڑکے ماسٹر جی کے گھر میں ہیں۔ میں کتنا کہتی تھی، کوئی ضرورت نہیں بچے کو آریہ ویر بنانے کی۔ یہ پڑھے لکھے، کھیلے کودے، کھائے پیے۔ مگر نہیں تم نے میری ایک نہیں سنی۔ اس سے قواعد کرواتے رہے۔ لاٹھی چلانا سکھواتے رہے۔ مسلمانوں کا شہر ہے۔ ساری عمر ہمیں ان ہی کے

ساتھ رہنا ہے، سمندر میں رہ کر مگر مچھ سے بیر، کہاں کی عقل مندی ہے؟ اب دیکھ لو کیا ہو رہا ہے؟"
"بہت اُپدیش مت دیا کر۔ کیا بُرا کیا ہے، جو نیو دک سماج، میں جانے لگا ہے؟ ملک اور سماج کا کام کرنا ہی چاہیئے۔"
"کرو پھر ملک اور سماج کا کام اور بھگتو۔ لیکن میں تو اس وقت باہر نہیں جانے دوں گی۔ کچھ بھی کرو۔ میں تمھیں نہیں جانے دوں گی۔"
لالہ جی نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ انھیں اس بات کی امید نہیں تھی کہ آگ اتنی جلدی بھڑک اٹھے گی۔ انھیں مسلمانوں کے خلاف غصّہ تو اکثر آیا کرتا تھا لیکن اس بات کا بھی یقین تھا کہ انگریز انھیں دبا کر رکھیں گے۔
" اور لوگ بھی تو ہیں۔ افسروں کے ساتھ، ہمسایوں کے ساتھ، ہندو مسلمان سب ہی کے ساتھ میل ملاپ بنائے رکھتے ہیں۔ اپنے سمدھیوں کو ہی دیکھو۔ مسلمانوں کا ان کے گھر تانتا لگا رہتا ہے۔ تم نے افسروں کے ساتھ ہی بنا کر رکھی اور نہ ہمسایوں کے ساتھ۔"
اصل میں یہ بات جیسے ان کی بیوی نے ان ہی کے منھ سے چھین لی ہو، کیوں کہ عین اس وقت وہ بھی اسی بات کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ان کے سمدھی کی گہری دوستی شاہ نواز کے ساتھ تھی اور شاہ نواز بڑے اثر، رسوخ والا مسلمان تھا۔ اس کی موٹریں جگہ جگہ چلتی تھیں۔ اس کا پیٹرول کا ٹھیکہ تھا اور لالہ جی کے سمدھی کے ساتھ "نوالہ توڑ" جیسا رشتہ تھا۔ سب سے اچھا ہو، اگر اس کی مدد سے ہم لوگ کچھ دن کے لیے یہاں سے نکل جائیں۔ آگ بھڑک اٹھی ہے تو جلدی ختم نہیں ہو گی اور جانے کیا کیا گل کھلائے۔ بیٹی کو لے کر کچھ دن کے لیے صدر بازار چلے جائیں۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہو گا؟"
تب ہی دور سے نعروں کی گونج سنائی دینے لگی۔ "اللہ اکبر!" کا نعرہ اٹھا تو کہیں دور سے، مگر وہ بار بار مکانوں کی چھتوں سے دہرایا جانے لگا۔ مکانوں کی چھتوں پر چڑھے، آگ کا تماشا دیکھنے والے لوگ بھی اسے دہرانے لگے۔ ایک شور سا مچنے لگا۔ دور شوالے کی طرف سے بھی ہندو نعروں کی بھی آواز آتی، لیکن بہت کم اور دھیمی سی۔ آس پاس کہیں بھی اسے دہرایا نہیں جا رہا تھا۔ اس بات سے لالہ جی اور بھی پریشان ہو گئے۔
"سنو۔ رن ویر کی ماں! تم نانکو کو اوپر بلاؤ۔"
"کیوں کیا بات ہے؟"

"ہر بات کے سامنے 'کیوں' مت لگایا کرو۔ تم اسے بلاؤ۔ میں اس کے ہاتھ ایک خط لکھ کر بھیجنا چاہتا ہوں۔"

بیوی لالہ جی کے چہرے کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ "اس وقت اسے بھیجو گے؟ کہاں بھیجنا چاہتے ہو؟"

بیوی کا ذہن رن دیر کی طرف دوڑ رہا تھا۔

"یہ رن دیر کا پتہ لگائے گا؟ ماسٹر جی نے آپ کو کہلا تو بھیجا ہے کہ رن دیر اس کے ساتھ ہے۔ اب کیوں پریشان ہوتے ہو؟ بھگوان پر بھروسہ رکھو اور صبح تک چپ چاپ بیٹھے رہو۔"

"نہیں۔ میں اسے رن دیر کے پیچھے نہیں بھیجنا چاہتا۔ میرا ایک دوسرا کام ہے...."

"دیکھو جی! اس غریب کو کہاں بھیجو گے۔ باہر قہر ٹوٹ رہا ہے۔ اسے کوئی جانتا نہیں، پہچانتا نہیں۔"

"تو ہر بات میں ٹانگ کیوں اڑاتی ہے؟ میں نہیں چاہتا کہ وِدّیا کو لے کر ہم یہاں پڑے رہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں سمدھی کو خط لکھ رہا ہوں کہ اپنے دوست شاہ نواز سے کہہ کر ہمیں یہاں سے نکال لیں۔ جوان بیٹی گھر میں ہے۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔"

"یہ کام بھی تو کل صبح ہی ہو سکتا ہے۔ اس وقت تو نہیں ہو سکتا۔ کیا سمدھی تمھارا خط پاکر شاہ نواز کے گھر جائے گا؟ تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو جی!"

لیکن لالہ جی نہیں مانے۔ ایک بات ان کے دماغ میں بیٹھ جائے تو نکلتی نہیں۔

بیوی بڑبڑائی۔ پھر اونچی آواز میں بولی "یہ تمہارا خط کہاں پہنچائے گا۔ یہ کچھ نہیں جانتا۔"

"کیوں نہیں پہنچائے گا۔ اسے رکھا کس لیے ہے؟ گلیوں کے راستے سے دو منٹ میں سمدھیوں کے گھر پہنچ جائے گا۔ پاس ہی تو ہے۔"

"تم کیوں اتنی ضد پکڑ لیتے ہو جی؟ یہاں سے نکالو گے بھی تو دن کو ہی نکالو گے۔ اس وقت کسی کو لکھنے سے کیا فائدہ؟ سمدھیوں کو بھی پریشان کرو گے۔"

لالہ جی پل بھر کے لیے ٹھٹکے کھڑے رہے۔ پھر دھیمی آواز میں بولے "اگر ہو سکے تو آج ہی نکل جانا چاہتا ہوں۔"

"ایسی بھی کیا بات ہے جی؟ تمھیں ہمسایوں سے ڈر لگتا ہے، مجھے نہیں لگتا۔ بھگوان کا نام لو، اور چپ چاپ بیٹھے رہو۔" بیوی نے کہا لیکن اس کے بعد چپ ہو گئی۔

کوئی وجہ تو ہو گی جو یہ اتنے اتاؤلے ہو رہے ہیں۔ نانکو کے لیے بھی یہ ایک جوکھم تھا لیکن جوان بیٹے کا خیال آتے ہی ماں کی قوت ارادی بھی ڈگمگا گئی۔ کیا معلوم اسی

وقت یہاں سے نکل جانے میں بھلا ہو۔ بھگوان نہ کرے، اگر کچھ ہو گیا تو میں اسے کہاں چھپاتی پھروں گی۔

"اس سے کہنا کہ مسہری کا ڈنڈا ساتھ لیتا جائے۔" لالہ جی نے نانکو کے لیے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

خط دے کر لالہ جی نانکو کو دیر تک سمجھاتے رہے۔ "اگر دیکھو کسی گلی میں شور ہے تو دوسری گلی میں مڑ جانا۔ ہو سکے تو مندر میں سے چپراسی کو ساتھ لے لینا۔ اب جاؤ۔ دیر نہیں کرو۔ جیسے بھی ہو خط پہنچا کر آنا۔"

لیکن اس کے جانے سے پہلے بیوی پھر ایک بار بپھر کر بولی۔ "دیکھو جی، بھگوان کے سہارے آج کی رات پڑے رہو۔ کل جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ یہ بھی کسی ماں کا بیٹا ہے۔ اسے کیوں جلتی آگ میں دھکیلتے ہو؟"

"کچھ نہیں ہوگا کچھ نہیں ہوگا۔ میں جا سکتا ہوں تو کیا یہ نہیں ہو سکتا؟ اس کے پیروں میں مہندی لگی ہے...."

اسی وقت پچھلی گلی میں سے کسی کے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ آواز نزدیک آرہی تھی اور رفتہ رفتہ اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ اس رات میں گلی میں چلتے قدموں کی ہر آواز اونچی ہو گئی تھی اور کانوں کے ساتھ ساتھ دل سے بھی ٹکرا کر آواز پیدا کرتی تھی۔

لالہ جی چلتے چلتے رک گئے۔ ان کی ٹانگوں میں جیسے پانی بھر گیا تھا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ کیا رن ویر کہیں سے بھاگ کر آرہا ہے؟

بھاگتے قدموں کی آواز سے کون کسی کو پہچان سکتا ہے؟

اچانک کسی دوسرے آدمی کے بھاگتے قدموں کی بھی آواز آنے لگی۔ ایسا لگا جیسے کوئی آدمی گلی کا موڑ کاٹ کر گلی کے اندر آگیا ہے اور بھاگتے آدمی کے پیچھے بھاگنے لگا ہے۔

پھر اچانک اندھیرے کو چیرتی ہوئی آواز آئی۔

"بچاؤ.... بچا.... ؤ!"

لالہ جی کا جسم سر سے پیر تک لرز اٹھا۔ گلی کے پچھلے حصّہ میں اب ایک نہیں، دو تین بھاگتے آدمیوں کے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ یہ آوازیں چارپائی پر بیٹھی ماں اور اس کی بیٹی نے سنیں۔ پاس پڑوس کے گھروں کی چھتوں پر کھڑے لوگوں نے بھی سنیں۔ وہ سارے ماحول میں جیسے گونج رہی تھیں۔

"ب... چا... ؤ!"

پھر آواز آئی۔ چیختی سی آواز۔ کسی خوف زدہ، بدحواس آدمی کی آواز۔ اس آواز کو سن کر اپنے بیٹے کی آواز کو پہچاننا ممکن نہیں تھا، خوف سے بھاگتے ہوئے سب ہی لوگ ایک ہی جیسی آوازیں چلّایا کرتے ہیں۔

گلی میں کسی چیز کے پھینکنے کی آواز آئی۔ کوئی لاٹھی تھی یا پتھر تھا؟ کسی نے شاید بھاگتے آدمی کے پیچھے لاٹھی پھینکی تھی یا شاید کلہاڑی پھینکی تھی جو نزدیک ہی دیوار کے ساتھ ٹکرائی تھی اور پھر گلی کے فرش سے ٹکرا کر آواز پیدا کرتی آگے چلی گئی تھی۔

"پکڑو... اسے... ما... رو... اسے!"

پھر ایسا لگا "بچاؤ، بچاؤ" چلّانے والا آدمی ہانپتا ہوا گلی پار کر گیا اور گلی پار کرتے ہی اس کے قدموں کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ دھیمی پڑتی گئی جبکہ اس کا پیچھا کرنے والے قدموں کی آواز اونچی ہوتی جا رہی تھی۔

کیا اسے لاٹھی لگی نہیں تھی؟ کیا رن ویر پر کسی نے لاٹھی پھینکی تھی؟ کیا رن ویر بچ کر آ گیا ہے۔ کیا وہ ابھی دروازہ کھٹکھٹائے گا؟

پیچھا کرنے والے قدم گلی کے باہر چلے گئے تھے۔ لالہ جی کا دل دھک دھک کیے جا رہا تھا۔ ان کے کان دروازے پر لگے تھے کہ ابھی کوئی دروازہ کھٹکھٹائے گا لیکن کسی نے بھی دروازہ نہیں کھٹکھٹایا۔

لالہ جی کے قدموں میں پھرتی آ گئی۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے "چھجے" پر گئے تاکہ سڑک پر بھاگتے لوگوں کو دیکھیں۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ سامنے "کچے" گھر کی چھت پر عورتیں، مرد اور بچے کھڑے تھے۔ انھوں نے بھی یہ آوازیں سنی ہوں گی۔ سب ہی اطمینان سے کھڑے تھے۔ اسی وقت لگ بھگ "چھجے" کے نیچے تین آدمی سڑک سے گلی کی طرف واپس آتے دکھائی دیے۔ تینوں نے مشکیں باندھ رکھی تھیں۔ تینوں زور زور سے سانس لے رہے تھے اور تینوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔

"نکل گیا سکھڑا۔ اگر بھاگتا نہیں تو ہم اس کا پیچھا بھی نہیں کرتے۔" ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔ اور پھر اس کے قدم گلی کے اندر مڑ گئے اور آہستہ آہستہ دور ہونے لگے۔

لالہ جی نے اطمینان کا سانس لیا اور دوبارہ بیٹھک کے پیچھے ہاتھ باندھ کر ٹہلنے لگے۔ نانکو نے بھی مسہری کا ڈنڈا اٹھایا اور سیڑھیاں اتر کر دروازے کے پیچھے جا بیٹھا۔

10

دن کے اجالے میں شہر ادھ مرا سا پڑا تھا، گویا اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ منڈی ابھی تک جل رہی تھی، میونسپلٹی کے فائر بریگیڈ نے اس کے ساتھ لڑنا کب کا چھوڑ دیا تھا۔ اس میں سے اٹھنے والے دھوئیں سے آسمان میں سیاہی پھیل رہی تھی جبکہ رات کے وقت آسمان لال ہو رہا تھا۔ سترہ دکانیں جل کر راکھ ہو چکی تھیں۔

دکانیں بند تھیں۔ دودھ، دہی کی دکانیں کہیں کہیں کھلی تھیں اور ان کے قریب دو دو، چار چار آدمی کھڑے رات کے واقعات کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ مارکاٹ کے بارے میں افواہیں زیادہ تھیں۔ گوال منڈی والے کہتے، رتّا میں دنگا ہوا ہے۔ رتّا والے کہتے کمیٹی محلے میں دنگا ہوا ہے۔

نیا محلہ کے چوک میں ایک گھوڑا مرا ہوا پایا گیا تھا۔ سڑک کے باہر گاؤں کو جانے والی سڑک پر ایک ادھیڑ عمر کی لاش ملی تھی۔ کالج روڈ پر جوتوں کی ایک دکان اور ساتھ میں بیٹھنے والے درزی کی دکان لوٹ لی گئی تھی۔ ایک اور لاش شہر کے سرے پر ایک قبرستان میں ملی تھی۔ لاش کسی ادھیڑ عمر کے ہندو کی تھی اور اس کی جیب میں سے کچھ ریزگاری اور جہیز کے کپڑوں کی ایک فہرست بھی ملی تھی۔

محلّوں کے درمیان لکیریں سی کھنچ گئی تھیں۔ ہندوؤں کے محلّے میں اب مسلمان کو جانے کی ہمت نہیں تھی اور مسلمانوں کے محلّے میں ہندو سکھ اب نہیں آجا سکتے تھے۔ آنکھوں میں شک اور خوف نے گھر کر لیا تھا۔ گلیوں کے سرے پر اور سڑکوں پر جگہ جگہ کچھ لوگ ہاتھوں میں لاٹھیاں اور بھالے لیے ہوئے اور مشکیں باندھے چھپے بیٹھے تھے۔ جہاں کہیں ہندو اور مسلمان پڑوسی ایک دوسرے کے پاس کھڑے ہوتے تھے وہاں ایک ہی جملہ دہراتے تھے "بہت برا

ہوا ہے۔ بہت بُرا ہوا ہے۔" اس سے آگے بات چیت بڑھ ہی نہیں پاتی تھی۔ ماحول میں مردنی سی آ گئی تھی۔ سب ہی لوگ دل ہی دل میں جانتے تھے کہ یہ حادثہ یہیں پر ختم ہونے والا نہیں ہے۔ لیکن آگے کیا ہوگا، کسی کو معلوم نہیں تھا۔

گھر کے دروازے بند تھے۔ شہر کا کاروبار، اسکول، کالج، دفتر سب ہی ٹھپ ہو گئے تھے۔ سڑک پر چلتے آدمی کو ہر وقت اس بات کا احساس رہتا تھا کہ کھڑکیوں کے پیچھے، مکانوں کی اندھیری ڈیوڑھیوں، درازوں اور سوراخوں میں اس پر آنکھیں لگی ہیں، اس کا پیچھا کیے جا رہی ہیں۔ لوگ اپنے اپنے محلّے میں بند ہو گئے تھے۔ صرف افواہوں کے زور پر ایک دوسرے سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھے۔ کھاتے پیتے گھروں کے لوگ اپنے اپنے بچاؤ کی فکر میں الجھ گئے تھے۔ روزمرہ کے کام ٹھپ ہو گئے تھے۔ کانگریس کی پربھات پھیری اور تعمیری کام سب ہی ایک دن میں ختم ہو گئے تھے۔ پھر بھی صبح سویرے حسب معمول، جرنیل سڑکیں جیسے تیسے طے کرتا کانگریس دفتر کے سامنے پہنچ گیا وہاں پر تالا لگا دیکھ کر وہ پو پھٹنے تک ساتھیوں کا انتظار کرتا رہا لیکن جب وہ نہیں آئے تو نالی کے اوپر بنے چبوترے پر کھڑے ہو کر اس نے مختصر سی تقریر کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

"صاحبان! چوں کہ آج سب ہی بزدل لوگ چوہوں کی طرح گھروں میں گھسے بیٹھے ہیں، اس لیے مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج پربھات پھیری نہیں ہوگی۔ میں آپ سب سے معافی چاہتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ شہر میں امن برقرار رکھیں۔ یہ شرارت انگریز کی ہے جو بھائی بھائی کو آپس میں لڑاتا ہے۔ جے ہند!"

اور وہ چبوترے سے اتر کر لیفٹ رائٹ کرتا اندھیرے میں کھو گیا تھا۔

ادھر رن ویر رات کو گھر واپس نہیں آیا تھا لیکن ماسٹر دیو ورت نے اس کی سلامتی کی خبر لالہ لکشمی نرائن کو جیسے تیسے بھجوا دی تھی۔ اور لالہ جی ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کریں، کہاں جائیں کہ شاہ نواز خود ہی ان کے پاس پہنچ گیا۔ دراز قد، بارعب، شاہ نواز اپنی گہری نیلے رنگ کی بیوک گاڑی لے کر آیا تھا۔ شاہ نواز کے ساتھ لالہ جی کی جان پہچان تو ضرور تھی لیکن بے تکلفی نہیں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لالہ جی، ان کی بیوی اور بیٹی اسی موٹر میں بیٹھ کر محلّے سے نکل گئے تھے۔ اکیلا نانکو مکان کی حفاظت کے لیے پیچھے چھوڑ

دیا گیا تھا۔

"مستعدی سے چوکیداری کرنا۔ سوئے نہیں رہنا نانکو! ہم سارا گھر تم پر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔"

اور موٹر روانہ ہوگئی تھی۔ نیلی بیوک گاڑی سنسان سڑکوں پر بل کھاتی چلی جاتی تھی۔ سب ہی دیکھ رہے تھے کہ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کی جگہ طرّہ دار پگڑی پہنے شاہ نواز بیٹھا ہے۔ دوستوں کا دوست، صاف دمکتا گورا چہرہ۔ اس کی بغل میں لالہ لکشمی نرائن بیٹھے ہیں اور پیچھے زنانی سواریاں بیٹھی ہیں۔ یوں نکل کر جانا بڑی ہمّت کا کام تھا۔ جب کہیں سڑک پر لوگوں کا اجتماع نظر آتا، لالہ جی دوسری طرف دیکھنے لگتے تھے جب کہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی لالہ جی کی بیوی شاہ نواز کو دعائیں دے رہی تھیں۔ ایسے لوگوں کے دل میں بھگوان بستا ہے جو مصیبت میں لوگوں کا ہاتھ تھامتے ہیں۔

اور ذرا دیر بعد بیوک گاڑی، لالہ جی اور ان کے خاندان کو صدر بازار میں ان کے کسی رشتہ دار کے گھر چھوڑ دینے کے بعد پھر شہر کی سڑکوں پر بڑھتی چلی رہی تھی۔ اب شاہ نواز سیدھا اپنے جگری دوست رگھوناتھ کے ڈیرے پر جا رہا تھا۔ اسے اپنے بچاؤ کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اس کی بیوک موٹر سب ہی جگہ جاتی تھی۔

جامع مسجد کے سامنے سے ہوتی ہوئی بیوک "مائی ستّو" کے تالاب کی طرف جا رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کے مکان چھوٹے چھوٹے تھے۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں جن کے آگے لاٹھیوں کے سہارے سائبان کھڑے کیے گئے تھے، کھنڈر سی لگ رہی تھیں۔ یہ مسلمانوں کا علاقہ تھا۔ آدھ لوٹا پُل پار کرنے کے بعد موٹر سیدوں کے محلّے کی طرف بڑھ چلی۔ دائیں بائیں کے مکانات اونچے ہونے لگے۔ چھجّوں والے دو منزلہ، تین منزلہ گھر۔ نیچے آئے بڑھے چبوترے۔ کواڑوں، کھڑکیوں میں رنگین شیشے۔ یہاں ہندو وکیل اور ٹھیکیدار رہتے تھے۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر سب ہی ہندو تھے۔ شاہ نواز کا بعض کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ بے تکلفی تھی، دوستی تھی، یاری تھی۔ وہ جانتا تھا اس وقت جھروکوں میں لگی آنکھیں اس کی طرف دیکھے جا رہی ہیں۔ لیکن اسے اس بات کا بھی اعتماد تھا کہ سب ہی آنکھیں اسے پہچانتی ہیں پھر بھی اس نے موٹر کی رفتار تیز کر دی۔

"مائی ستّو" کے تالاب کے پاس پہنچ کر وہ دائیں طرف مڑ گیا۔ وہ علاقہ بالا جلا نالا تھا۔

سب ہی طرح کے لوگ رہتے تھے۔ دکانوں کی ایک لمبی قطار جوتے بنانے والوں کی تھی۔ یہ لوگ ہوشیارپور سے آئے تھے۔ سب ہی سکھ تھے۔ آج سب ہی دکانیں بند تھیں۔ آگے چل کر چند کچے مکان تھے، جن کی دیواروں پر گوبر کی تھاپیاں لگی تھیں۔ یہ علاقہ بھی سنسان پڑا تھا۔ یہ بھنگیوں کی بستی تھی۔ شاہ نواز کی موٹر پھر دھیمی ہوگئی۔ یہاں مصیبت کا سایہ اتنا گہرا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ بجلی کے کھمبے کے اردگرد دو بچے، ایک دوسرے کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے گھوم رہے تھے۔ ان ہی کے نزدیک بچوں کی ایک اور ٹولی کھیل رہی تھی۔ پاس سے گزرتے ہوئے شاہ نواز نے دھیان سے ان کی طرف دیکھا۔ بچے گھیرا بنائے کھڑے تھے اور گھیرے کے اندر ایک چھوٹی سی لڑکی اپنا کرتا اوپر کھینچ کر لیٹی ہوئی تھی اور اس کی جانگھوں پر ایک ننھا سا لڑکا بیٹھا تھا، اس نے بھی اپنا کرتا اوپر کو چڑھا رکھا تھا۔ آس پاس کھڑے سب ہی بچے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ ”کم ذات! انھیں اور کوئی کھیل نہیں سوجھا!“ شاہ نواز بڑبڑایا اور ہنس کر آگے بڑھ گیا۔ اس علاقے میں ابھی تک تناؤ نہیں پیدا ہوا تھا۔ اگر تھا تو نظر نہیں آتا تھا۔

شاہ نواز کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے یہ نہیں لگتا تھا کہ اس کے دل میں کبھی اچھے یا برے خیالات اٹھتے ہوں گے۔ بارعب جوان، چھاتی تنی رہتی، طرہ لہراتا رہتا، بوٹ چمچماتے رہتے۔ ہمیشہ دھوبی کے دھوئے سرسراتے کپڑے پہنتا تھا۔ ”ایمان سے، یہ کسی لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکرا دے تو وہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ یہ بات اس کے بارے میں کہی جاتی تھی۔ لیکن یہ برسوں پہلے کی بات تھی۔ اب وہ سنجیدہ، متین، دنیادار آدمی تھا۔ پیٹرول کے دو پمپوں کا مالک، اس کی موٹر لاریاں چلتی تھیں، لیکن پھر بھی ملنسار اور دوست نواز آدمی تھا۔ ہنس مکھ اور تیز طرار پہلے کی طرح اب بھی تھا۔

دوست نوازی اس کا ایمان تھی۔ جب شہر میں گڑبڑ شروع ہوئی تھی اور وہ رگھوناتھ کی خیریت معلوم کرنے گیا تھا تو اس نے رگھوناتھ کی بغل میں بیٹھنے والے نانبائی سے کہا تھا، ”دیکھ فقیرے! دونوں کان کھول کر سن لے۔ اگر میرے یار کے گھر کو کسی نے بری نظر سے دیکھا تو میں تجھے پکڑوں گا۔ کوئی اس گھر کے پاس

نہ آنے پائے۔"

موٹر اب بڑی سڑک پر آگئی تھی۔ یہ علاقہ کشادہ تھا۔ سڑک چوڑی تھی اور آس پاس کے گھر سڑک سے کافی دور تھے۔ علاقہ مسلمانی تھا اور موٹر دھیمی رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ بھابھڑ خاں کی طرف جانے والی سڑک کے سرے پر مولی داد کھڑا تھا۔ پیچھے ایک دکان کے چبوترے پر پانچ سات آدمی مشکیں باندھے اور لاٹھیاں اور بھالے ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے۔ مولی داد آج بھی اپنی نرالی پوشاک میں تھا، خاکی رنگ کی برجس، گلے میں ہرے رنگ کا ریشمی رومال۔ شاہ نواز کی موٹر کو آتے دیکھ کر آگے بڑھ آیا تھا۔

"کیا خبر ہے؟" شاہ نواز نے موٹر روکتے ہوئے پوچھا۔

"خبر کیا ہے خان جی۔ ادھر پیچھے والے محلّے میں کافروں نے ایک غریب مسلمان کو مار ڈالا ہے۔" یہ کہتے ہوئے مولی داد کے ہونٹوں پر غصّہ کی لہر دوڑ گئی۔

مولی داد کی نگاہوں میں غصّہ تھا، جیسے وہ کہہ رہا ہو، تم تو کافروں سے بغل گیر ہوتے ہو، خان جی! ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہو جبکہ مسلمان مر رہے ہیں۔ لیکن وہ کچھ نہیں بولا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی پہنچ اس جگہ تک نہیں ہو سکتی جہاں تک شاہ نواز کی ہو سکتی ہے۔ شاہ نواز کا اٹھنا بیٹھنا ڈپٹی کمشنر کے ساتھ بھی تھا، شہر کے رئیسوں کے ساتھ تھا جب کہ مولی داد برسوں سے کمیٹی کے آس پاس ہی چکر کاٹ رہا تھا۔

"پانچ کافر ہم نے بھی کاٹے ہیں۔ ان کی ماں کی۔"

شاہ نواز نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور موٹر آگے بڑھ گئی

وہ آگے تھوڑی دور گیا ہو گا کہ دائیں طرف کی ایک گلی میں سے اچانک بہت سے لوگ نمودار ہوئے۔ خاموشی سے چلتے ہوئے یہ لوگ سڑک پار کرنے لگے۔ کوئی جنازہ تھا۔ آگے آگے حیات بخش چلا جا رہا تھا۔ سر پر کلاہ، سفید قمیص اور شلوار۔ لوگوں کے پیروں کی دھیمی دھیمی آہٹ ہوا کو جیسے تھپکیاں دیتی جا رہی تھی۔ شاہ نواز سمجھ گیا کہ وہ اسی مسلمان کی میّت ہو گی۔ جنازے کے پیچھے دو چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی جا رہے تھے جو ضرور اس کے بیٹے ہوں گے۔

تھوڑی دیر میں سڑک صاف ہو گئی اور شاہ نواز نے گاڑی پھر چلا دی۔

پھاٹک طے کرکے اس نے موٹر ایک درخت کے نیچے کھڑی کردی اور چابی ہلاتا ہوا بنگلے کی طرف بڑھنے لگا۔ کھڑکی کے پردے کے پیچھے کھڑی رگھوناتھ کی بیوی نے اسے سب سے پہلے دیکھا اور پہچانتے ہی اسے دلی مسرت ہوئی۔

"او کراڑ! کھول دروازہ" باہر سے آواز آئی۔ رگھوناتھ کی بیوی لپک کر باتھ روم کی طرف گئی۔

"شاہ نواز تم سے ملنے آیا ہے" اس نے دروازے کے باہر سے شوہر کو پکارتے ہوئے کہا "میں اسے بٹھاتی ہوں۔ تم آؤ۔"

لیکن دروازہ کھلنے سے پہلے ہی شاہ نواز پھر سے بولنے لگا "اوئے بابو! بنگلے میں رہنے لگا ہے تو دروازہ ہی نہیں کھولتا" پھر بھابی کو سامنے کھڑا دیکھ کر جھینپ سا گیا" بھابی سلام! کدھر ہے میرا یار؟" اس نے کہا اور نشست گاہ میں داخل ہو گیا۔

رگھوناتھ کی بیوی نے بتایا کہ رگھوناتھ باتھ روم میں تھا' اور شاہ نواز کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہاں کیا حالت ہے بھابھی؟ کوئی تکلیف تو نہیں؟ اچھا کیا' وہاں سے نکل آئے۔"

"اچھا ہے' لیکن اپنا گھر تو اپنا گھر ہی ہوتا ہے۔ اب نہ جانے اس میں جانا ہو گا یا نہیں۔" یہ کہتے کہتے رگھوناتھ کی بیوی کی آنکھیں بھر آئیں۔

شاہ نواز بھی جذباتی سا ہو گیا۔ روؤ نہیں بھابی۔ اگر میں زندہ رہا تو تم لوگ ضرور پھر اپنے گھر میں جاؤ گے۔ بے فکر رہو۔"

رگھوناتھ کی بیوی شاہ نواز سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ اس کے دوستوں میں سے یہی ایک مسلمان دوست تھا جس کے سامنے وہ بے جھجک آجاتی تھی۔ رگھوناتھ اس بات پر فخر کرتا تھا کہ اس کا سب سے قریبی دوست ایک مسلمان ہے۔

"فاطمہ کو نہیں لائے جب آتے ہو اکیلے چلے آتے ہو۔"

"شہر میں گڑبڑ ہے بھابی۔ تم کیا سمجھتی ہو' میں سیر کو نکلا ہوں؟"

"تم آسکتے ہو تو وہ کیوں نہیں آسکتی؟ موٹر میں تو وہ بھی بیٹھ سکتی تھی۔"

اسی وقت رگھوناتھ آ گیا۔

"ادیابو، تجھے یہاں بھی ٹٹیاں لگی ہیں، ادھر سے بھاگ کے آیا ہے کافر، اور یہاں بھی ٹٹیاں کرنے لگا ہے۔"

اور دونوں بغل گیر ہو گئے۔ شاہ نواز کا دل پھر جذبات میں ڈوب گیا۔" میرے اس یار پر تو میری جان بھی قربان ہے۔ اسے کوئی ہاتھ لگا کر تو دیکھے۔ اس کی چمڑی ادھیڑ دوں۔"

بھابی باہر جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو شاہ نواز نے اسے روک دیا۔" کہاں جا رہی ہو بھابی؟ میں کھانا وانا نہیں کھاؤں گا۔"

"کیوں؟ کھانا کیوں نہیں کھاؤ گے؟"

" یہ تو بولتا ہی رہے گا جانکی، تم کھانا تیار کرو۔" رگھوناتھ بولا۔

"جا جا۔ بھنڈی کھلائے گا۔ میں بھنڈی نہیں کھاتا۔ بھابی میرے لیے کچھ نہیں بنانا۔"

لیکن جانکی جا چکی تھی۔ اس نے پیچھے سے آواز دی۔" خدا کی قسم بھابی۔ میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔ مجھے جلدی جانا ہے۔ بس دو منٹ کے لیے آیا ہوں۔"

" کھانا نہیں کھاؤ گے، چائے تو پیو گے؟" بھابی کمرے کی دہلیز پر لوٹ آئی تھی۔

" یہ تو میں پہلے سے جانتا تھا کہ تم کھانا نہیں کھلاؤ گی۔ اچھا تم چائے ہی پلا دو۔"

دونوں دوست بیٹھ گئے۔ رگھوناتھ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔" بہت گڑبڑ ہے، دل کو بڑا دکھ ہوتا ہے۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے۔"

لیکن اچانک ایسا لگا کہ اس جملے سے دونوں کے درمیان دوری سی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے آپس کے رشتے کی بات اور تھی، ہندو مسلمان کے رشتے کی بات دوسری تھی۔ اس جملے سے گویا رگھوناتھ نے آپسی رشتے کے ساتھ فرقہ وارانہ رشتے کو جوڑنے کی کوشش کی تھی جس کے بارے میں دونوں کے الگ الگ خیالات تھے۔

" سنا ہے دیہات میں بھی فسادات شروع ہو گئے ہیں۔" رگھوناتھ نے کہا۔ لیکن اس معاملے پر زیادہ بات چیت کی گنجائش نہیں تھی، دونوں عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگے۔ یہ معاملہ ان کی دلی گفتگو پر کہرے کی چادر کی طرح بچھ گیا تھا۔

"چھوڑ یار بو! تو اپنی بات کر۔" شاہ نواز نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ جانتا ہے، کل میری کس سے ملاقات ہوگئی؟ بھیم سے۔" شاہ نواز نے جھک کر کہا۔

"کون سا بھیم؟" رگھوناتھ نے پوچھا اور پھر دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ بھیم ان کا بچپن کے زمانے میں کلاس فیلو رہا تھا، اور کسی چھوٹے سے ڈپٹی اسسٹنٹ سٹی پوسٹ ماسٹر، کا بیٹا تھا، اور اسی نام سے اپنا تعارف کراتا تھا۔ اسی وجہ سے سب ہی دوست اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

"یہیں رہتا ہے کافر، دو سال سے۔ پہلے کبھی ملا ہی نہیں۔" شاہ نواز نے کہا اور پھر تالی بجا کر ہنس دیا۔" میں نے دور سے ہی اسے پہچان لیا۔ میں نے زور سے کہا۔ "ڈپٹی اسسٹنٹ سٹی پوسٹ ماسٹر صاحب!" کمبخت کھڑا ہو گیا لیکن ملا بڑے پیار سے۔"

بھابی چائے لے آئی تھی، میز پر رکھتے ہوئے بولی۔" مجھے آپ سے ایک کام ہے خان جی۔"

اس کے آجانے سے دونوں کو اطمینان سا ہوا۔ فسادات کے بارے میں بات کرتے وقت دونوں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہے تھے۔ دو آدمی مل بیٹھیں اور اس خوفناک صورت حال کے بارے میں بات چیت نہ کریں، یہ بھی عجیب سا لگتا تھا۔ بچپن کے ہنسی مذاق اس پس منظر میں کچھ کھوکھلے لگنے لگے تھے۔

"کہو نا بھابی۔"

"اگر تکلیف نہ ہو تب ہی۔"

"تم کہو بھی۔"

"میرے اور میری جیٹھانی کے زیوروں کا ایک ڈبا گھر میں پڑا ہے۔ وہ نکلوانا ہے جب آئے تھے تو تھوڑا سا سامان لے کر چلے آئے۔ میں کچھ بھی ساتھ نہیں لائی۔"

"اس میں کیا مشکل ہے بھابی۔ چھوٹا سا کام ہے۔ کہاں رکھے ہیں؟"

"ادھ چھتی والی کوٹھری میں۔"

شاہ نواز ان کے گھر کے کونے کونے سے واقف تھا۔ دوستوں میں یہی ایک، دوست گھر کے اندر آسکتا تھا۔

"اس پر تو تالا چڑھا ہو گا، اتنا بڑا سکّے کا تالا۔"

"میں چابیاں دیتی ہوں۔ جگہ بھی سمجھا دوں گی۔"

"نکال لاؤں گا۔ آج ہی نکال لاؤں گا۔"

"ملکھی وہاں پر ہو گا، وہ تالا کھول دے گا۔"

"ملکھی وہیں پر ہے۔ میں صبح اس طرف چکّر لگا کر آیا ہوں۔ اسے خبر دار کرتا رہتا ہوں۔"

"کھانا وانا کہاں کھاتا ہے؟"

"سارا گھر اس کے پاس ہے۔ وہیں رسوئی میں کھانا بنا لیتا ہو گا، اور کیا؟" رگھوناتھ بولا۔

"رسد تو اتنی ہے کہ چھ مہینے کھائے تو ختم نہیں ہو گی۔" رگھوناتھ کی بیوی نے کہا۔ پھر شاہ نواز کی طرف دیکھ کر بولی، "پھر لاؤں چابیاں؟"

شاہ نواز پھر جذباتی ہو گیا، اسے فخر کا احساس ہوا۔ ہزاروں کے زیورات کی چابیاں بھابی میرے ہاتھ میں دے رہی ہیں۔ مجھے اپنا سمجھتی ہیں تب ہی تو۔

بھابی چابیاں کھنکاتی واپس آئی۔

"اور جو میں تمھارا زیور ہضم کر جاؤں بھابی؟"

"تم سے زیور اچھا ہے خان جی؟ تم اسے پھینک بھی آؤ تو میں 'سی' نہیں کروں گی۔ میں کہوں گی تمھاری بلا سے۔"

اور پھر گچھے میں سے چابیاں دکھانے اور سمجھانے لگی۔

تھوڑی دیر بعد شاہ نواز اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں دوست باہر آئے اور چپ چاپ چلتے ہوئے موٹر تک پہنچے۔

"کس منھ سے تمھارا شکریہ ادا کروں شاہ نواز۔ تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔" رگھوناتھ کے دل سے اپنے آپ جیسے احسان مندی کے الفاظ نکل آئے تھے۔

"او، چپ اوئے کراڑ!" شاہ نواز نے کہا۔ "جا گھر جا کر بیٹھ۔ ٹٹّی کر۔" اس نے کہا اور موٹر کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ لیکن رگھوناتھ ٹھٹکا کھڑا رہا۔

"جا، جانا، ادھر میرا مغز کیوں چاٹ رہا ہے؟"
رگھوناتھ پھر بھی کھڑا رہا۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
جانا"۔ اب جا بھی۔ میرا ہاتھ گندہ مت کر۔ جا کسی واقف کار سے بات کر۔ جا جا کیوں کھڑا مغز چاٹ رہا ہے؟ تیرے جیسے بہت دیکھے ہیں۔"
اور پھر شاہ نواز نے موٹر اسٹارٹ کر دی۔

دوپہر ڈھل چکی تھی جب زیورات کا ڈبّا لینے کے لیے شاہ نواز رگھوناتھ کے آبائی مکان پر پہنچا۔
ملکھی نے دروازہ دیر سے کھولا۔ "کون ہے جی؟"
"کھولو دروازہ۔ میں ہوں شاہ نواز۔"
"کون جی؟
"کھولو، کھولو۔ میں شاہ نواز ہوں۔"
"جی آیا جی، اندر سے تالا لگا ہے جی۔ ابھی لاتا ہوں چابی، انگیٹھی پہ رکھی ہے۔"
سڑک کے پار فیروز کھال والے کا گودام تھا۔ فیروز اپنے گودام کے چبوترے پر کھڑا کھالوں کی دو گانٹھوں کو ٹھکانے لگا رہا تھا۔ شاہ نواز نے اس کی طرف رخ کیا تو وہ بت کی طرح شاہ نواز کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ شاہ نواز نے منھ پھیر لیا لیکن اسے محسوس ہوا جیسے فیروز اب بھی اس کی طرف نفرت سے دیکھے جا رہا ہے۔
'آج بھی ہندوؤں کے گھروں کے دروازے کھٹکھٹا رہے ہو'، جیسے وہ دل ہی دل میں کہہ رہا ہو۔
ایک تانگہ قریب سے گزرا۔ شاہ نواز نے گھوم کر دیکھا۔ چودھری مولی داد اپنی انوکھی پوشاک پہنے، برجس اور گلے میں ہرے رنگ کا ریشمی رومال — کھلے تانگے میں مسلم علاقے کا دورہ کر رہا تھا۔ شاہ نواز کو دیکھ کر وہ ہنس دیا، اور ہاتھ ضرورت سے زیادہ اونچا اٹھا کر "سلام علیکم" کہا۔
شاہ نواز جھینپ سا گیا۔ اسے نوکر پر غصّہ آیا۔ وہ کیوں دروازہ کھولنے میں دیر لگا رہا ہے۔ پھر اندر سے تالا کھلنے کی آواز آئی۔ پھر ملکھی نے دروازے کا ایک پٹ آہستہ سے تھوڑا سا

سرکایا، اور شاہ نواز کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔ شاہ نواز نے پَیر کی ٹھوکر سے دروازہ کھول دیا اور اندر چلا گیا۔

"بند کردو۔ دروازہ۔"

"جی۔ خان جی۔"

گھر کا تاریک برآمدہ طے کرتے ہوئے اسے اپنے پن کا احساس ہوا۔ اس تاریک برآمدے میں وہ بہت دن بعد آیا تھا۔ گھر کی جانی پہچانی مہک اسے اچھی لگی۔ برسوں پہلے جب وہ رگھوناتھ کے ساتھ برآمدہ طے کرکے اندر آیا کرتا تھا تو رگھوناتھ کی چھوٹی بیٹی منھ میں انگلی دبائے دیر تک اس کی طرف تاکتی رہتی تھی۔ پھر دونوں باہیں اٹھا دیتی تھی کہ مجھے گود میں اٹھالو۔ جب کبھی وہ آتا تو وہ بچّی بھاگتی ہوئی برآمدے کے سرے پر آجاتی تھی اور دونوں باہیں اٹھاکر ہنسنے لگتی تھی۔ اسی برآمدے کو طے کرتے وقت گھر کی جوان عورتیں دروازے کی اوٹ سے اندر بھاگ جایا کرتی تھیں۔ یہ بھی برسوں پہلے کی بات تھی جب رگھوناتھ نے اسے گھر کے اندر لانا شروع کیا تھا۔ ان ہنستی عورتوں میں سے کسی کی نظر شاہ نواز پر پڑ جاتی تو وہ بھاگنا چھوڑ کر رک جاتی۔

"ہائے آپ ہیں۔ میں نے سوچا، نہ جانے کون ہے۔"

شاہ نواز کا دل بھر آیا۔ اس گھر میں اس نے رگھوناتھ اور اس کے خاندان کے ساتھ بڑی اچھی شامیں گزاری تھیں۔ اس کے وہاں پہنچتے ہی رگھوناتھ کے چھوٹے بھائی کی بیوی اس کے لیے انڈوں کا آملیٹ بنانے چلی جاتی تھی۔ گھر کے سب ہی لوگ جانتے تھے کہ شاہ نواز کو آملیٹ پسند ہے۔ اور آہستہ آہستہ گھر کے سب ہی لوگ آنگن میں آکر بیٹھنے لگتے تھے۔

"خان جی، گھر کے سب لوگ سُکھ سے ہیں نا، جی۔" ملکھی نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا۔

تب ہی خان کا دھیان ملکھی کی طرف گیا۔ ملکھی ہاتھ جوڑے گھگھیاتا سا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ملکھی کی گندلی آنکھیں اور باتیں کرنے کا گڑگڑاہٹ بھرا انداز، اور پچکا ہوا جسم اسے کبھی بھی پسند نہیں آیا تھا۔ اس وقت بھی ملکھی کی آنکھیں گدلی تھیں۔ کبھی کبھی گھر کے سب ہی لوگ مل کر ملکھی سے مذاق کرتے تو وہ شرما کر باہوں سے اپنا منھ چھپا لیتا تھا۔ — بالکل عورتوں کی طرح، اور سب ہی لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑتے تھے۔ تب وہ

شاہ نواز کو بُرا نہیں لگتا تھا لیکن عام طور پر وہ اسے سلسی چھپکلی جیسا لگتا تھا۔ نہ جانے ملکھی کہاں سے آیا تھا۔ نہ پنجابی تھا، نہ گڑھوالی۔ اپنے گھسے ہوئے چھوٹے چھوٹے دانتوں کے بیچ میں سے وہ کسی کھچڑی زبان کے لفظ پیس پیس کر نکالتا رہتا تھا۔

صحن کے بیچوں بیچ تین اینٹیں رکھ کر ملکھی نے اپنا چولہا بنا لیا تھا۔ اس کی راکھ آنگن میں جگہ جگہ بکھری پڑی تھی۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ بیڑیوں کے ٹکڑے جگہ جگہ پڑے تھے۔

"تو رسوئی کے اندر ہی اپنی ہانڈی کیوں نہیں پکاتا؟" شاہ نواز نے پوچھا اور ملکی سر ٹیڑھا کر کے مسکرا دیا۔

"اکیلا ہوں صاحب جی۔ یہیں پر اپنی دال چڑھا لیتا ہوں۔"

"رسد کافی ہے نا؟ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"بہت ہے، خان جی۔ ساتھ والا نان بائی ہے نا۔ وہ بھی روز پوچھ لیتا ہے، آپ ہی اسے بول کر گئے تھے۔"

"کون سا نان بائی؟"

صاحب، وہ جو نلے کے پاس بیٹھتا ہے۔ وہ میرے لیے بیڑی کے پیکیٹ بھی پھینک دیتا ہے، بہت بھلا آدمی ہے۔" اور وہ کھی کھی کر کے ہنس دیا۔

صحن میں، عین رسوئی کی بغل میں سے سیڑھیاں اوپر کو چلی گئی تھیں۔ شاہ نواز نے سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے صحن کی طرف دیکھا۔ بڑے کمرے کا دروازہ جو صحن میں کھلتا تھا، بند پڑا تھا۔ کمرے کے اندر کیا ہے، وہ ایک ایک چیز کو جانتا تھا۔ آتش دان پر رگھوناتھ کی ماں کا فوٹو رکھا ہے۔ کمرے میں دو کھاٹیں اور ایک اونچا پلنگ بچھے ہیں۔ بند دروازہ دیکھ کر اسے بڑا سونا سونا لگا۔ دروازے کے باہر دہلیز کے ساتھ ملکھی کی چلم الٹی پڑی تھی۔ پاس ہی ایک میلا سا چیتھڑا پڑا تھا۔

"تو یہاں بیٹھا کیا کرتا رہتا ہے۔ فرش پر جھاڑو بھی نہیں لگاتا۔"

"اب کیا جھاڑو لگانا صاحب جی! اب تو وہ چلے گئے۔" ملکھی نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

شاہ نواز کو ایسا لگا کہ جب وہ دونوں باتیں کرتے ہیں تو جیسے گنبد میں سے آواز آتی ہے،

اور جب وہ بولنا بند کر دیتے ہیں تو چاروں طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔

"سامان والی کوٹھری بیچ والی چھت پر ہے نا؟"

"جی ادھر، سیڑھیوں کے سامنے جہاں بڑے ٹرنک رکھے ہیں۔"

اور ملکھی شاہ نواز کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

چابیوں کے گچھے میں کچھ نہیں تو پندرہ چابیاں ہوں گی۔ چند ایک چھوٹی چھوٹی پیتل کی چابیاں تھیں۔ بھابی نے پہلے بڑے تالے کی چابی الگ کر کے دکھائی تھی، پھر الماری کے تالے کی چھوٹی سی پیتل کی چابی دکھائی تھی۔ "یہ چابی ہے خان جی، بھولنا نہیں۔"

لیکن شاہ نواز کو اب وہ چابی ڈھونڈھنے میں دقت ہو رہی تھی۔ "اس بڑے تالے کی کون سی چابی ہے، تمھیں کچھ معلوم ہے؟"

"ہاں صاحب جی! میں بتاتا ہوں۔"

اور ملکھی چابی کے گچھے پر جھک کر یوں ڈھونڈھنے لگا جیسے کوئی منیم بہی کھاتے پر جھک کر اعداد و شمار پڑھتا ہے۔ وہ لے دے کر شاہ نواز کی کہنی سے کچھ اوپر تک جاتا تھا۔ شاہ نواز کو پگڑی کے نیچے ملکھی کی چٹیا جھانکتی نظر آئی۔ بائیں کان کے ٹھیک اوپر کنکھجورے کی طرح نکلی ہوئی تھی۔ شاہ نواز کو جھرجھری سی ہوئی۔

ملکھی نے تالا کھول دیا۔ کوٹھری کے اندر گھٹن تھی، اندھیرا تھا۔ ملکھی نے آگے بڑھ کر کوٹھری کی ایک کھڑکی کھول دی، جو گھر کے پچھواڑے کی طرف کھلتی تھی اور جہاں سے ایک مسجد کا پورا صحن دکھائی دیتا تھا۔ کھڑکی کھل جانے سے کوٹھری کے اندر کی سب ہی چیزیں صاف نظر آنے لگیں۔

کوٹھری میں گھٹن تھی لیکن اس سے کہیں زیادہ عورتوں کے کپڑوں کی مہک تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ تینوں بھائیوں کی بیویاں گھر چھوڑنے سے پہلے اپنے کپڑے جیسے تیسے لپیٹ کر کوٹھری میں ٹرنکوں کے اوپر پھینک گئی تھیں۔ کوٹھری صندوقوں اور ٹرنکوں سے ٹھسا ٹھس بھری تھی۔

ٹرنکوں کے بیچ میں سے اپنا راستہ بناتا ہوا وہ اس الماری تک جا پہنچا جس میں زیوروں کا ڈبا رکھا تھا۔

اسی لمحہ اس کی نظر کھلی ہوئی کھڑکی میں سے مسجد کے صحن میں پڑی۔ وضو کرنے

کے حوض کے پاس بہت سے آدمی بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کے درمیان کسی آدمی کی لاش رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس جنازے کا منظر بھی گھوم گیا جب وہ موٹر میں رگھوناتھ کے گھر جا رہا تھا۔ وہ دیر تک کھڑکی میں سے مسجد کی طرف آنکھیں لگائے دیکھتا رہا۔

ڈبا نکالنے میں دیر نہیں لگی۔ نیلی مخمل سے ڈھکا ڈبا، جو گھر کی کسی عورت کا سنگھار بکس تھا، اس نے بڑی احتیاط سے نکال لیا اور الماری کو تالا لگا دیا۔

باہر آنے پر دونوں سیڑھیاں اترنے لگے۔ ملکھی کے ہاتھوں میں چابیوں کا گچھا تھا اور وہ آگے آگے اتر رہا تھا۔ ڈبے کو دونوں ہاتھوں سے اٹھائے شاہ نواز اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ تب ہی اچانک اس کے اندر بھبھوکا سا اٹھا۔ نہ جانے ایسا کیوں ہوا؟ ملکھی کی چٹیا پر نظر پڑنے کی وجہ سے، مسجد کے صحن میں لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر، یا اس وجہ سے کہ جو کچھ وہ پچھلے تین دن سے دیکھتا یا سنتا آیا تھا، وہ زہر کی طرح اس کے اندر گھلتا رہا تھا، شاہ نواز نے اچانک بڑھ کر ملکھی کی پیٹھ پر زور سے لات جمائی۔ ملکھی لڑھکتا ہوا گرا، اور سیڑھیوں کے موڑ پر سیدھا دیوار سے جا ٹکرایا۔ جب وہ نیچے گرا تو اس کا ماتھا پھوٹا ہوا تھا اور پیٹھ ٹوٹ چکی تھی کیوں کہ وہ جہاں گرا وہاں سے اٹھ نہیں پایا۔ شاہ نواز اس کے پاس سے نکل کر آیا تو ملکھی کا سر نیچے کی طرف لٹک رہا تھا اور ٹانگیں آخری دو سیڑھیوں سے لٹک رہی تھیں۔ شاہ نواز کا غصّہ جس کی وجہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا، برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ پاس سے گزرتے ہوئے اس کا دل چاہا کہ پیر اٹھا کر ملکھی کے سر پر دے مارے، کیڑے کو کچل ڈالے، لیکن سیڑھیوں کے موڑ پر اس کو اپنا توازن کھو بیٹھنے کا ڈر تھا۔

نیچے صحن میں پہنچ کر اس نے ایک بار ملکھی کی طرف دیکھا۔ ملکھی کی آنکھیں کھلی تھیں اور شاہ نواز کے چہرے پر ایسے لگی تھیں جیسے یہ بات اس کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہی ہو کہ اس کی کون سی غلطی پر خفا ہو کر خان جی نے اسے مارا تھا۔ ملکھی کے منھ سے گرتے وقت گھٹی گھٹی سی آواز نکلی تھی لیکن اب وہ چپ تھا، یا تو ڈر سے ہی دم توڑ گیا تھا، یا بے ہوش پڑا تھا، یا پھر گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

شاہ نواز نے اسے وہیں چھوڑا، زیورات کا ڈبّا بغل میں دبا کر باہر نکل آیا اور بڑا تالا جو پہلے ملکھی نے اندر لگا رکھا تھا، گھر کے باہر لگا دیا۔

اسی رات کو بھابی کے ہاتھ میں زیورات کا ڈبّا دیتے ہوئے شاہ نواز نے کسی قسم کا تذبذب محسوس نہیں کیا، لیکن ڈبّا ہاتھ میں لیتے وقت بھابی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بھابی کا رُواں رُواں احسان مندی سے بھرا ہوا تھا۔ رگھوناتھ دل ہی دل میں اس کے اعلیٰ کردار اور بلند خیالی کی تعریف کر رہا تھا جس کی وجہ سے آج کے زمانے میں جبکہ چاروں طرف آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں، ایک مسلمان دوست اس کے لیے ایک مثال بن گیا تھا۔

"لیکن ایک بُری خبر بھی لایا ہوں بھابی!"

"کیوں کیا چوری ہو گئی ہے؟"

"نہیں۔ ملکھی سیڑھیوں پر سے بری طرح گر پڑا ہے اور شاید اس کی کوئی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ پہلے سوچا کسی ڈاکٹر واکٹر کو بلاؤں لیکن آج کل ڈاکٹر ملتے کہاں ہیں۔ کل اس کا کوئی انتظام کروں گا۔"

"بے چارہ!"

"کہو تو اسے یہاں ڈال جاؤں۔ وہاں اکیلا کہاں پڑا رہے گا؟ میں اپنا کوئی آدمی رکھوالی کے لیے چھوڑ آؤں گا۔"

لیکن بھابی اور رگھوناتھ دونوں ہی اس خیال سے ہچکچائے۔ وہ خود نئے علاقے میں ابھی اجنبی تھے۔ ان سے ایک مریض کی دیکھ بھال کہاں ہو گی۔ اگر شاہ نواز کے لیے ڈاکٹروں کو تلاش کرنا مشکل ہو رہا تھا تو ان کے لیے کہاں ممکن ہو گا۔

"میں انتظام کر دوں گا۔" شاہ نواز نے سر ہلا کر کہا۔ "کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائے گا۔ ایسی مشکل بھی کیا ہے!"

بھابی اس بات پر بھی شاہ نواز کی احسان مند تھی اور اس کے کشادہ، روشن، دمکتے چہرے کو دیکھ دیکھ کر اسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی روحانی پیشوا کو دیکھ رہی ہو۔

11

دیودت نہا دھو کر ہاتھ ملتا ہوا، اپنے گھر کے سامنے آکھڑا ہوا۔ جب کبھی وہ ہاتھ ملتا ہو یاد ائیں ہاتھ سے منھ اور ناک سہلاتے ہوئے پھر سے دونوں ہاتھ ملنے لگے تو سمجھ لو کہ دیودت اپنے کاموں کی فہرست تیار کر رہا ہے۔ دیودت کے دماغ میں ڈائری تھی۔ وہ ہاتھ ملتے ہوئے ناک سہلاتے ہوئے ڈائری میں ایک کے بعد ایک کام درج کر رہا تھا۔ "رتّے والے ساتھی سے رپورٹ نہیں آپائے گی۔ رتّے میں گڑبڑ ہے۔ کسی ساتھی کو وہاں بھیجنا ہوگا۔

شہر میں دنگوں کو روکنے کے لیے ایک بار پھر کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو اکٹھا کرنا ہوگا۔ حیات بخش اور بخشی کو آپس میں ملانا ہوگا۔ کل بھی دیودت جیسے تیسے بہت سے لوگوں کے گھر باری باری سے گیا تھا۔ راجارام نے اسے دیکھتے ہی دروازہ بند کر لیا تھا۔ رام ناتھ نے بگڑ کر بات کی تھی۔ کمیونسٹوں کو برا بھلا کہتا رہا تھا۔ البتہ حیات بخش ملنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ حیات بخش کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ وہ نعرے لگانے لگا تھا "لے کے رہیں گے پاکستان۔ بن کے رہے گا پاکستان۔" اس نے دیودت کو بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ آج ان کے پاس پھر جانا ہوگا۔ دیودت نے پھر ہاتھ ملے۔ ناک سہلائی۔ بخشی جی کو حیات بخش کے پاس بھیجو۔ اٹل کو ساتھ لے کر بخشی جی کے پاس جاؤ اور امین کو لے کر حیات بخش کے پاس۔ پھر یہ تجویز رد کر دی۔ لیڈروں کو چھوڑو۔ کانگرس، مسلم لیگ اور سنگھ سبھا کے دس دس آدمی مل بیٹھیں۔ اس نے سر ہلایا۔ پارٹی آفس میں جاکر، ساتھیوں سے مل کر اسے عملی جامہ پہنانا ہوگا۔ یکایک ایک اور مسئلہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ مزدوروں کے علاقوں میں گڑبڑ کو روکنے کے لیے ایک ایک ساتھی کافی نہیں ہے۔

رہتا مسلمانوں کا علاقہ ہے، وہاں کامریڈ جگدیش کو بھیجا گیا ہے۔ ایک اکیلا جگدیش کافی نہیں ہے۔ دیہات میں فوراً دو تین ساتھی بھیجے جانے چاہئیں جو ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کا دورہ کریں۔ ساتھیوں کی کمی ہے۔ مگر جہاں تک بن پڑے دنگوں کو روکنے کے لیے کام کرنا ہوگا۔ اس نے پھر ناک پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ کمیون میں دس بجے میٹنگ ہے، جس میں ساتھی اپنے اپنے علاقے کی رپورٹ پیش کریں گے۔ اب چلوں۔" دیودت چپ چاپ اندر جاکر خاموشی کے ساتھ برآمدے میں سے سائیکل نکالنے لگا۔

"کون ہے؟ دیودت؟"

دیودت نے سائیکل کو چھوڑ دیا اور کمرے کے اندر چلا گیا۔

"پھر کہیں جارہے ہو؟" کھاٹ پر بیٹھا ادھیڑ عمر فربہ اندام باپ بولا۔

"مرنا چاہتے ہو تو پہلے اپنے گھر والوں کو مار جاؤ۔ دیکھتے نہیں، شہر کی کیا حالت ہورہی ہے۔"

دیودت دہلیز پر چپ چاپ کھڑا ہاتھ ملتا اور ناک سہلاتا رہا۔ ماں رسوئی گھر میں سے نکل کر دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی کمرے کے اندر آئی۔ "تجھے کیا ملتا ہے ہم لوگوں کو تڑپانے میں؟ دیکھتے نہیں ہم نے رات کس طرح کاٹی ہے؟ اِدھر تو آگ اور اُدھر تم رات بھر غائب رہے۔"

دیودت ہاتھ رگڑ کر بولا۔ "پیچھے سے مری روڈ تک اور آگے سے کمپنی باغ تک سارا علاقہ ہندوؤں کا ہے۔ چاروں طرف کھاتے پیتے ہندو لوگ رہتے ہیں۔ آپ لوگوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"تجھے الہام ہوگیا ہے کہ ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے؟" باپ غرّا کر بولا۔

"اس لائن میں دس گھروں میں بندوقیں ہیں۔ اسی محلّے کے یووک سبھا والے تین قتل کر چکے ہیں۔"

"او، اُلّو کے پٹھے! اپنے خطرے کے بارے میں کون سوچ رہا ہے۔ ہم تو تیرے خطرے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔"

"ایسی خطرے کی کوئی بات نہیں۔" دیودت نے کہا اور پھر واپس برآمدے میں

آگیا اور سائیکل نکالنے لگا۔
ماں نے دوپٹہ گلے میں ڈال لیا اور اس کا راستہ روکنے لگی۔
"ساری رات میں نے تڑپ تڑپ کر گزاری ہے۔ دیکھتا نہیں کون سا وقت اوپر آیا ہے؟"
مسئلہ ٹیڑھا ہو رہا تھا۔ دیودت نے پھر ناک سہلائی، ہاتھ ملے اور ماں کے کان کے پاس منھ لے جا کر بولا۔ "میں جلدی لوٹ آؤں گا۔ تو فکر نہ کر۔"
"مجھے چرکاتا ہے؟ کل بھی کہہ کر گیا تھا، لوٹ آؤں گا۔ میرے جسم کو ہاتھ لگا کر کہہ۔ دن ڈھلنے سے پہلے لوٹ آئے گا؟"
"لوٹ آؤں گا۔ لوٹ آؤں گا۔ میں قسمیں نہیں کھایا کرتا۔" اور وہ سائیکل لے کر آگے بڑھنے لگا۔ اندر سے باپ کی آواز آئی۔
"یہ حرامی نہیں مانے گا۔ کیوں سر کھپا رہی ہے؟ یہ ہمیں ذلیل کر کے رہے گا۔ سؤر کا بچّہ۔ ماں باپ کا خیال نہیں۔ فساد بند کرانے جا رہا ہے حرامی کہیں کا..."
دیودت سائیکل لے کر گھر کے باہر آ چکا تھا۔
اندر سے آواز برابر اونچی ہوتی جا رہی تھی۔
"سب ہی گالیاں دیتے ہیں۔ نہ کام نہ دھام۔ دو دو پیسے کے پانڑیوں، مزدوروں قلیوں کو اکٹھا کرتا پھرتا ہے۔ ان کے سامنے لیکچر جھاڑتا پھرتا ہے، حرامی! منھ پر داڑھی نہیں اتری۔ لیڈر بن گیا ہے، سؤر کا بچّہ...."
دیودت چوک تک پہنچ چکا تھا۔
حالات میں پہلے سے کہیں زیادہ شدت آ گئی تھی۔ شہر کی سڑکیں سونی پڑی تھیں۔ نہ کوئی دکان کھلی تھی، نہ کہیں کوئی تانگہ موٹر چل رہا تھا۔ اگر کسی دکان کے کواڑ کھلے ہوں تو سمجھ لو کہ لوٹ لی گئی ہے۔ اگر کچھ لوگ لاٹھیاں لیے کھڑے ہوں تو سمجھ لو کہ ان ہی کے فرقے کے لوگوں کا وہ محلّہ ہے اور جہاں وہ کھڑے ہیں، وہاں سے دوسرے فرقے کے لوگوں کا محلّہ شروع ہو جاتا ہے، لیکن سب ہی محلّے اس طرح تقسیم نہیں تھے۔ سڑک کے کنارے کنارے کے پکّے دو منزلہ مکان ہندوؤں کے، ان کے پیچھے گلیوں میں کچّے مکانات مسلمانوں کے، یا پھر دیودت کے الفاظ میں، سڑکوں پر کھلنے والے مکان، متوسط طبقے کے، اور گلیوں

میں کھلنے والے مکان نچلے طبقے کے تھے۔

"دیودت!" چوک کی بائیں طرف سے کسی نے آواز لگائی۔ سائیکل پر بیٹھے بیٹھے زمین پر ایک پیر رکھ کر دیودت رک گیا۔

"آگے مت جاؤ۔ ایک آدمی مرا پڑا ہے۔"

ہاتھ میں لاٹھی اٹھائے پستہ قد کا ایک آدمی سڑک پر آ گیا۔

"کہاں پر؟"

"چوک کے پار۔ ڈھلان پر!"

"کون ہے؟"

"مسلمان ہے' اور کون ہے؟ تم اس وقت کہاں جا رہے ہو؟"

"میں اپنے کام سے پارٹی آفس جا رہا ہوں۔"

"ایک ہندو اس وقت قبرستان میں مرا پڑا ہے۔" یہ بتانے کے بعد پستہ قد آدمی جھنجھلا کر بولا "تم مسلمانوں کے حق میں بہت بولتے تھے۔ اب ان سے جا کر کہو' ہماری لاش دے جائیں' اپنی اٹھا لے جائیں۔"

دائیں طرف چھجے کے اوپر سے آواز آئی "مت جاؤ۔ وہ لوگ مار ڈالیں گے۔"

"یہ مسلمانوں کی بغل میں گھسا رہتا ہے' اسے کوئی نہیں مارے گا۔"

"ہے تو ہندو۔" چھجے پر سے آواز آئی۔

جو لوگ پہلے چھپ چھپا کر کام کرتے تھے اب بے دھڑک باہر آ گئے تھے۔

"ان سے جا کر کہہ دو۔ ہمارا ایک مرے گا' ہم ان کے تین ماریں گے۔"

آدمی شاید مرا نہیں تھا' سسک رہا تھا۔ ڈھلان پر اس کا جسم تھوڑا سا نیچے کھسک آیا تھا۔ اس کے داڑھی بھی تھی جو پہلے کھچڑی رہی ہو گی اب خون کے رنگ کی تھی۔ خاکی کوٹ پر جست کے بٹن تھے' سب سے سستے۔ جو ایک پیسے کے آٹھ آتے ہیں۔ جوتوں کے فیتے کھلے تھے گویا اگلے جہاں میں جانے سے پہلے خود ہی کھول دیے ہوں۔ کوئی کشمیری معلوم ہوتا تھا۔ دیودت نے مڑ کر سڑک کی طرف دیکھا۔ سڑک کے ناکے پر ایک ٹولی کھڑی تھی اور اسے گھورے جا رہی تھی۔ دوسری بار لاش کو دیکھ کر اس نے پہچان لیا۔ یہ کشمیری 'مہتو' ہے جو فتح چند کی ٹال پر کام کرتا تھا' کوئلہ اور لکڑیاں گھر گھر پہنچانے والا۔

فتح چند کی ٹال کچھ ہی دور تھی۔

دیودت نے ناک سہلائی اور سر ہلا دیا۔ یہ اس آدمی کو بچانے کی کوشش کرنے یا لاش کو ٹھکانے لگانے کا وقت نہیں تھا اور نا ہی ہندو کی لاش کو دیکھنے کا وقت تھا۔ یہ وقت پارٹی آفس میں پہنچنے کا تھا۔

پارٹی آفس میں جھنڈے ہی جھنڈے تھے۔ لے دے کر تین آدمی بیٹھے تھے۔ کمیون میں کل آٹھ آدمی تھے۔ ان میں سے پانچ آدمی ڈیوٹی پر تھے۔ لیکن ایک بُری خبر بھی تھی۔ ایک مسلمان کامریڈ کا اعتماد ٹوٹ چکا تھا اور وہ کمیون چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اپنی بات کہتے کہتے اس کے ہونٹ لرزنے لگتے تھے۔ وہ غصّے سے آگ بگولا ہو رہا تھا۔

"انگریز کی شرارت، انگریز کی شرارت۔ اس میں انگریز کہاں سے آگیا! مسجد کے سامنے سؤر پھینکتے ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے تین غریب مسلمانوں کو کاٹا ہے، ہٹاؤ جی! سب بکواس ہے۔"

دیودت بوکھلائے ہوئے ساتھی سے اتنا ہی کہہ پایا۔ "جلد بازی میں کوئی کام نہ کرو، کامریڈ۔ ہم متوسط طبقے کے لوگ ہیں۔ پرانے سنسکاروں کا ہم پر گہرا اثر ہے۔ مزدور طبقے کے ہوتے تو ہندو مسلمان کا سوال تمھیں پریشان نہیں کرتا۔" لیکن ساتھی نے اپنا مختصر سامان اٹھایا اور کمیون چھوڑ کر چلا گیا۔

"کامریڈ کی شعوری بنیاد ابھی کمزور ہے۔ جذبات کی رَو میں بہہ کر کوئی کمیونسٹ نہیں بنتا۔ اس کے سماجی عوامل کو سمجھنا ضروری ہے۔"

میٹنگ شروع ہوئی۔ 'شہر کی صورتِ حال'، پہلا آئیٹم تھا۔ اس میں بھی مزدور بستیوں کے بارے میں غور کرنا سب سے مقدم تھا۔

رتّے میں گڑبڑ کی بات غلط ہے۔ کسی مزدور بستی میں ابھی تک کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ ہاں کشیدگی پائی جاتی ہے۔ کامریڈ جگدیش مسلمان مزدوروں کی بستی میں بیٹھا ہے۔ لوگ اب بھی اس کی بات سنتے ہیں۔ سکھ مزدوروں کے وہاں بیس گھر ہیں۔ وہاں ابھی تک ایک بھی واردات نہیں ہوئی۔ البتہ کامریڈ جگدیش نے اطلاع دی ہے کہ حالت بگڑ رہی ہے۔ کل دو مزدوروں کے درمیان گالی گلوچ ہو گئی تھی۔ باہر سے آنے والی افواہیں بہت برا اثر پیدا کر رہی ہیں۔

فیصلہ ہوا کہ قربان علی کو بھی رُتّے میں بھیج دیا جائے تاکہ کامریڈ جگدیش اکیلا نہ رہے۔ اور دیودت نے یہ فیصلہ کاغذ پر درج کر لیا۔

'دارا' گاؤں میں جا چکے ہیں۔ کوئی خبر نہیں۔ آمد و رفت بند ہو چکی ہے۔ صرف ایک موٹر۔ گہرے نیلے رنگ کی موٹر گاؤں گاؤں جاتی دیکھی گئی ہے۔ کس کی موٹر تھی کیوں گئی تھی۔ کچھ معلوم نہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ شاہ نواز کی موٹر تھی۔

میٹنگ دیر تک چلتی رہی۔ تینوں کامریڈ دیودت کے ساتھ دیر تک بیٹھے مشورہ کرتے رہے۔ کاپی پر ایک ایک آئیٹم پنسل سے ٹِک ہوتا گیا۔ پھر آخری آئیٹم سامنے آیا۔

"سب ہی پارٹیوں کے نمائندوں کی میٹنگ بلانا!"

"یہ میٹنگ نہیں ہو سکے گی۔" ایک ساتھی بولا۔ "کانگرس دفتر پر تالا چڑھا ہے، لیگ والوں سے بات کرو تو پاکستان کے نعرے لگانے لگتے ہیں۔ وہ ہر بات میں کہتے ہیں کہ پہلے کانگرس والے یہ تسلیم کریں کہ کانگرس ہندوؤں کی جماعت ہے۔ پھر ہم ان کے ساتھ بیٹھنے کے لیے تیار ہیں۔ اور اس وقت تو لوگ اپنے اپنے محلّوں سے باہر نہیں نکل رہے ہیں۔ میٹنگ کس کے ساتھ کرو گے؟"

ناک سہلاتے ہوئے دیودت نے پھر فیصلہ بدل دیا۔ "دس دس نمائندوں والی بات نہیں چلے گی۔ چیدہ چیدہ لیڈروں کو ہی جیسے تیسے اکٹھا کرو۔ ان ہی کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی آجائیں گے۔"

"کوئی نہیں آئے گا کامریڈ۔" دوسرے ساتھی نے کہا۔ "اگر آئیں گے تو ان کے درمیان تو تو میں میں ہو گی۔ نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔"

"کامریڈ! ان لوگوں کے مل بیٹھنے سے عام لوگوں پر اچھا اثر پڑے گا۔ پھر ہم ان کے نام سے شہر میں امن قائم کرنے کی اپیل کر سکتے ہیں۔ محلّے محلّے میں اس کی منادی کروا سکتے ہیں۔ اس وقت کیا ہو رہا ہے؟ اس وقت کھلّم کھلّا فساد اور کھلی مار کاٹ نہیں ہے لیکن جہاں کہیں کوئی اکیلا آدمی ملتا ہے اسے کاٹ دیا جاتا ہے۔ اس لیے ان لیڈروں کو آپس میں ملانا بہت ضروری ہے۔

کچھ دوسرے پہلوؤں پر بھی غور کیا گیا۔ میٹنگ کہاں پر بلائی جائے؟ فیصلہ ہوا، حیات بخش کے گھر پر۔ "میں بخشی جی کو لاؤں گا۔ مسلمانوں کے محلّے میں پہنچنے پر کامریڈ

عزیز محلّے کے دو تین مسلمان شہریوں کے ساتھ ہم سے آن ملے گا اور پھر ہم سب حیات بخش کے گھر جا کر بیٹھیں گے۔"

"حیات بخش سے بات بھی کر لی ہے۔"

"ابھی جا کر بات کروں گا۔"

کامریڈ! تم کس دنیا میں رہ رہے ہو۔ حیات بخش کے گھر پر تم جاؤ گے۔ وہاں تک تمھیں پہنچنے کون دے گا؟"

"تم میرے ساتھ چلو گے۔" دیودت نے مسکرا کر عزیز سے کہا۔

"یہ پانی کے چھینٹے ہیں کامریڈ۔ ان سے یہ آگ نہیں بجھے گی۔"

لیکن میٹنگ کے بعد سچ مچ دیودت اور عزیز گلیاں پار کرتے، چھپتے چھپاتے، کہیں گالیاں کھاتے، کہیں دھمکیاں سنتے، حیات بخش کے گھر جا پہنچے۔

اور سچ مچ اس دوپہر کو حیات بخش کے گھر میٹنگ بھی ہوئی۔ بخشی جی کو دیودت لایا، کسی اور کانگریسی سے دیودت کہتا تو وہ شاید نہیں آتا۔ دیودت کو یقین تھا کہ بخشی ضرور آئے گا، کیوں کہ وہ کل ملا کر سولہ سال جیل میں رہ چکا تھا، چاہے اس کا ذہن صاف نہ ہو، سیاسی گتھیاں سلجھانے کی اس میں لیاقت نہ ہو، لیکن وہ خوں ریزی نہیں چاہتا تھا۔ وہ پچھلے دنوں میں سب سے تُنک تُنک کر بول رہا ہے، اس لیے کہ وہ بوکھلایا ہوا ہے۔ اندر سے پریشان ہے۔ حالات اس کے قابو میں نہیں ہیں۔ دیودت کے ساتھ آتے ہوئے راستہ بھر کمیونسٹوں کو گالیاں دیتا رہا۔ لیکن وہ آ گیا تھا، اور اس کے ساتھ دو جوان کانگریسی بھی آئے تھے۔ میٹنگ ہوئی اور اس کے ساتھ ہی تو تو میں میں بھی ہوئی۔ آدھے گھنٹہ تک حیات بخش اس بات پر اڑا رہا کہ بخشی یہ قبول کرے کہ وہ ہندوؤں کی نمائندگی کرنے آئے ہیں اور یہ کہ کانگرس ہندوؤں کی جماعت ہے۔ پھر دیودت نے کہا:

"صاحبان! یہ موقع ان بحثوں میں پڑنے کا نہیں ہے۔ باہر لوگ مر رہے ہیں۔ گھر جل رہے ہیں، سنتے ہیں یہ آگ دیہات میں بھی پھیلنے والی ہے۔ اس وقت ہمارا فرض کیا ہے؟ میں گزارش کروں گا کہ ہم وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس آگ کو پھیلنے سے روکیں۔"

پھر دیودت نے اپیل پڑھ کر سنائی۔ بحث چھڑ گئی۔ یہ کانگرس اور لیگ کی طرف سے نہیں ہو سکتی۔ یہ حیات بخش اور بخشی کی طرف سے ہو سکتی ہے۔ نہیں، اس میں اور لوگوں کو بھی شامل کیا جائے۔۔۔!"

پھر لوگ تھک گئے۔ حیات بخش کے کان میں اس کے بیٹے نے کہا کہ اپیل پر دستخط کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ امن کی اپیل ہی تو ہے۔ حیات بخش نے اپیل پر دستخط کر دیے۔

بخشی جی نے بھی دستخط کر دیے۔ پھر 'پاکستان زندہ باد' کے نعرے لگنے لگے۔ اور ان ہی نعروں کے درمیان بخشی جی ابھی جوتا پہن رہے تھے کہ خبر آئی 'رتے میں مزدوروں کی بستی میں بھی فساد ہو گیا ہے' اور دو سکھ بڑھئی مار ڈالے گئے ہیں۔۔۔

پہلے تو دیودت نے خبر کو جھوٹ کہا' ماننے سے انکار کر دیا۔" وہاں پر دنگا آپ نے دیکھا ہے' اپنی آنکھوں سے؟ کون خبر لایا ہے؟" یہ جملہ تو وہ آخر تک دہراتا رہا۔ لیکن اس کا سر جھک گیا' اسے لگا کہ اگر مزدور آپس میں لڑ سکتے ہیں تو یہ زہر بہت گہرائی تک اثر کر چکا ہے۔ اس لیے اس میٹنگ کو فی الحال نقش بر آب ہی سمجھنا چاہیے۔

اور فوراً ہی دیودت نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ سائیکل اٹھاؤ اور سیدھے رتا پہنچو۔ جیسے بھی ہو' رتا پہنچو۔ اکیلے کامریڈ جگدیش کے بس کی یہ بات نہیں رہ گئی ہے۔ میرے پہنچنے سے شاید صورتِ حال بہتر ہو جائے۔ مزدور آپس میں نہ لڑیں۔

لیکن جب دیودت پارٹی آفس میں پہنچا تو اس کا باپ پہلے سے وہاں موجود تھا۔ ہاتھ میں چھڑی اٹھائے ہوئے۔ جب دیودت نے صورتِ حال کا مارکسی تجزیہ کیا اور بتایا کہ دنگا روکنے کی کوشش جاری ہے اور پھر سائیکل نکالنے لگا تو اس کا باپ پھر بگڑ بیٹھا۔

"الو کے پٹھے' حرامی! کوئی مار ڈالے گا تو لاش اٹھانے والا بھی نہیں ملے گا۔ تو دیکھتا نہیں' وقت کیسا چل رہا ہے۔ حرامی تو اکیلا دنگا روکنے جا رہا ہے۔۔۔" اور باپ نے گلی میں کھلنے والا دروازہ بند کر دیا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ بیٹے کو ڈھن ڈالے۔ اس نے چھڑی اٹھا لی' لیکن پھر دہاڑ مار کر رو پڑا۔ "کیوں ہمیں رلا رہا ہے؟ تو ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔ کچھ سمجھ سے کام لے۔ کچھ عقل کی بات کر۔ دیکھ تیری ماں کتنی پریشان ہے؟ تو کہے تو پگڑی تیرے قدموں پر رکھ دوں۔ چل گھر۔"

دیودت نے ناک سہلائی۔ ہاتھ ملے۔ حالت نازک تھی۔ کسی کو بیچ میں ڈالنا ہوگا۔ انھیں گھر تک پہنچانا ہوگا۔

"مجھے رتا جانا ہے۔" وہ بولا۔ "میں رک نہیں سکتا۔ لیکن میں آپ کو گھر تک پہنچانے کا انتظام کیے دیتا ہوں۔ کامریڈ رام ناتھ آپ کے ساتھ جائے گا۔"

اسی دوپہر کو ایک اور موت ہوئی۔ جرنیل مارا گیا۔ سنکی تو وہ پہلے ہی تھا' بغل میں چھڑی دبائے لیفٹ رائٹ کرتا ہوا' دنگا روکنے کے لیے نکل پڑا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے ذہن میں کسی قسم کے خیالات اٹھتے تھے یا نہیں لیکن دل میں ولولے ضرور پیدا ہوتے تھے' اس کے

ساتھ قدم بھی ضرور اٹھتے تھے، اور دماغ میں شاید ٹسک بھی اٹھتی تھی۔ شہر میں دنگا ہو رہا ہے، یہ کیا کوئی اچھی بات ہے۔ اور یہ سب ہی کانگریسی جو گھر میں گھسے بیٹھے ہیں، غدار ہیں۔

وہ باہر آیا اور جگہ جگہ سڑک کے کنارے کبھی ایک چبوترے پر تو کبھی دوسرے چبوترے پر کھڑا ہو کر لیکچر دینے لگا۔

"صاجبان! میں آپ کو اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ شری جواہر لال نہرو جی نے راوی کے کنارے مکمل آزادی کا حلف لیا تھا۔ وہ، وہاں راوی کے کنارے ناچے تھے۔ اور میں بھی ناچا تھا۔ ہم سب نے حلف لیا تھا۔ جو لوگ آج گھروں میں بیٹھے ہیں، وہ سب غدار ہیں۔ میں ایک ایک کو جانتا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں یہ لوگ گھروں میں بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔ انھیں برقع پہن کر بیٹھنا چاہیئے۔ ان کو اپنے ہاتھوں پر مہندی لگانی چاہیئے۔ صاجبان! گاندھی جی نے کہا ہے کہ ہندو مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ انھیں آپس میں نہیں لڑنا چاہیئے میں آپ سے، بچے، بوڑھے، جوان، مرد اور عورتوں سب ہی سے اپیل کرتا ہوں کہ آپس میں لڑنا بند کر دیں۔ اس سے ملک کو نقصان پہنچتا ہے۔ ملک کی دولت انگلستان میں جاتی ہے۔ انگریز، یہ گورا بندر، ہم پر حکم چلاتا ہے۔۔۔"

ایک چبوترے سے دوسرے چبوترے پر، گلیاں، سڑکیں طے کرتا ہوا وہ کمیٹی محلے میں جا پہنچا۔ ادھر دن ڈھل رہا تھا اور وہ تقریر کر رہا تھا، جب کچھ منچلے آ کر کھڑے ہو گئے۔ جرنیل کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کس محلے میں ہے اور کہاں ہے۔

"صاجبان! میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہندو مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ شہر میں فساد ہو رہا ہے۔ آتش زنی ہو رہی ہے اور اسے کوئی نہیں روکتا۔ ڈپٹی کمشنر اپنی میم کو باہوں میں لیے بیٹھا ہے، اور میں کہتا ہوں کہ ہمارا دشمن انگریز ہے۔ گاندھی جی کہتے ہیں کہ وہی ہمیں لڑاتا ہے۔ ہم بھائی بھائی ہیں۔ ہمیں انگریز کی باتوں میں نہیں آنا چاہیئے اور گاندھی جی کا فرمان ہے کہ پاکستان میری لاش پر بنے گا۔ میں بھی کہتا ہوں کہ پاکستان میری لاش پر بنے گا۔ ہم ایک ہیں، ہم بھائی بھائی ہیں۔ ہم مل کر رہیں گے۔"

"تیری ماں کی۔۔۔" آس پاس کھڑے لوگوں میں سے ایک نے کہا۔ اور لاٹھی کے ایک ہی بھرپور وار سے جرنیل کی کھوپڑی توڑ دی۔ چھڑی کہاں گئی، پھٹی ہوئی مونگیا پگڑی کہاں گئی۔ اور پھٹے ہوئے چپل کہاں گئے، اور فقرہ ختم کیے بغیر ہی جرنیل جہاں کھڑا تھا، وہیں ڈھیر ہو گیا۔

12

"ایک آدمی چھجّے پر پہرہ دے!" رن ویر نے گھوم کر کہا۔ مرغی کاٹ کر سند پانے سے اس میں بھرپور خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اب اس گروہ کا سب سے ہوشیار، سب سے چُست اور سب سے زیادہ فعّال ممبر تھا۔ اس کی آواز میں کڑک آ گئی تھی۔

لاٹھیاں، کلہاڑیاں، چھرے، تیر کمان اور غلیلیں۔ ان ہتھیاروں سے 'شستر اگار' (اسلحہ خانہ) خالی خالی نظر آ رہا تھا۔ کمرے کے باہر، سیڑھیوں سے تھوڑا ہٹ کر، چولہے پر تیل کا کڑھاؤ رکھا تھا، لیکن لکڑیاں کم پڑ جانے کی وجہ سے تیل کو ابالنے کا خیال کل ہی ترک کر دیا گیا تھا۔

"جو حکم سردار!" شمبھو نے کہا اور چھجّے پر چلا گیا۔

چاروں سورماؤں کے دل امنگ سے بھرے ہوئے تھے۔ میدانِ جنگ میں اترنے کا اور اپنے جوہر دکھانے کا وقت آ گیا تھا۔ چھجّے کے پیچھے کھڑے ہوئے یہ لوگ وہی کیفیت محسوس کر رہے تھے جو ہلدی گھاٹی کے محاذ پر چٹانوں کی آڑ میں کھڑے راجپوت نیچے گھاٹی میں آنے والے ملیچھوں کا انتظار کرتے ہوئے محسوس کر رہے ہوں گے۔ ملیچھوں پر ٹوٹ پڑنے کا وقت آ گیا تھا۔

رن ویر چھوٹے قد کا آدمی تھا۔ اس لیے وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو شواجی کے کردار میں دیکھ رہا تھا۔ چھاتی پر دونوں ہاتھ باندھے، ترچھی آنکھوں سے وہ سڑک اور سڑک کے آس پاس کے علاقے کا جائزہ لیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ کمر میں تلوار لٹکتی ہو، کمر کے گرد چوڑی سی پیٹی ہو، انگرکھا ہو، اور سر پر پیلے رنگ کی پگڑی ہو، اور اس کے اوپر مغفر ہو۔ ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہن کر اتنی بڑی جنگ

میں حصہ لینا بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ پاجامہ اور سیدھی سادی قمیص اور نیچے پھٹی ہوئی چپل!
یہ بہادر سپاہی کا لباس نہیں تھا، لیکن جو حاکمانہ رنگ اس کے لباس میں نہیں تھا
اس کی کمی کو رن ویر نے اپنی کڑک دار آواز سے پورا کر لیا تھا۔ فوج کے کمانڈروں کی
طرح حکم دیتا تھا اور گروہ کے سب ہی ساتھیوں کو سخت نگرانی میں رکھتا تھا۔ پیٹھ
کے پیچھے ہاتھ باندھے، ذرا جھک کر گہری فکر میں کھویا ہوا، وہ اسلحہ خانہ میں اوپر
نیچے ٹہلتا تھا، اسی طرح جیسے اورنگ زیب سے لڑنے سے قبل شواجی ٹہلتے ہوں گے۔

"سردار!"

رن ویر نے گھوم کر دیکھا۔ منوہر کھڑا تھا جو کچھ دیر پہلے ہر ایک غلیل کے پاس کنکریوں
کی ایک ایک ڈھیری لگا رہا تھا۔

"لکڑیاں کم پڑ گئی ہیں۔ تیل نہیں ابل سکتا۔"

"کیا کوئلہ بھی نہیں ہے؟"

"نہیں۔ سردار!

رن ویر پیٹھ کے پیچھے ہاتھ باندھے کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہا۔ فوجی حکمت عملی یہی کہتی
ہے کہ فیصلہ بلا تاخیر کیا جانا چاہیئے۔ صورتِ حال کو پہچان لینا، اس کی تہہ تک پہنچ جانا،
اور فوراً فیصلہ کر لینا کمانڈر کے لیے ضروری ہے۔

"اپنے گھر سے اٹھا لاؤ۔ جو بھی ملے، لکڑی یا کوئلہ اور جتنا بھی ملے اٹھا لاؤ۔ اِس
میں دیر نہیں ہونی چاہیئے۔"

منوہر ٹھٹکا کھڑا رہا۔

"کیا ہے؟"

"اگر ماں نہیں لانے دے تو؟"

اس پر سردار اسلحہ خانہ کے بیچوں بیچ کھڑے منوہر کے چہرے کی طرف دیکھنے
لگا۔ پھر کڑک کر بولا۔ "میرے منہ کی طرف کیا دیکھ رہے ہو؟ جہاں سے بھی ہو سکے
لکڑی لاؤ۔"

"جو حکم سردار!" منوہر نے کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔

"مگر ابھی رک جاؤ۔ اس وقت جانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اور تب ہی تیل ابالنے کا

خیال ترک کر دیا گیا۔

"اسلحہ خانہ" ایک دو منزلہ مکان کی اوپر والی منزل میں بنایا گیا تھا، جو خالی پڑی تھی۔ نچلی منزل میں شمبھو کے بوڑھے دادا، دادی رہتے تھے۔ اوپر والی منزل کا چھجّا سڑک پر کھلتا تھا، اور سڑک کے کنارے پیپل کا خوبصورت درخت تھا، جس سے چھجّا بہت کچھ ڈھکا رہتا تھا لیکن گھر کے اندر جانے کا راستہ ایک گلی میں سے تھا جو پیپل کے درخت کے سامنے سے ہی اندر چلی گئی تھی۔ یہ گلی ٹیڑھی میڑھی تھی۔ تاریک اور پیچیدہ تھی۔ سڑک سے اس گلی کے اندر آنے والا آدمی گلی میں گم سا ہو جاتا تھا۔ رن ویر کو یہ حالت سمجھاتے ہوئے شمبھو نے اسے 'چکرویوہ' میں داخلے کا طریقہ بتایا تھا اور جنگی سرگرمی کے لیے اس کو سب سے زیادہ کارآمد قرار دیا تھا۔ گلی کچھ آگے جا کر بائیں طرف کو مڑ گئی تھی۔ موڑ پر کسی پیر کا شکستہ مزار تھا۔ مزار کے سامنے ایک بوڑھا مسلمان رہتا تھا جس کی دو بیویاں تھیں۔ آگے چلے جاؤ تو پانی کا نل آتا تھا، جو دوپہر کے وقت بند رہتا تھا۔ سہ پہر چار بجے تک نل پر کوئی جانور نظر نہیں آتا تھا۔ نل کے آگے سب ہی مکان ہندوؤں کے تھے۔ صرف گلی کے آخر میں دو تین کچّے مکان تھے جن میں مسلمان رہتے تھے۔ ایک میں محمود دھوبی رہتا تھا، دوسرے میں رحمان حمام والا۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ سے دائیں بائیں دوسری گلیاں نکل گئی تھیں۔ اگر ملیچھوں پر حملہ اس گلی میں کیا جائے گا تو وہ پانی کے نل اور گلی کے سرے کے بیچ میں سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ خطرہ ہو تو کسی نہ کسی ہندو کی ڈیوڑھی میں گھسا جا سکتا ہے۔

"تم گلی میں رہنے والے ملیچھوں کو جانتے ہو؟"

رن ویر نے شمبھو سے پوچھا تھا۔

"ہاں سردار! میں انھیں جانتا ہوں۔ محمود دھوبی ہمارے گھر کے کپڑے دھوتا ہے، اور پیر کی قبر کے سامنے جو میاں جی رہتے ہیں، وہ میرے دادا جی کے ساتھ بہت اٹھتے بیٹھتے ہیں۔"

"تم اس گلی میں کام نہیں کرو گے۔" رن ویر نے فیصلہ کن آواز میں کہا۔

شمبھو کا حوصلہ پست ہو گیا۔

آج یہ لوگ اپنے شکار پر دھاوا بولنے والے تھے۔ چاروں سورما جوش میں تھے۔

ابھی تک صرف تیاری چل رہی تھی لیکن آج میدانِ جنگ میں جوہر دکھانے کا وقت آگیا تھا۔ "آج لڑائی میں جا کے دھوم مچا دے بیٹا!" دھرم دیو کے کانوں میں دیر رس بھرے اس گیت کا مصرعہ بڑی دیر سے گونج رہا تھا۔ منوہر ذرا فکرمند تھا۔ وہ اپنی ماں سے کچھ بھی کہے بغیر چلا آیا تھا، اور اب دن کے دو بجنے والے تھے۔ منوہر کو ڈر تھا کہ چوکا سمیٹنے کے بعد اس کی ماں اسے ڈھونڈھنے نکل پڑے گی اور کون جانے کہ ڈھونڈھتی ڈھونڈھتی اِدھر ہی آنکلے۔

رن ویر نے دیگر تینوں سورماؤں کو اسلحہ خانہ میں اکٹھا کیا اور فوجی حکمت عملی پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے بولا۔ "دشمن پر کھولتا ہوا تیل ڈالنے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ کھولتا ہوا تیل اسی وقت ڈالا جاتا ہے جب دشمن آپ کے قلعے پر حملہ کر دے اور آپ ہتھیاروں سے اس کا مقابلہ نہ کر سکتے ہوں۔" پھر اس نے ذرا سوچ کر کہا۔ "یہاں صرف چھرا چلے گا، کمانی دار چھُرا۔"

پھر اس نے اِندر کو مخاطب کر کے کہا۔ "ایک بار پھر پینترا کر کے دکھاؤ۔ اٹھاؤ چھُرا داسے پرسے۔"

اِندر پھرتی کے ساتھ چھرا اٹھا لایا۔ کمرے کے وسط میں دونوں ٹانگیں پھیلائے وہ پل بھر کے لیے کھڑا رہا۔ چھرے کا دستہ اس کے دائیں ہاتھ میں تھا اور اس کا پھل پیچھے کی طرف تھا۔ پھر بایاں قدم اٹھا کر وہ اچھلا اور ہوا میں آدھا گولا کاٹ کر پھر دونوں ٹانگوں پھیلائے رن ویر کی پیٹھ کی طرف منھ کیے فرش پر اترا۔ اسی دوران اس نے رن ویر کی کمر کو نشانہ بناتے ہوئے الٹے ہاتھ سے چھرے کے وار کا اشارہ بھی کیا تھا۔

رن ویر نے سر ہلایا۔ "دشمن کی چھاتی یا پیٹھ کو کبھی بھی نشانہ مت بناؤ۔ وار ہمیشہ کمر میں کرو یا پیٹ پر۔ اور گھماؤ دار چھرا بھونکنے کے بعد اسے اندر ہی اندر تھوڑا سا موڑ دو۔ اس سے آنتیں باہر آجائیں گی۔ اگر تم بھیڑ میں دشمن پر وار کرتے ہو تو چھرا باہر کھینچنے کی کوشش مت کرو۔ اسے وہیں رہنے دو، اور بھیڑ میں کھو جاؤ۔"

رن ویر وہی الفاظ بولے جا رہا تھا جو اس نے ماسٹر دیو ورت کے منھ سے سنے تھے۔

تھوڑی دیر بعد یہ گروہ دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ پہلا حملہ اِندر کے ہاتھوں کیا جائے گا

—— اس لیے اِندر شمبھو اور سردار اسلحہ خانہ کو چھوڑ کر نیچے ڈیوڑھی میں آگئے، جبکہ منوہر اوپر ٹھہر گیا۔ فیصلہ کیا گیا کہ "چھجّے" پر کھڑا سپاہی سڑک پر نظر رکھے گا اور گلی میں آنے جانے والے لوگوں پر رن ویر، اندر اور شمبھو نگاہ رکھیں گے۔ رن ویر کے حکم سے اِندر ڈیوڑھی میں سے نکل کر دشمن پر حملہ کرے گا۔ گلی میں کھلنے والے دروازے کو تھوڑا سا کھول دینے پر سڑک کا کچھ حصّہ اور گلی کا شروع کا حصّہ نظر آتے تھے۔ پیپل کے تنے کے پار سڑک کا حصّہ تھا جو دوپہر کی دھوپ میں چمک رہا تھا۔

گلی کے سامنے ایک تانگہ رکا۔ رن ویر نے دروازے کو لگ بھگ پورا بند کر دیا اور ایک پتلی سی دراڑ سے باہر کی طرف دیکھنے لگا۔

"کون ہے؟" اِندر نے پھسپھسا کر پوچھا۔

رن ویر خاموش رہا۔ دیگر دو سپاہیوں نے بھی آگے بڑھ کر دراڑ پر آنکھ لگائی۔

"جلال خاں ہے۔ نواب زادہ جلال خاں"، شمبھو نے بتایا، "یہ سڑک کے کنارے سامنے والے مکان پر رہتا ہے۔ ہمارے محلے کا بہت بڑا رئیس ہے۔ ڈپٹی کمشنر سے ملنے جاتا ہے۔" شمبھو ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

دراڑ میں سے لمحہ بھر کے لیے اس آدمی کا سفید طرّہ، چڑھی ہوئی مونچھیں اور لال دمکتا چہرہ نظر آئے۔ لیکن جیسے ہی وہ سامنے آیا، ویسے ہی اوجھل بھی ہو گیا۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے اس کی سرسراتی شلوار اور چرمراتے جوتوں کی آواز سنائی دی۔ کوئی فیصلہ ہونے سے پہلے ہی وہ اپنے گھر کے اندر جا چکا تھا۔ تینوں بہادر سپاہی شکست خوردہ سے کھڑے رہ گئے۔ یوں بھی وہ قد میں بہت اونچا تھا۔ اس کو سامنے سے آتا دیکھ کر تینوں سہم گئے تھے اور سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

ماسٹر جی نے کہا تھا کہ دشمن کی طرف دھیان سے کبھی مت دیکھو۔ اس سے فیصلہ ڈگمگانے لگتا ہے۔ کسی بھی جان دار کی طرف دھیان سے دیکھو تو اس کے لیے دل میں رحم پیدا ہونے لگتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہونے دینا چاہیے۔

پیچھے گلی میں کوئی دروازہ کھلا اور پھر کھٹاک سے بند ہو گیا۔ تینوں نوجوانوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ رن ویر نے دروازے کے کواڑوں کو اس طرح سے کھولا کہ ان کے درمیان کی دراڑ گلی کی طرف کھل گئی۔

"کون ہے؟" اِندر نے سرگوشی کی۔

"ملیچھ ہے۔" رن دیر بولا۔

دونوں دوست اوپر نیچے دراڑے سے آنکھ لگا کر کھڑے ہو گئے۔ ایک داڑھی والا بڑی عمر کا آدمی گلی میں سے چلتا ہوا سڑک کی طرف آ رہا تھا۔

"میاں جی ہیں۔" شمبھو پہچانتے ہی بولا۔ "پیر کی قبر کے سامنے والے گھر میں رہتے ہیں۔ اس وقت مسجد میں نماز پڑھنے جا رہے ہیں۔ روزانہ اسی وقت نماز پڑھنے جاتے ہیں۔"

"چپ رہو۔"

میاں گلی کا تھوڑا سا حصّہ طے کر کے پیپل کے درخت کے پاس آیا اور وہاں سے بائیں طرف گھوم گیا۔ وہ کالے رنگ کی واسکٹ پہنے تھا اور نیچے شلوار اور ڈھیلی ڈھالی چپل۔ اس کے دائیں ہاتھ میں چھوٹی سی تسبیح لٹک رہی تھی۔ بڑھاپے کی وجہ سے اس کی پیٹھ جھکی ہوئی تھی اور وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

"جاؤں؟" اندر نے سردار سے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ اب سڑک پر پہنچ چکا ہے۔"

"تو کیا ہوا؟"

"نہیں سڑک پر حملہ کرنے کو منع کیا گیا ہے۔"

شمبھو کو اندر کی آواز میں اتاؤلاپن محسوس ہوا جبکہ خود شمبھو کا دل دُھکڑ پکڑ کر رہا تھا۔ اندر کے سوال پر شمبھو کو ایک عجیب دھکا سا لگا تھا۔ سردار کے منع کرنے پر اسے دل ہی دل میں راحت کا احساس ہوا۔

کچھ دیر تک وہ پھر دروازے کے پیچھے کھڑے رہے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ چار بجے نل کھل جائے گا اور گلی کی عورتیں گھڑے اٹھائے نل پر پہنچ جائیں گی۔ دوپہر گزرتے ہی اِکّا دُکّا اور لوگ بھی باہر نکلنے لگیں گے۔

اسی دوران ایک ایک کر کے دو آدمی گلی میں داخل ہوئے۔ ایک سائیکل تھامے ہوئے تھا اور آنکھوں پر چشمہ تھا۔

"یہ بالو چونی لال ہے۔ یہ ایک دفتر میں کام کرتا ہے۔ اس کے پاس کتّا ہے۔"

اور دوسرا ایک سکھ سردار گلی میں آیا، جو کندھے پر گٹھری اٹھائے ہوئے تھا۔

دونوں باری باری آئے اور اپنے پٹ پٹ کرتے جوتوں کے ساتھ گلی طے کر گئے۔

اسی وقت انھیں پھر کسی کے قدموں کی آہٹ ملی۔ اِندر نے دراڑ میں سے جھانکا اور رن ویر کی کہنی کو چھوا۔

"کون ہے؟"

اِندر کچھ نہیں بولا اور باہر دیکھتا رہا۔

پَٹ پَٹ کرتے جوتوں کی آواز آئی۔ رن ویر ـــ دراڑ میں سے جھانکنے لگا۔ شمبھو بھی دراڑ کے ساتھ چپک گیا۔

"کون ہے؟"

"کوئی خوانچے والا ہے۔" اِندر نے پھسپھسا کر کہا۔

"نہیں۔ عطر پھلیل بیچتا ہے۔ کہیں دور رہتا ہے۔ اس وقت روزانہ اِدھر سے گزرتا ہے۔ ملیچھ ہے۔"

ایک بھاری بھرکم آدمی، مہندی سے رنگی مونچھوں اور کوچی داڑھی والا، اپنی اغل بغل بہت سے تھیلے لٹکائے، پیپل کے درخت کے نیچے سے ہو کر گلی کے اندر آ گیا تھا۔ بوجھ کی وجہ سے اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چھلک آئی تھیں۔ اس کے داہیں کان میں روئی کے پھاہے رکھے تھے اور اس نے پگڑی میں دو تین سلائیاں ٹھونس رکھی تھیں۔

رن ویر کو ایسا لگا جیسے اس کی پیٹھ کے پیچھے کوئی حرکت ہوئی ہو۔ اس نے گھوم کر دیکھا اِندر کا ہاتھ اپنی جیب میں رکھے گھاؤ دار چھرے پر چلا گیا تھا۔

لمحے گزر رہے تھے اور فیصلے کا وقت آ گیا تھا۔ یہ آدمی ملیچھ تھا، اجنبی تھا، تھیلوں کے بوجھ سے لدا تھا۔ نہ بھاگ سکتا تھا، نہ اپنے آپ کو بچا سکتا تھا۔ سب ہی اوصاف موجود تھے۔ کچھ سوالوں کا جواب ذہن نہیں دیتا کوئی اندرونی تحریک دیتی تھی۔ لمحے بیت رہے تھے، اور پھیری والا گلی میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ رن ویر نے آنکھ کا اشارہ کیا اور اندر لپک کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے وقت باہر کی چندھیا دینے والی روشنی پل بھر کے لیے اندر گھسی لیکن رن ویر نے پھر دروازہ بند کر دیا۔

کوئی آہٹ یا آواز نہیں تھی۔ رن ویر اور شمبھو دم سادھے دروازے کے پیچھے کھڑے تھے۔ رن ویر کے دل میں زیادہ ہیجان تھا۔ اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور سر باہر نکال کر دیکھا۔ گلی میں کچھ فاصلے پر عطر فروش جھولتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ تھیلوں کے بوجھ سے اس کی پیٹھ جھکی ہوئی تھی اور اندر، بونا چھوٹا سا اندر اس سے کچھ فاصلے پر اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اِندر کا ہاتھ کُرتے کی جیب میں تھا اور وہ اچک اچک کر چل رہا تھا۔

رن دیر کے لیے دروازے میں سے سر نکال کر گلی میں جھانکنا اتنا ہی غیر ممکن تھا جتنا دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے کھڑے رہنا۔ سارے معاملات پر اس کا کنٹرول تھا۔ لیکن اپنے بچوں کے جیسے جوش و خروش پر کوئی قابو نہیں تھا۔ اچانک شمبھو نے اسے پیچھے کھینچ لیا۔ شمبھو ڈرا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگوں میں جیسے پانی بھر گیا تھا۔ آخری جھلک میں رن دیر صرف اتنا دیکھ سکا کہ اِندر اس بھاری بھرکم ملیچھ کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا اور دونوں گلی کا موڑ کاٹ رہے تھے۔

شمبھو نے سانکل چڑھا دی اور دونوں اندھیرے میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ دونوں بُری طرح ہانپ رہے تھے۔ شمبھو کے لیے کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا جبکہ رن دیر باہر جانے کے لیے بیتاب تھا۔

گلی کا موڑ کاٹنے کے بعد اچانک عطر فروش کی نگاہ لڑکے پر پڑ گئی۔ اپنے پٹ پٹ کرتے جوتوں کی وجہ سے شاید وہ اس کے پاؤں کی آہٹ نہیں سن پایا تھا۔

عطر فروش مسکرا دیا۔

"کدھر جا رہے ہو بیٹے اس وقت؟" اس نے کہا اور مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھا کر اِندر کے سر پر رکھ دیا۔

اِندر ٹھٹک گیا اور ایک ٹک اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا ہاتھ اپنی جیب میں تھا۔ اِندر کے ذہن میں ایک اور بات ابھری۔ اس آدمی کے گال پھولے ہوئے ہیں اور ماسٹر جی نے ایک بار کہا تھا کہ پھولے ہوئے گالوں والا آدمی بزدل ہوتا ہے۔ اس کا معدہ خراب ہوتا ہے، وہ بھاگ نہیں سکتا، جلدی ہانپنے لگتا ہے۔ اور یہ آدمی سچ مچ ہانپ رہا تھا۔

اِندر اپنے شکار پر جھپٹنے کے لیے پَر تول رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ابھی تک ملیچھ کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

عطر فروش کو یہ لڑکا معصوم سا لگا، چھوٹی عمر کا، نازک سا۔ جو شاید پناہ ڈھونڈھتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا۔ شاید خوف زدہ تھا۔ شہر میں آج کل سب ہی لوگ خوف زدہ تھے۔

"کہاں رہتے ہو؟ چلو میرے ساتھ چلتے چلو۔ آج کل اکیلے باہر نہیں گھومنا چاہیئے۔"

لیکن اِندر ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ ابھی تک عطر فروش کے چہرے کی طرف گھورے جا رہا تھا۔

"تیلی محلے تک میں تمھیں پہنچا دوں گا۔ آگے کہیں جانا ہو تو کسی اور کے سپرد کر دوں گا۔"

آج شہر میں گڑ بڑ ہے۔"

اور لڑکے کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ گھوم کر آگے بڑھنے لگا۔

پل بھر کے لیے اندر وہیں ٹھٹکا کھڑا رہا، پھر ساتھ ہولیا۔

آس پاس کے گھروں میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ان کی ڈیوڑھیوں میں اتنا اندھیرا تھا کہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے پر بھی کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

"مجھے بھی آج پھیری پر نہیں نکلنا چاہیئے تھا۔" اس نے اندر سے کہا۔ "آج کا دن بھی کوئی پھیری کا دن ہے۔ سارا شہر سوکھا پڑا ہے۔ لیکن میں نے سوچا کہ گھر پر بیٹھ کر کیا کروں گا۔ دو چار آنے کا جگاڑ ہو جائے تو کیا برا ہے۔ دکان دار گھر بیٹھا رہے تو کھائے گا کہاں سے؟"

اور عطر فروش ہنس پڑا۔

پانی کا نل نزدیک آرہا تھا۔ نل میں پانی نہیں تھا۔ اس کے نیچے پڑی پتھر کی سِل جو گھس گھس گہری ہو گئی تھی، سوکھی پڑی تھی اور اس کے آس پاس دو تین بھڑیں اڑ رہی تھیں۔ کچھ ہی دن پہلے اندر بھڑیں پکڑا کرتا تھا۔

"عطر کے چار پھوئے بھی کوئی ہم سے لے لے تو ہماری جوتی کھری ہو جاتی ہے۔" عطر والے نے جیسے اپنے آپ سے بات کرتے ہوئے کہا۔ وقت کاٹنے کے لیے وہ باتیں کرنا چاہتا تھا، یا پھر شہر کی سنسان گلیاں طے کرتے ہوئے شاید وہ بھی خوف زدہ تھا۔

"ہمیں ایک ایک گلی کے بارے میں معلوم ہے کہ وہاں کون کون عطر خریدتا ہے۔ جس مرد کی دو بیویاں ہوں، وہ عطر ضرور لیتا ہے۔ وہ وسمہ بھی لے گا، سرمہ بھی لے گا۔ وہ مرد بھی عطر خریدتا ہے جس کی عمر زیادہ ہو، اور اس کی بیوی جوان ہو۔ اچھا اور بتاؤں؟" وہ بچے کا دل بہلانے کے لیے بولے جا رہا تھا۔

عطر فروش کی باتوں کی وجہ سے اندر سنبھل گیا تھا۔ اس کے قدم اعتماد کے ساتھ اٹھ رہے تھے۔ کمانی دار چاقو کا دستہ اس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کے ذہن میں یکسوئی پیدا ہونے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں عطر فروش کی کمر پر ٹکنے لگی تھیں۔ وہی نظر کی یکسوئی جس سے ارجن نے پیڑ پر بیٹھے پرندے کی آنکھ کو پھوڑا تھا۔ عطر فروش کے بائیں کندھے سے جھولتا تھیلا بار بار گھڑی کے پنڈولم کی طرح اس کی کمر کے آگے ہل رہا تھا۔ اس کا گاڑھے کا کرتا بوتلوں کے تھیلے کے نیچے کچھ کچھ ابھرا ہوا تھا۔

نل پار کرتے ہی اِندر کی ساری ذہنی قوت جیسے اس کے دائیں ہاتھ میں آگئی۔ اس کا دماغ نل کے آگے کا فاصلہ جیسے ایک ایک بالشت کے حساب سے گننے لگا تھا۔ بوتلوں کا تھیلا جھول رہا تھا۔ کمر بار بار سامنے آ رہی تھی اور عطر فروش کے پَٹ پَٹ کرتے جوتے اس کے ساتھ ساتھ۔ بج رہے تھے۔

"بازار میں عطر کی پھیریاں زیادہ بکتی ہیں۔ گھروں میں عطر اور تیل زیادہ بکتا ہے۔" عطر فروش کہہ رہا تھا۔ اچانک اِندر لپکا اور اس نے پینترا مارا۔ عطر فروش کو ایسا لگا جیسے اس کی بائیں طرف کوئی چیز ہلی ہے۔ اسے احساس ہوا جیسے کوئی چیز چمکی بھی ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ گھوم کر دیکھے کہ کیا بات ہے اسے تھیلے کے نیچے تیکھی چبھن کا سا احساس ہوا۔ اِندر کا نشانہ ٹھیک بیٹھا تھا۔ وار کرنے کے بعد سردار کی ہدایت کے مطابق اس نے چاقو کو تھوڑا سا موڑ بھی دیا تھا اور انتڑیوں کے جال میں پھنسا دیا تھا۔

عطر فروش ابھی پوری طرح مڑ نہیں پایا تھا کہ اس نے دیکھا لڑکا پیچھے کی طرف بھاگا جا رہا ہے۔ اس کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے۔ اس کا دل چاہا کہ لڑکے کو آواز دے کر بلا لے لیکن اسی وقت اپنے پیروں پر خون بہتا نظر آیا اور کمر میں پہلے تو کچھ ہلکا اور پھر شدت سے درد ہونے لگا۔ پھر نشتر کی چبھن ہونے لگی۔ وہ ڈر کے مارے بدحواس ہو گیا۔

"ارے لوگو! مار ڈالا۔ مجھے مار ڈالا۔ او لوگو۔"

عطر فروش اتنا گھبرا گیا تھا کہ اس کے منھ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے، وہ کمر میں لگے زخم سے اتنا نہیں مر رہا تھا جتنا کہ خوف اور دہشت سے، اور ایک بھولے بھالے لڑکے کے ذریعے کیے گئے حملے سے۔ اس کے لیے اپنے تھیلوں کا بوجھ سنبھالنا ناممکن ہو رہا تھا۔ وہ ان کے بوجھ سے ہی منھ کے بل دھڑام سے گر پڑا۔ اِندر کے بھاگتے قدم اسے دو لمحہ پہلے صاف نظر آ رہے تھے لیکن اب گلی میں اس لڑکے کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

"او، لوگو۔۔۔!" اس کی دبی دبی سی آواز نکلی۔

پھر ایک گھٹی گھٹی سی چیخ اس کے ہونٹوں سے باہر آئی اور اس کی آنکھیں گلی کے اوپر پھیلے نیلے آسمان کے چھوٹے سے ٹکڑے پر مرکوز ہو گئیں۔ وہاں دو تین چیلیں اڑ رہی تھیں۔ چیلیں اب دو کی جگہ چار ہو گئی تھیں اور آسمان کی نیلاہٹ آہستہ آہستہ ہلتی اور گھومتی نظر آنے لگی تھی۔

13

ننھو پریشان تھا۔ اپنی کوٹھری کے باہر بیٹھا وہ چلم پر چلم پھونکے جا رہا تھا۔ جتنا زیادہ مارکاٹ کی افواہوں کو سنتا، اتنا ہی زیادہ اس کا دل بیٹھتا جاتا۔ بار بار اپنے دل کو سمجھاتا، میں انتریامی تو نہیں ہوں، مجھے کیا معلوم، کس کام کے لیے مجھ سے سؤر مروایا جا رہا ہے۔ کچھ دیر کے لیے اس کا دل ٹھکانے بھی آجاتا، لیکن پھر جب کسی واردات کی خبر سنتا تو پھر بے چین ہونے لگتا۔ یہ سب میرے کیے کا پھل ہے۔ سب ہی چمار صبح سے ایک دوسرے کی کوٹھریوں کے باہر بیٹھے بیڑیاں پھونکتے ہوئے ان ہی واقعات کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ننھو بار بار ان کے درمیان جا کھڑا ہوتا۔ وہ خود بھی بتانے کی کوشش کرتا لیکن اس کا حلق بار بار سوکھنے لگتا، ٹانگیں کانپنے لگتیں اور وہ اپنی کوٹھری میں واپس آجاتا، کیا میں اپنی بیوی سے ساری بات کہہ دوں؟ وہ سمجھ دار عورت ہے۔ میری بات سمجھ جائے گی، میرا دل ہلکا ہو جائے گا۔ کبھی اس کا دل چاہتا کہ شراب کا پوا کہیں سے مل جاتا تو کچھ دیر کے لیے بے سدھ پڑا رہتا۔ لیکن اس وقت شراب کہاں ملنے والی تھی؟ عورت کو بتانا بھی مصیبت مول لینا تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے کسی سے کہہ دیا تو پھر کیا ہوگا؟ مجھے کوئی چھوڑے گا نہیں۔ کیا معلوم، پولس ہی مجھے پکڑ کر لے جائے؟ پھر کیا ہوگا، میری بات کون مانے گا کہ مراد علی کے کہنے پر میں نے ایسا کام کیا ہے؟ مراد علی تو مسلمان ہے، کیا وہ مسجد کے سامنے سؤر پھکوانے کا کام کرے گا؟ ننھو بے چین ہو جاتا تو اس کا دماغ اس خلش سے نجات پانے کے لیے دوسرے انداز میں سوچنے لگتا۔ وہ سؤر ضرور کوئی دوسرا ہوگا۔ یہ وہ سؤر تھا ہی نہیں جسے مسجد کے سامنے پھینکا گیا تھا۔ میں نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ یہ کالا سؤر تھا تو دوسرا کوئی سؤر بھی تو کالے

رنگ کا ہو سکتا ہے۔ کیا دو سوٗر کالے رنگ کے نہیں ہو سکتے؟ یہ میرا وہم ہے۔ میں خواہ مخواہ اس طرح سوچے جا رہا ہوں۔ یہ سچ مچ کوئی دوسرا سوٗر تھا۔ اس انداز میں سوچنے کے بعد وہ اپنی بیوی کے ساتھ ہنسنے اور باتیں کرنے لگتا۔ خود ہی اٹھ کر کسی پڑوسی کی کوٹھری میں جا بیٹھتا اور منڈی کی آگ پر بحث کرنے لگتا۔ لیکن دل کی یہ حالت بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی تھی۔ اس رات کی بات کو یاد کر کے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ سنسان علاقہ، بدبو اور سیلن بھری کوٹھری، چوری سے لایا گیا سوٗر، اور اندھیرے کے پردے میں آتا ہوا کالو کا چھکڑا۔ سارے کا سارا واقعہ کسی بُرے خواب کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا۔ کبھی مویشی اسپتال کے ڈاکٹر اس طرح سے بھی سوٗر کٹوائیں گے؟ "بگری کے سوٗر گھومتے رہتے ہیں۔ کسی ایک کو پکڑ لینا۔۔۔ رات کو چھکڑا آئے گا، اس میں ڈال دینا۔۔ جب تک میں نہ آؤں میری راہ دیکھنا۔" کبھی یوں بھی کام ہوئے ہیں؟ کیا یہ بھی کوئی ڈھنگ ہے کام کرنے کا؟ اس کا دل چاہا کہ سیدھا اٹھ کر کالو بھنگی کے پاس جائے اور اس سے پوچھے کہ وہ سوٗر کہاں لے گیا تھا۔ مراد علی کے پاس سیدھا جائے اور اس سے کہے۔۔۔ لیکن مراد علی کیا کہے گا؟ اگر اس کے دل میں چور ہے تو وہ اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دے گا۔ بلکہ الٹا مجھ پر الزام لگائے گا۔ وہ الٹا مجھے ہی پکڑوا سکتا ہے۔۔۔

اس نے پھر چلم اٹھالی۔ بھاڑ میں جائے مراد علی اور اس کا سوٗر! جو ہوگا دیکھا جائے گا میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا ہے، میں نے تو جو کچھ کیا انجانے میں کیا۔ یہ لوگ جو آگ لگا رہے ہیں اور راہ چلتے لوگوں کو مار رہے ہیں، یہ تو آنکھیں کھول کر سب کام کر رہے ہیں۔ یہ کیوں بُرا کام کر رہے ہیں۔ میں نے ایک سوٗر مار دیا، اس سے کیا ہوتا ہے؟ ایک سوٗر کو مار دینے میں رکھا ہی کیا ہے؟ میں مجرم ہوں تو کیا یہ لوگ مجرم نہیں ہیں۔ اور وہ لوگ جنھوں نے منڈی میں آگ لگائی ہے؟ میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا۔ ہو گیا۔ جو ہونا تھا۔ مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔۔۔۔

نتھو کو اپنے باپ کی یاد آئی۔ بھگوان سے ڈرنے والا آدمی تھا وہ۔ ہمیشہ یہی تعلیم دیتا تھا۔ "بیٹا، اپنے ہاتھ صاف رکھنا۔ جس کا ہاتھ صاف ہے وہ کوئی بُرا کام نہیں کرتا۔۔ عزت کی روٹی کھانا۔۔۔" نتھو کو یہ بات یاد کر کے رونا آگیا۔ اس کی چھاتی پر پھر بوجھ بڑھنے لگا ناقابل برداشت ہونے لگا۔

میدان کے پار کوئی آدمی چلتے چلتے رک گیا تھا اور مڑ کر چماروں کے ڈیرے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ننھو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اسے لگا جیسے وہ اسی کو ڈھونڈھنے آیا ہے، جیسے اسے پتہ چل گیا تھا کہ ننھو نے ہی سوٗر کو مارا ہے۔

ننھو کی عورت دھوتی کے پلّو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی باہر نکلی۔ اسے دیکھ کر ننھو کے دل میں ہلچل ہوئی۔ اس کا دل چاہا کہ بیوی کو ساری بات بتا دے۔ کوئی تو ہو جس کو وہ اپنے دل کی بات بتا سکے۔

ننھو کی آنکھیں پھر میدان کے پار کھڑے آدمی کی طرف گھوم گئیں۔

"تو کیا دیکھ رہا ہے؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔ پھر میدان کے پار کھڑے اس آدمی کی طرف دیکھ کر بولی۔ "کون ہے وہ؟ کیا تو اسے جانتا ہے؟"

"نہیں تو۔ میں کیا جانوں، کون ہے! میں نہیں جانتا۔" ننھو نے کہا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔

"تو یہاں کیوں کھڑی ہے۔ جا اپنا کام دیکھ۔" ننھو نے روکھے پن سے کہا۔

اس کی بیوی ان ہی قدموں کوٹھری کے اندر واپس چلی گئی۔

ننھو نے کنکھیوں سے پھر سڑک کی طرف دیکھا۔ وہ آدمی جا رہا تھا۔ میدان کے سرے پر پہنچنے کے بعد اس نے سگریٹ سلگائی تھی اور اب سگریٹ کے کش لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

"میرا وہم تھا۔" ننھو نے دل ہی دل میں کہا۔ کام کے دن بیسیوں آدمی آتے ہیں جنھیں ہم لوگوں سے کام ہوتا ہے۔"

اس کا دل مطمئن ہو گیا۔ ناحق عورت سے جھلّا کر بولا۔ "سن تو!" اس نے بیوی کو پکار کر کہا۔ "تھوڑی چائے بنا دے۔"

اس کی بیوی دہلیز پر لوٹ آئی۔ اس کے جسم یا اس کی شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی کہ ننھو اسے اپنے قریب پا کر خود کو زیادہ محفوظ سمجھنے لگتا تھا۔ وہ گھر میں رہتی تو ایسا لگتا کہ گھر میں سکون و استقلال ہے۔ وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی تو ننھو کو محسوس ہوتا جیسے ساری دنیا ڈولنے لگی ہے۔ دل ہی دل میں وہ آج بھی چاہتا تھا کہ اس کی عورت اس کے پاس رہے۔ وہ کبھی پریشان یا مشتعل نہیں ہوتی تھی، گھبراتی نہیں تھی۔ اس کا

دل کبھی بہت زور سے نہیں دھڑکتا تھا۔ کوئی بات اس کے کلیجے کو چاٹتی نہیں تھی۔ یہ عورت گدرائے جسم والی ہے۔ میری طرح سوکھی پچکی نہیں ہے جو سارا وقت دل کا غم کھاتا رہتا ہوں۔ اس کے گداز جسم میں نتھو کو اپنے پن کا احساس ملتا تھا۔ اس کی چال ڈھال میں، ہر ایک حرکت میں استقلال، توازن تھا۔

وہ دہلیز پر آ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ ایک ہاتھ چوکھٹ پر رکھا تھا، اور زیرِ لب مسکرائے جا رہی تھی۔

"پہلے تو کبھی تم اس وقت چائے نہیں مانگتے تھے۔ آج چھٹی منا رہے ہو، اس لیے... ؟"

اس بات پر وہ تنک کر بولا! "چھٹی منا رہے ہو؟ یہ تجھے چھٹی نظر آ رہی ہے۔ تو نہیں بنا سکتی تو میں خود بنا لوں گا۔ لمبی بات کیوں کرتی ہے؟"

اور نتھو اٹھ کر کوٹھری کے اندر چلا گیا۔

"ابھی بنائے دیتی ہوں، چائے بنانے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ تو بگڑتا کیوں ہے؟"

"نہیں تو ہٹ جا۔ میں اپنے آپ بنا لوں گا۔" نتھو نے غصّہ سے کہا۔

"میرے ہوتے ہوئے تو چولہا چلائے گا۔ میں مر نہ جاؤں۔" وہ بولی اور آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے لگی "اٹھ جا۔ تجھے میرے سر کی قسم۔"

نتھو اٹھ کھڑا ہوا۔ گہری ٹیس سی اس کے دل میں اٹھی۔ پل بھر کے لیے وہ ٹھٹکا کھڑا رہا۔ پھر آگے بڑھ کر وہ اپنی بیوی سے لپٹ گیا۔

"آج تجھے کیا ہو گیا ہے؟" اس کی عورت نے کہا اور ہنس دی۔ لیکن شوہر کی باہوں میں پہنچ کر اسے اس کے دل کی خلش کا احساس ہونے لگا۔ کوئی بات ہے جو نتھو کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہی ہے اور جس کی وجہ سے یہ کل رات سے عجیب سا برتاؤ کر رہا ہے۔

"کل رات سے تم کیسی بہکی بہکی سی باتیں کر رہے ہو؟" اس نے کہا۔ "ایسا نہیں کیا کرو جی! مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ہمیں کیوں ڈر لگے گا، ہم نے کسی کا گھر نہیں جلایا ہے۔" نتھو نے عجیب سا جواب دیا۔

اس کی پیٹھ پر بیوی کا ہاتھ ساکن ہو گیا لیکن وہ ننھو کو اپنی باہنوں میں لیے رہی۔
ننھو کا ہیجان اور اضطراب دونوں ہی مسلسل بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح ویسا ہی برتاؤ کرنے لگا جیسا کل رات کر رہا تھا۔
اچانک اس کی نگاہوں کے سامنے سوّر کی لاش گھوم گئی۔ فرش کے بیچوں بیچ، چاروں ٹانگیں اوپر کو اٹھی ہوئی اور نیچے خون بہتا ہوا۔ وہ کانپ اٹھا۔ بیوی کی باہنوں میں ننھو کا جسم جیسے ٹھنڈا پڑنے لگا۔ اس کے کندھوں پر پسینے کی پرت آ گئی اور اس کی بیوی نے محسوس کیا جیسے اس کا دل بھٹک کر پھر کہیں دور چلا گیا ہے۔ کھڑے کھڑے ننھو کے منھ سے سسکی سی نکل گئی اور وہ بیوی سے الگ ہو گیا۔
"ہائے، آج نہیں۔ میرا دل نہیں کرتا۔ دیکھو تو باہر کیا ہو رہا ہے، لوگوں کے گھر جل رہے ہیں۔"
ننھو اضطراب کے عالم میں کھڑا ہو گیا اور دیر تک ٹھٹکا کھڑا رہا۔
"کیا ہے؟" اس کی بیوی گھبرا کر بولی۔ "تم اتنے گم صُم کیوں ہو گئے ہو؟ سچ سچ بتاؤ۔ تمھیں میرے سر کی قسم۔"
لیکن ننھو چپ چاپ ہٹ کر کھاٹ پر جا بیٹھا۔
"کیا ہوا ہے؟"
"کچھ نہیں۔"
"کچھ تو ہوا ہے۔ تو مجھ سے چھپا رہا ہے۔"
"کچھ نہیں۔" اس نے دوبارہ کہا۔
بیوی ننھو کے پاس آ گئی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی: "تو بولتا کیوں نہیں؟"
"کچھ کہنے کو ہو تو بولوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔
"چائے بنا دوں۔ ٹھہر۔ میں چائے بنائے دیتی ہوں۔"
"مجھے چائے نہیں چاہیے۔"
"ابھی تو خود بنانے کو کہہ رہا تھا۔ ابھی چائے نہیں چاہیے۔"
"نہیں مجھے نہیں چاہیے۔"

"اچھا پھر چل، گھاٹ پہ چل۔" اس کی بیوی نے ہنس کر کہا۔

"نہیں۔ گھاٹ پر بھی نہیں چلوں گا۔"

"ناراض ہو گیا؟ تو مجھ سے بات بات پر ناراض ہونے لگتا ہے۔" بیوی نے شکایت کے لہجے میں کہا۔

ننھو خاموش رہا۔ وہ سچ مچ بسورتے بچے کی طرح برتاؤ کر رہا تھا۔

"تو پرسوں رات کہاں گیا تھا؟ تو نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔" ننھو کی بیوی نے کہا اور اس کے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔

ننھو نے ٹکٹکی باندھ کر بیوی کی طرف دیکھا۔ اسے ضرور پتہ چل گیا ہے۔ سب ہی لوگوں کو دیر سویر پتہ چل جائے گا۔ ننھو کو ایسا لگا جیسے اس کی ٹانگیں کانپنے لگی ہیں۔

"نہیں بتائے گا تو میں یہیں سر پیٹ لوں گی۔ تو کبھی بھی مجھ سے دل کی بات نہیں چھپاتا تھا۔ آج کیوں چھپانے لگا ہے؟"

ننھو کی آنکھیں دیر تک بیوی کے چہرے پر ٹکی رہیں۔ اگر اسے شک ہو گیا ہے تو نہ جانے کیا سوچ رہی ہو گی۔ میرے بارے میں کیا سوچنے لگی ہو گی۔ لیکن بیوی کی اعتماد بھری، پُر تجسس نگاہیں ابھی اس کی طرف دیکھے جا رہی تھیں۔ پھر اچانک وہ اپنے آپ ہی بولنے لگا:

"تجھے معلوم ہے منڈی میں آگ کیوں لگی ہے؟"

"معلوم ہے، مسجد کے سامنے کسی نے سؤر مار کر پھینک دیا تھا۔ اس پر مسلمانوں نے منڈی کو آگ لگا دی۔"

"وہ سؤر میں نے مارا تھا۔"

ننھو کی بیوی کو کاٹو تو خون نہیں۔

"تو نے؟ تو نے یہ بُرا کام کیوں کیا؟"

اور اس کے چہرے کا سارا خون جیسے غائب ہو گیا۔ وہ ننھو کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی اور ننھو نے دھیرے دھیرے سارا قصّہ کہہ سنایا۔

"سؤر کو پھینکنے تو بھی گیا تھا؟" بیوی نے پوچھا۔

"نہیں۔ اسے کالو چھکڑے پر لاد کر لے گیا تھا۔"

"کالو تو مسلمان ہے۔ وہ کیسے لے گیا؟"

"کالو مسلمان نہیں ہے۔ وہ عیسائی ہے۔ گرجے میں جاتا ہے۔"
اس کی بیوی دیر تک اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی "تونے بہت برا کام کیا ہے۔ لیکن اس میں تیرا کیا قصور؟ تجھ سے لوگوں نے دھوکے سے یہ کام کروایا ہے۔ تونے دھوکے میں آ کر یہ کام کیا ہے۔" وہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ ننھو کی بات سن کر وہ سر سے پیر تک کانپ گئی تھی۔ اس کی بیوی کو ایسا لگا جیسے کسی بھیانک گرہ کی پرچھائیں ان کے گھر پر پڑ گئی ہے، جو برت رکھنے یا پرائشچت کرنے سے بھی نہیں ٹلے گی۔
اس کے دل پر ایک بوجھ آن گرا تھا، جو ہٹ نہیں رہا تھا۔
ننھو کے دل میں گہری ہوک سی اٹھی۔ بیوی نے آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے پریشان دیکھ کر بیوی کے دل میں پیار اور ہمدردی کا سوتا پھوٹ پڑا۔ وہ اٹھ کر ننھو کے پاس جا بیٹھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی "جب ہی تو میں کہتی تھی کہ یہ اتنا پریشان کیوں ہے۔ مجھے کیا معلوم۔ تونے بتایا کیوں نہیں۔ اپنا دکھ دل کے اندر نہیں رکھتے۔"
"مجھے معلوم ہوتا تو میں یہ کام کیوں کرتا؟" ننھو بڑبڑایا۔ "مجھ سے تو کہا تھا کہ سلوتری صاحب نے سوٗر مانگا ہے۔" پھر ننھو اپنی اس خلش میں اور بھی گہرا ڈوبتے ہوئے بولا۔ "کل رات مراد علی کو میں نے دیکھا تھا لیکن وہ مجھ سے بولا ہی نہیں۔ میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا، اور وہ آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ اس نے میرے ساتھ بات تک نہیں کی۔۔۔" ننھو کی آواز شک و شبہ میں کھو سی گئی، جیسے اس کے دل میں یہ شک پیدا ہو گیا کہ اس نے واقعی مراد علی کو دیکھا بھی تھا یا نہیں۔
"کتنے پیسے ملے تھے سوٗر مارنے کے؟"
"پانچ روپے۔ وہ مجھے پیشگی ہی دے گیا تھا۔"
"پانچ روپے؟ اتنے زیادہ؟ تونے کیا کیا ان روپیوں کا؟"
"کچھ نہیں کیا۔ چار روپے بچ رہے ہیں، اُدھر طاق پر رکھے ہیں۔"
"مجھے بتایا کیوں نہیں؟"
"میں نے سوچا تھا، تیرے لیے دھوتیوں کا جوڑا لاؤں گا۔"
"میں ان پیسوں کی دھوتیاں لوں گی؟ میں ان پیسوں کو آگ نہیں لگاؤں گی۔" ننھو کی بیوی نے غصّے کی حالت میں کہا۔ "تم سے ایسا بُرا کام کروایا۔" لیکن پھر

سنبھل گئی۔ مسکرانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی بولی۔ "یہ تو تیری کمائی کے پیسے ہیں۔ میں کیوں نہیں لوں گی۔ ان سے جو تو چاہے گا، خرید لوں گی۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور طاق کے پاس گئی۔ ایڑیاں اٹھا کر طاق کے اوپر رکھی رقم کو دیکھا، پھر شوہر کی طرف واپس آئی۔ نتھو کی گردن اور زیادہ جھک گئی تھی اور وہ پھر کسی گہری اندھیری کوہ میں جا پہنچا تھا۔

"تو نے وہ آدمی دیکھا تھا جو میدان کے پار کھڑا تھا"، نتھو نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"ہاں، مگر اس سے کیا ہوا؟"

"میں سوچتا ہوں کہ وہ باگڑی تھا جس کا سوئر میں نے اندر کھینچ لیا تھا۔ اسے ضرور پتہ چل گیا ہوگا۔"

"تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ پتہ چل گیا ہے تو آکر تم سے لے لے۔ تم کیسی بہکی بہکی باتیں کرنے لگے جی؟" نتھو کی بیوی نے اونچی آواز میں کہا۔ پھر سر ٹیک کر بولی "دیکھو جی! ہم لوگ چمڑے کا کام کرتے ہیں۔ جانوروں کی کھال کھینچنا، انھیں مارنا ہمارا کام ہے۔ تو نے سوئر کو مارا۔ اب وہ اسے مسجد کے سامنے پھینکے یا ہاٹ بازار میں بیچے، اس سے ہمیں کیا۔ اور تمھیں کیا معلوم کہ یہ وہی سوئر تھا جسے مسجد کے سامنے پھینکا گیا تھا۔ تمھارا اس میں کیا ہے؟" پھر وہ بڑی لاپرواہی کے انداز میں بولی "میں تو ان پیسوں کی دھوتیاں لوں گی، ضرور لوں گی۔ تیری کمائی کے پیسے ہیں۔ محنت کی مزدوری ہے۔" اور وہ پھر طاق کی طرف گئی اور ہنستے چہکتے اس نے طاق پر سے پیسے اٹھا لیے لیکن پھر فوراً ہی انھیں وہیں پر رکھ دیا۔

"ہاں مجھے کیا! تو ٹھیک ہی تو کہتی ہے مجھے کیا۔ بھاڑ میں جائے مراد علی اور اس کا سوئر۔ میں بھی کل یہی کہتا تھا۔۔۔" نتھو نے کہا اور پھر سکون اور اطمینان سا محسوس کرنے لگا۔

"اب پورے پندرہ روپے میرے پاس ہو گئے۔۔۔ اب تو بھی اپنے لیے کچھ لے لینا۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" نتھو جذباتی انداز میں بولا "جب تو میرے پاس ہوتی تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرے پاس سب کچھ ہے۔"

نتھو کی بیوی جھٹ سے کوٹھری کے اندر میں رکھے چولہے کے پاس جا بیٹھی اور چائے بنانے لگی۔

جس کا دل صاف ہوتا ہے اسے بھگوان کچھ نہیں کہتے۔" وہ کہنے لگی "ہمارا دل صاف ہے۔ ہمیں کسی کا ڈر کیوں ہونے لگا۔" پھر وہیں بیٹھے بیٹھے بولی "مجھے تو بتا دیا لیکن اب

ڈیرے میں اور کسی سے مت کہنا۔"

"نہیں۔ میں کیوں کہوں گا! تو بھی کسی سے مت کہنا۔"

ننھو کی بیوی گلاسوں میں چائے ڈال رہی تھی جب میدان کے پار کسی کے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ ننھو کی بیوی کا ہاتھ ٹھٹک گیا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر ننھو کی طرف دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں، الٹے مسکرادی۔

تھوڑی دیر بعد باڑے میں سے کسی چمار کی آواز آئی۔ ایک چمار دوسرے سے پوچھ رہا تھا۔ "کیا ہوا ہے چاچا؟"

"دنگا ہو گیا ہے، راستے میں۔"

"کہاں؟"

"راستے میں۔ ہندو مسلمان کا دنگا ہے۔ کہتے ہیں، دو آدمی مارے گئے ہیں۔"

"یہ آدمی کون تھا، جو بھاگا جا رہا تھا؟"

"نہیں معلوم کون تھا...... کوئی باہر کا آدمی ہوگا۔"

کوٹھری کے اندر اور باہر پھر سے خاموشی چھا گئی۔ چمار اپنی کوٹھری کے اندر چلا گیا تھا، یا پچھواڑے چلا گیا تھا۔

ننھو کے ہاتھ میں گلاس دیتے ہوئے اس کی بیوی نے کہا۔ "تم بھی جاؤ، ڈیرے والوں سے مل لو۔ چلو، میں بھی چلتی ہوں۔ یہاں بیٹھے بیٹھے کیا کریں گے۔"

ننھو کی بیوی اٹھی اور اچانک، جھاڑو لے کوٹھری جھاڑنے لگی۔ ایک ایک کونا، ایک ایک چیز اٹھا کر نیچے سے جھاڑو لگانے لگی۔ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ جیسے وہ جھاڑو سے کسی پرچھائیں کو اپنی کوٹھری میں سے جھاڑ کر باہر کر دینا چاہتی ہو۔ دیر تک وہ کوٹھری کو جھاڑتی رہی۔ پھر اس نے کوٹھری کے فرش کو دھویا۔ خوب پانی ڈال ڈال کر فرش دھوتی رہی۔ لیکن آخر میں جب تھک کر کھاٹ پر بیٹھی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے بند دروازے کی دراڑوں میں سے بڑی بڑی پرچھائیاں پھر کوٹھری میں واپس آ گئی ہے۔ کوٹھری تاریک ہو گئی ہے اور وہ پرچھائیں کوٹھری کے اندر چاروں طرف مسکراتی پھر رہی ہے۔

دوسری فصل

14

پہلی بس خان پور سے چل کر صبح آٹھ بجے گاؤں میں پہنچتی تھی، وہ نہیں آئی۔ اس کے بعد ہر گھنٹے دو گھنٹے بعد شہر کی طرف سے بھی اور خان پور کی طرف سے بسیں آتی تھیں۔ آج دوپہر ہوگئی، ایک بھی بس نہیں آئی۔ چائے کی دکان میں کیتلی پر چڑھایا پانی صبح سے کھولتا رہا۔ دکان کے سامنے کے دونوں بینچ خالی پڑے تھے۔ پہلے بینچوں پر بھیڑ لگی رہتی تھی۔ گاؤں کا ایسا کوئی آدمی نہیں تھا جو آتے جاتے ہرنام سنگھ کی دکان پر نہ بیٹھتا ہو۔ بس اسٹاپ پر دو تین جھبریلے کتے گھوم رہے تھے۔ چاروں طرف جیسے سکتہ چھا گیا تھا۔

عورت کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ بنتو نے کل شام سے ہی کہنا شروع کر دیا تھا کہ اس گاؤں سے نکل چلو۔ خان پور چلے چلو جہاں ہمارے اور قریبی رشتہ دار رہتے ہیں۔ اس پورے گاؤں میں صرف یہ دو نفر سکھ خاندان کے تھے۔ باقی سارا گاؤں مسلمانوں کا تھا۔ لیکن ہرنام سنگھ نہیں مانا۔ چلتی دکان چھوڑ کر کیسے بھاگ جائے؟ جھگڑے فساد تو ہوتے رہتے ہیں لیکن کام دھندا تو بند نہیں کیا جا سکتا۔ پھر جائیں تو کہاں جائیں؟ شہر میں جائیں جہاں پہلے سے آگ لگ رہی ہے؟ خان پور جائیں تو وہاں کون کھلانے کے لیے بیٹھا ہے؟ ہمارے پیچھے کسی نے دکان لوٹ لی تو پھر کھائیں گے کہاں سے؟ بیٹے کے پاس جائیں۔ بیٹا بیس میل دور میر پور گاؤں میں بیٹھا ہے۔ جیسے ہم یہاں اکیلے ہیں، ویسے ہی وہ وہاں پر اکیلا ہے۔ جہاں بیٹھے ہو، گورو مہاراج کے آسرے وہیں بیٹھے رہو۔ اس کے پاس پہنچ بھی گئے تو وہ ہم بوڑھوں کی جان بچائے گا یا اپنی جان بچائے گا؟ اپنی جیب سے بھی کھائیں گے تو کتنے دن؟ اور دوسرا کوئی کھلائے گا تو کتنے دن؟ اور چوکی پر بیٹھا

ہرنام سنگھ گود میں رکھے ہاتھ جوڑ دیتا اور کہتا ۔

"جس کے سراوپرے توں سو آمی سو دکھو کیسا پاوے ۔"

(اے مالک ! جس کے سر پر تیرا ہاتھ ہے وہ دکھ کیوں پائے گا ۔)

بنتو سنتی اور چپ ہو جاتی ۔ پھر جب اندر ہی اندر اس کا دل ڈوبنے لگتا تو کہتی ۔
"چلو میری بہن کے گاؤں چلے چلو، وہ تو نزدیک ہے ۔ وہاں گورودوارے میں پڑے رہیں گے، بہن کے پاس نہیں رہیں گے ۔ وہاں سکھ سنگت بڑی ہے ۔ اپنے لوگوں کا آسرا ہوتا ہے، لیکن ہرنام سنگھ نے یہ بات نہیں مانی ۔ اسے اعتماد تھا کہ اور لوگوں کے ساتھ چاہے کتنا ہی برا بھلا ہو جائے، اس کے ساتھ نہیں ہو سکتا ۔

سُن بھاگے بھاریے، اساں کدے کسے دا بُرا نہیں چیتیا، برا نہیں کیتا ۔ اتھو دے لوکی (بی) ساڈے نال (بھرادار) وانگ رہے ہن ۔ تیریاں اکھاں ساہمنے کریم خاں دس وارا کہہ گیا ہے ۔ چپ چاپ بیٹھے رہوو تہاڈے وَل کوئی اکھ چک کے دی نہیں وکھیگا ۔ کریم خاں توں بڑا موتبر اِتھے کون ہے ؟ اِکو اک اِتھے سکھ گھر ہے ؟ کے گراں والیاں نوں ساڈے تے ہتھ چکدیاں غیرت نہیں آئے گی ؟"

(سن بھاگیہ وان ! ہمیں کسی کا کچھ نہیں، ہم نے کسی کا برا کبھی نہیں چاہا ہے کبھی کسی کے ساتھ برا برتاؤ نہیں کیا ۔ یہ لوگ بھی ہمارے ساتھ کبھی بری طرح پیش نہیں آئے ہیں ۔ تیرے سامنے کچھ نہیں تو دس بار کریم خاں کہہ گیا ہے کہ آرام سے بیٹھے رہو ۔ تمھاری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا ۔ اب کریم خاں سے زیادہ معتبر اس گاؤں میں اور کون ہوگا ؟ سارے گاؤں میں ایک ہی تو سکھ گھر ہے ۔ انھیں غیرت نہیں آئے گی کہ ہم نہتے بوڑھوں پر ہاتھ اٹھائیں گے ۔)

بنتو پھر خاموش ہو گئی ۔ دلیل کا جواب دلیل سے دیا جا سکتا ہے لیکن اعتبار کا جواب دلیل کے پاس نہیں ہے ۔ جہاں بنتو کا دل کبھی کبھی ڈوبنے لگتا، وہاں ہرنام سنگھ ایک بار بھی پریشان نہیں ہوا ۔ اس کا چہرہ برابر کھلا رہا ۔ وہ ہر وقت گورو مہاراج کا نام لیتا تھا اور اسے دیکھ کر بنتو کی بھی تسلی ہوتی تھی ۔

لیکن آج کوئی بس نہیں آئی تھی ۔ ایک بھی گاہک دکان پر نہیں چڑھا تھا، اور سڑک سونی پڑی تھی ۔ البتہ دو تین بار اس نے دیکھا کہ چند اجنبی آدمی جو پہلے کبھی نظر نہیں آئے تھے

گاؤں کی طرف جاتے ہوئے نظر آئے تھے۔ وہ لوگ چلتے چلتے ان کے گھر کی طرف گھور کر بھی دیکھتے رہے تھے۔

اور جب دوپہر ڈھلنے لگی، تو ڈھکی پر سے اس کو کسی کے قدموں کی جانی پہچانی سی آہٹ سنائی دی۔ کریم خاں لاٹھی ٹیکتا چلا آرہا تھا۔ ہرنام سنگھ کی ہمت بندھی۔ کریم خاں کچھ بتائے گا، کوئی مشورہ دے گا، کوئی ترکیب نکالے گا۔ یہاں خطرہ ہوا تو ہم کریم خاں کے ڈیرے پر چلے جائیں گے۔

کریم خاں دکان کے سامنے آیا، لیکن رکا نہیں، اور اس نے ہرنام کی طرف رخ بھی نہیں کیا، صرف چال دھیمی کر دی اور کھنکھارنے کے بہانے بُدبدایا۔

" حالات اچھے نہیں، ہرنام سنگھ۔ تو چلا جا۔" دو ایک قدم چل کر پھر بولا " گاؤں والے تو تیرے دَل اَکھ دی نہیں چُکنگے، لیکن باہروں لوکاں کے آن دا ڈر ہے۔ انہاں نوں روکنا ساڈے بس دا نہیں۔"

اور پھر کھانستا ہوا، لاٹھی ٹیکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

آج پہلی بار ہرنام سنگھ کے اعتماد کی بنیاد بری طرح ہل گئی۔ کریم خاں رکا نہیں تو اس کا مطلب ہے، سچ مچ خطرہ ہے اور جو کریم خاں آیا ہے تو خطرہ مول لے کر ہی آیا ہوگا۔ پھر بھی ہرنام سنگھ اتنا گھبرایا نہیں جتنا کہ اداس ہو گیا۔ اس کے دل میں بیزاری کا احساس زیادہ تھا، رنج، غصہ، خوف وغیرہ کم۔

پانچ چھ منٹ بعد کریم خاں پھر واپس آیا۔ پھر ویسے ہی ڈھکی چڑھتے، کمر پر ہاتھ رکھے ہانپتے، کھنکھارتے ہوئے اپنی رفتار دھیمی کی اور بُدبدایا۔" دیر نہیں کر ہرنام سنگھ، حالت چنگی نہیں، باہروں بلوائیاں آن دا ڈر ہے۔" پھر اسی طرح کمر پر ہاتھ رکھے ہانپتا ہوا واپس چلا گیا۔

ہرنام سنگھ کہاں جائے؟ میلوں دور تک گھاٹیاں، میدان اور راستے پھیلے ہوئے تھے۔ کریم خاں نے تو کہہ دیا کہ چلے جاؤ۔ مگر وہ کہاں جائے؟ انھیں کہاں پناہ مل سکتی ہے۔ ساٹھ برس کی عمر اور ساتھ میں عورت ذات۔ وہ کتنی دور تک بھاگ کر جا سکتا ہے؟ پھر بھاگ کر جائے گا بھی تو کہاں جائے گا؟

دل کے اندر سے پھر ایک بار آواز آئی۔ کہیں مت جاؤ۔ یہیں بیٹھے رہو۔ جب

بلوائی آئیں تو دکان بھی پیش کر دینا اور جان بھی پیش کر دینا۔ یہاں مر جانا اچھا ہے پردیس کی خاک چھاننے سے۔ کون آئے گا حملہ کرنے ؟ بار بار وہ سوچتا لیکن یقین نہیں آتا تھا کہ گاؤں کا کوئی آدمی اس پر حملہ کرنے آئے گا، یا گاؤں والے باہر والوں کو حملہ کرنے دیں گے۔

ہرنام سنگھ اٹھ کر پیچھے کوٹھری میں آگیا جہاں بنتو بیٹھی تھی۔

"کریم خاں آکر کہہ گیا ہے کہ یہاں سے نکل جاؤ۔ بلوائی آرہے ہیں۔"

پل بھر میں بنتو کے سارے جسم میں پانی بھر گیا۔ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ رات سر پر آنے والی تھی اور کہیں پر ٹھور ٹھکانا نہیں تھا۔ اور ادھر اندھیری کوٹھری میں کھڑا اس کا شوہر غم کی تصویر لگ رہا تھا۔

لیکن اب نہ سوچنے کا وقت تھا، نہ زیادہ ٹھہرنے کا۔ جتنی جلدی ہو سکے اندھیرا پڑتے ہی یہاں سے نکل چلو۔

"میں تو اب بھی یہی کہتی ہوں، یہیں بیٹھے رہو، کہیں نہیں جاؤ۔" پھر اس نے ایک دیوار کے ساتھ ٹنگی اپنی دونالی بندوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مرنے مارنے پر نوبت آگئی تو میں پہلے تمھیں مار دوں گا، پھر اپنے آپ کو مار ڈالوں گا۔"

بنتو چپ چاپ سنتی رہی۔ کیا کہے، کیا مشورہ دے؟ سامنے چارہ ہی کیا تھا؟

ہرنام سنگھ دکان کے چبوترے پر واپس گیا۔ ٹاٹ کے نیچے سے کمائی کے پیسے نکالے، پھر اندر آیا، بکسے میں سے پونجی کے پیسے نکالے۔ پھر نوٹوں کو الگ سے چھانٹ لیا، اور ریزگاری وہیں چھوڑ دی۔ نوٹوں کا پلندہ بنڈی کی اندر کی جیب میں رکھ لیا۔ پھر کوٹھری کے اندر دیوار پر ٹنگی بندوق اتار لی اور اسے کندھے سے لٹکا لیا۔ دکان کی رجسٹری کے کاغذات لے لوں، لیکن انھیں ڈھونڈھ نکالنے کا وقت نہیں تھا۔ بنتو کی بھی یہی حالت تھی۔ اپنا زیور اٹھا لوں؟ کھانے کے لیے کہاں ملے گا۔ اپنے کپڑے بدل لوں؟ باہر جاؤ تو کپڑے اجلے پہن کر جانا چاہیے۔ لیکن بنتو کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا، کیا اٹھائے اور کیا چھوڑ دے؟

"گہنوں کی پوٹلی کا کیا کروں؟" اس نے پوچھا۔ "انھیں بدن پر پہن لوں؟"

"پہن لے۔" ہرنام سنگھ نے کہا۔ پھر ذرا سوچ کر بولا۔ "تیرے گہنے دیکھ کر ہی تجھے

کوئی مار ڈالے گا۔ انھیں دکان کے پیچھے گاڑ دے۔"

بنتو نے قمیص کے نیچے زیور پہن لیا۔ کچھ رومال میں لپیٹ کر ٹرنک کے اندر چھوڑ دیا۔ باقی زیور پچھواڑے زمین میں گاڑ آئی جہاں انھوں نے سبزی کی کیاریاں لگا رکھی تھیں۔ کوٹھری میں صندوق رکھے تھے، کھیس، دریاں، پورے کے پورے بستر تھے جو بیٹی کے بیاہ کے وقت بنوائے تھے، کتنا کچھ تھا اور کچھ بھی نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔

"دو روٹیاں سینک لوں؟ جانے کہاں کہاں بھٹکنا ہوگا؟"

"روٹیاں سینکنے کا وقت کہاں رہ گیا ہے بھلی مانس۔ پہلے سے جانے کا ارادہ ہوتا تو یہ بھی کر لیتے۔"

تب ہی کہیں دور سے ڈھول بجنے کی آواز آئی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"بلوائی آ گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے خانپور کی طرف سے آئے ہیں۔"

اُدھر ڈھول بجنے کی آواز آئی۔ اِدھر گاؤں میں ڈکّی کے پار سے نعرے لگنے شروع ہو گئے۔

"یا علی!"

"اللہ اکبر!"

'یہ اشرف اور لطیف ہوں گے' وہی گاؤں کے لیگی ہیں۔ وہی پاکستان کے نعرے لگاتے رہتے ہیں، ہرنام سنگھ نے دل ہی دل میں کہا۔

ماحول جیسے تھرّا اٹھا۔

شام ہو چکی تھی لیکن جھٹپٹا اندھیرے میں نہیں بدلا تھا۔ بلوائیوں کی آواز بائیں طرف کُسّی کے پار سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

تب ہی ہرنام سنگھ کی نظر کوٹھری کی چھت سے لٹکتے مینا کے پنجرے پر پڑی۔

"بنتو! پنجرہ کوٹھری کے پیچھے لے جا اور اسے کھول کر مینا کو اڑا دے۔"

کچھ ہی دیر پہلے بنتو نے مینا کے پنجرے میں رکھی کٹوریوں میں پانی اور دانہ ڈالا تھا۔ اب وہ پنجرے کو اتار کر باہر لے چلی تو مینا نے روزانہ کی طرح وہی رٹے الفاظ دہرا دیے۔

"بنتو! رب راکھا، سر بدھ دا رب راکھا۔"

یہ سنتے ہی بنتو کا دل بھر آیا اور جواب میں اُس نے بھی آہستہ سے کہا۔

"ہاں مینا! رب راکھا' سربدھ دا رب راکھا۔"

یہ الفاظ مینا نے ہرنام سنگھ سے سیکھ لیے تھے۔ جب ہرنام سنگھ دکان کے تھڑے پر بیٹھا ہوتا تھا اور اس کی بیوی پیچھے کوٹھری میں بیٹھی ہوتی اور جب دکان پر کوئی گاہک نہیں ہوتا تھا تو ہرنام سنگھ بنتو کے ساتھ گوروبانی اور دھرم کی باتیں کیا کرتا تھا۔ اس وقت وہ بار بار کہا کرتا تھا۔ "رب راکھا' سربدھ دا رب راکھا۔"

اور مینا ان لفظوں کو دہرانے لگی تھی

مینا کے منھ سے یہ الفاظ سن کر بنتو کو بڑی طاقت ملی۔ اس میں ہمت و استقامت آگئی' جیسے یہ ننھا پرندہ اسے جرأت کا سبق دے رہا ہو۔

پچھواڑے زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے میں ہرنام سنگھ نے سبزی بو دی تھی۔ ایک آم کا پیڑ لگا رکھا تھا۔ آنگن کے بیچوں بیچ پہنچ کر بنتو نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا اور آہستہ سے بولی "جا مینا! تیرا رب راکھا' سربدھ دا رب راکھا۔"

لیکن مینا جیوں کی تیوں پنجرے میں بیٹھی رہی۔

"اڑجا۔ مینا اڑجا۔ اڑجا' ماں صدقے۔"

اور یہ کہتے کہتے بنتو کا گلا بھر آیا۔ اور وہ پنجرے کو وہیں زمین پر چھوڑ کر لوٹ آئی۔

اسی وقت پھر ڈھول بجنے کی آواز آئی۔ اب کی بار آواز زیادہ نزدیک تھی۔ گاؤں میں بھی آواز کی بھنبھناہٹ بڑھنے لگی تھی۔ لگتا تھا جیسے بہت سے لوگ اکٹھے ہو کر کہیں سے بڑھے آرہے ہیں۔ گاؤں کے اندر سے بھی نعروں کی آواز کبھی کبھی آجاتی تھی۔

بنتو اور ہرنام سنگھ اپنے تین تین کپڑوں میں ملبوس' تھوڑی بہت پونجی اور بندوق سنبھالے دکان کو تالا لگا کر باہر نکل آئے۔ گھر کے باہر قدم رکھتے ہی سارا علاقہ ان کے لیے اجنبی ہو گیا۔ کہاں جائیں' کدھر کو گھومیں؟ بائیں طرف گاؤں پھیلا ہوا تھا۔ اسی طرف کستی تھی اور کستی کے پار بلوائیوں کے ڈھول سنائی دے رہے تھے۔ دائیں طرف کی پکی سڑک خان پور کی طرف چلی گئی تھی۔ اس طرف جانا بھی خطرے سے باہر نہیں تھا۔ سڑک کے پار کچھ فاصلے پر ایک نالا بہتا تھا۔ نالے کا پاٹ چوڑا تھا اور اس طرف کنارہ اونچا تھا۔ اگر کہیں جایا جا سکتا تو اسی راستے سے چھپ چھپا کر جایا جا سکتا تھا۔

سڑک پر چلنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ نالے میں پانی نہ ہونے کے برابر تھا۔ چوڑا پاٹ سوکھا اور ریتیلا تھا اور کنکروں اور پتھروں سے اٹا ہوا تھا۔

دونوں نے سڑک پار کی، اور تھوڑی دور تک جاکر نالے کی طرف اترنے لگے۔ تب تک بلوائی گاؤں کے قریب پہنچ چکے تھے اور اسی طرف بڑھے آرہے تھے۔ ماحول ان کے نعروں اور ڈھول مجیروں کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔

ہرنام سنگھ اور اس کی بیوی نالے کی طرف اتر رہے تھے جب اوپر کہیں سے ایک کمزور سی آواز آئی۔

"بنتو تیرا ربّا راکھا
سربدھ دا ربّا راکھا"

مینا ان ہی کے پیچھے پیچھے اڑکر چلی آئی تھی اور پیڑ پر بیٹھ گئی تھی۔

اسی وقت بلوائی اس ٹیلے کے اوپر پہنچ گئے، جس کی ڈھلان اترنے پر نیچے دائیں طرف ہرنام سنگھ کی دکان تھی۔ بلوائی چنگھاڑ رہے تھے۔ بلند آواز میں نعرے لگاتے، ڈھول بجاتے نیچے اتر رہے تھے۔

چاند نکل آیا تھا۔ چاروں طرف پھیلی چاندنی میں ہر درخت اور چٹان کے پیچھے کسی انجان دشمن کی موجودگی کا گمان ہونے لگتا تھا۔ ندی سوکھی پڑی تھی اور چاندنی میں ندی کا پاٹ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی سفید چادر بچھا دی گئی ہو۔ شوہر اور بیوی اونچے کنارے سے اتر آئے تھے اور اب اسی کی اوٹ میں دھیرے دھیرے دائیں طرف سے آگے بڑھنے لگے تھے۔ ندی کا کنارہ، جہاں وہ چل رہے تھے چھوٹے بڑے پتھروں سے اٹا پڑا تھا۔ دونوں ہانپنے لگے تھے اور دونوں کے کان بلوائیوں کی طرف لگے ہوئے تھے۔

شور پہلے تو نزدیک آتا گیا، پھر تھم گیا۔ ہرنام سنگھ کو ایسا لگا جیسے بلوائی اس کی دکان کے سامنے آکے رک گئے ہیں اور فیصلہ نہیں کر پارہے ہیں کہ اب کیا کریں۔ ہرنام سنگھ نے دل ہی دل میں کریم خاں کا شکریہ ادا کیا۔ وہ اگر وقت پر نہ کہہ دیتا تو بھاگنا بھی ناممکن ہو جاتا۔ پھر کسی چیز پر زور زور سے ضرب لگانے کی آواز آئی۔ ہرنام سنگھ سمجھ گیا کہ بلوائی اس کی دکان کا دروازہ توڑ رہے ہیں۔ آگے چلنے کی سکت نہیں تھی۔ دونوں کے پیر کانپ رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے آہستہ آہستہ آگے کی طرف سرکنے لگے۔

"واہ گورو کا نام لے کر چلتی رہو!" ہرنام سنگھ بیوی کو اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے بولا۔

اسی وقت کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ دونوں نے نظر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ اونچے کنارے پر پھیلی چاندنی میں ایک ڈراؤنا کالے رنگ کا کتا کھڑا ان پر بھونکے جا رہا تھا۔ ہرنام سنگھ کو کاٹو تو خون نہیں۔ اب کیا ہوگا؟ گورو مہاراج کس گناہ کی اتنی بھیانک سزا دے رہے ہیں؟ کتے کا بھونکنا سن کر وہ لوگ بھاگتے ہوئے اِدھر چلے آئیں گے۔ انھیں یہ جاننے میں دیر نہیں لگے گی کہ ہم کس راستے سے بھاگ کر آئے ہیں۔

"تم چلتے رہو جی، رکو نہیں۔" بنتو بولی۔

کتا برابر بھونکتا جا رہا تھا۔ جھبریلا کتا، جو اکثر اس کی دکان کے سامنے ٹہلتا، جگہ جگہ منھ مارتا نظر آیا کرتا تھا۔ کچھ دور تک چلتے رہنے کے بعد بنتو نے مڑ کر دیکھا۔ کتا ابھی تک ٹیلے پر کھڑا بھونکے جا رہا تھا، مگر آگے بڑھ کر نہیں آیا۔ نہ تو ٹیلے کے اوپر کنارے کنارے سے، اور نہ ہی نیچے اترا تھا۔

وہ آگے سرکتے گئے۔

"جیسے تیسے گاؤں پیچھے چھوٹ جائے، آگے بھگوان مالک ہے۔"

"کتا رک گیا ہے، آگے نہیں آ رہا ہے۔"

"بھونک تو رہا ہے۔"

ایک چٹان کے پیچھے دونوں چھپ کر کھڑے ہو گئے۔ اور دم سادھے کتے کا بھونکنا سنتے رہے۔ ادھر دکان کا دروازہ ٹوٹ کر گر گیا تھا اور "یا علی" چلاتے ہوئے بلوائی اس میں گھس گئے تھے۔

"لوٹ رہے ہیں ہمارا گھر بار لوٹ رہے ہیں۔"

لیکن کتے کے بھونکنے کی طرف کسی بلوائی کا دھیان نہیں گیا تھا۔ چلا بھی جاتا تو بھی شاید وہ ان کا پیچھا نہیں کرتے۔ انھیں مارنے سے ان لوگوں کو کیا ملتا۔ دکان میں سے تو کتنا مال ہاتھ لگنے والا تھا۔ وہ دونوں پہلے سے زیادہ مطمئن ہو گئے تھے۔

"اب کس کی دکان اور کس کا گھر بار! چھوڑ آئے تو ہمارا کہاں رہ گیا۔" بنتو نے کہا۔

چاندنی میں جھلملاتا ندی کے پاٹ کا پھیلاؤ، کہیں کہیں پیڑوں کے جھنڈ، ٹیلے کے اوپر کھڑا جھبریلا کتا، جو برابر بھونکے جا رہا تھا، یہ سب مل کر ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ کتنی جلدی سب کچھ بدل گیا ہے۔ بیس سال تک ایک جگہ رہنے کے بعد پلک مارتے وہ پردیسی اور بے گھر ہو گئے تھے۔ ہرنام سنگھ کا ہاتھ ٹھنڈا اور پسینے سے تر تھا۔ وہ بار بار ایک،

ہی جملہ دہرائے جارہا تھا۔ "نکل آؤ، اب جیسے بھی ہو، نکل آؤ۔"

گاؤں پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ کتا ابھی تک کنارے پر کھڑا تھا۔ وہ آگے نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر بعد شاید خود ہی واپس چلا جائے۔ دکان لوٹی جاچکی تھی۔ بلوائیوں کا شور تھم گیا تھا۔ لوٹ کے سامان سے ہی شاید وہ مطمئن ہو گئے ہوں گے یا پھر وہ انھیں تلاش کرنے کے لیے نکلیں گے؟ اب صرف کنکروں، پتھروں پر چلتے لڑکھڑاتے قدموں کی آواز آرہی تھی اور چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد بنتو کو لگا جیسے آسمان میں روشنی پھیل گئی ہے۔ اس نے مڑکر دیکھا تو نالے کے اونچے کنارے کے پیچھے گاؤں کی طرف آسمان لال ہونے لگا تھا۔ بنتو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

"دیکھوجی! کیا ہے؟"

"کیا ہے بنتو۔ دکان جل رہی ہے اور کیا ہے۔" ہرنام سنگھ نے کہا۔ وہ بھی کھڑا اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ حیرت زدہ سے آگ کے شعلوں کو دیکھتے رہے۔ اپنے گھر میں اٹھتے شعلے ضرور کسی دوسرے کے گھر میں اٹھنے والے شعلوں سے مختلف ہوتے ہوں گے ورنہ وہ کیوں بت کی طرح کھڑے کے کھڑے رہ جاتے اور انھیں تاکتے رہتے۔

"سب خاک ہو گیا۔" ہرنام سنگھ تھکی تھکی سی آواز میں بولا۔

"آنکھوں کے سامنے ہی سب خاک سیاہ ہو گیا۔"

"واہ گورو کو یہی منظور تھا۔" اس نے ٹھنڈا سانس لیا اور وہ پھر چلنے لگے۔

دیواریں آدمی کو چھپائے رہتی ہیں، لیکن یہاں کوئی دیوار نہیں تھی۔ صرف ٹیلے تھے۔ کہیں کہیں چٹانیں بھی تھیں جن کے پیچھے آدمی چھپ سکتا تھا، لیکن کتنی دیر کے لیے؟ چند گھنٹوں میں رات کا اندھیرا چھٹ جائے گا اور پھر وہ جیسے ننگے ہو جائیں گے، سر چھپانے کے لیے جگہ نہیں ملے گی۔

بنتو کا منھ سوکھ رہا تھا، اور ہرنام سنگھ کی ٹانگیں بار بار لڑکھڑا جاتی تھیں، لیکن اس وقت صرف وہ دونوں ہی نہیں بلکہ لاتعداد لوگ درجنوں گاؤوں میں سے نکل کر اپنی اپنی جان بچانے کے لیے اسی طرح بھٹک رہے تھے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کے کانوں میں بھی ٹوٹتے کواڑوں کی آوازیں پڑ رہی تھیں۔ لیکن ان کے پاس نہ تو سوچنے

کے لیے وقت تھا اور نہ مستقبل کے منصوبے باندھنے کے لیے۔ جان بچانے کی خاطر جیسے تیسے اس وقت تک چلتے رہو جب تک رات کے سائے تمھیں اپنی اوٹ میں لیے ہوئے ہیں جلدی ہی دن چڑھ آئے گا اور زندگی کے خطرے بھوکے بھالوؤں کی طرح چاروں طرف سے حملہ کردیں گے۔

کچھ ہی دیر میں وہ تھک کر چور ہو گئے تھے۔

لیکن جب سے انھیں اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ وہ بچ کر نکل آئے ہیں، تب ہی سے میاں بیوی دونوں کی نگاہوں کے سامنے اپنے بیٹے بیٹی کی تصویریں گھومنے لگی تھیں۔ اقبال سنگھ اس وقت کہاں ہوگا؟ اس پر کیا بیت رہی ہوگی؟ اور جسبیر کہاں ہوگی؟ جسبیر کی انھیں زیادہ فکر نہیں تھی اس لیے کہ جسبیر ایک بڑے قصبے میں تھی جہاں ان کی برادری کے لوگ زیادہ تعداد میں تھے۔ ممکن ہے ساری سکھ برادری گوردوارے میں اکٹھا ہوگئی ہو۔ ممکن ہے انھوں نے اپنے بچاؤ کا کوئی طریقہ ڈھونڈھ نکالا ہو۔ لیکن اقبال سنگھ تنہا تھا اور اپنے گاؤں میں چھوٹی سی بزازے کی دکان کرتا تھا۔ کیا معلوم وقت سے پہلے ہی نکل گیا ہو۔ کیا معلوم، اس وقت ہماری ہی طرح کہیں مارا مارا پھر رہا ہو۔ یہ سب ہی خیالات پریشان کن تھے۔ ہرنام سنگھ نے آنکھیں بند کرکے اور ہاتھ جوڑ کر گورو مہاراج کا نام لیا اور پھر ان کی بانی کے وہی الفاظ دہرا دیے:

"جس کے سر اوپری توں سوآمی
سو دُکھو کیسا پادے۔"

جب پَو پھٹنے کا وقت ہوا تو وہ ایک چھوٹے سے جھرنے کے کنارے پتھروں پر بیٹھے تھے۔ ہرنام سنگھ اس علاقے سے واقف تھا۔ وہ 'ڈھوک مرید پور' نامی ایک چھوٹے سے گاؤں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ساری رات فکر، اُدھیڑ بُن اور پاؤں گھسیٹنے میں گزر گئی تھی، لیکن پَو پھٹنے سے پہلے ہی اچانک دل کو سکون سا مل گیا تھا۔ ہوائیں دور سے تیرتی ہوئی لوکاٹوں کے بور کی مہک آئی۔ ڈھوک مرید پور میں لوکاٹوں کے باغ تھے اور ان کے بیچ میں جھرنے بہتے تھے۔ چاند کا رنگ پہلے تو نارنجی لال ہوا اور پھر پیلا پڑنے لگا۔ آسمان کے دھندلے رنگ میں پہلے تو زردی جھلکنے لگی پھر اس میں چاندی سی کھلنے لگی۔ پھر صاف نیلاہٹ آسمان میں پھیلنی شروع ہوئی۔ آس پاس پرندے چہچہانے لگے۔

"منھ دھولے بنتو! پھر جپ جی مہاراج کا پاٹھ کر کے چلیں گے۔"

صبح کی سہانی گھڑی میں ہرنام سنگھ کی خود اعتمادی جیسے واپس آگئی تھی۔

"اب جائیں گے کہاں؟" بنتو نے فکرمند آواز میں پوچھا۔ "دن بھر کہاں مارے مارے پھریں گے۔ دو روٹیاں سینک لی ہوتیں تو کوئی بات تھی، دن بھر بے شک یہیں کسی ڈھوک میں پڑے رہتے۔"

"اسی ڈھوک میں چل کر کسی کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ اس کے دل میں رحم ہوا تو آسرا دے گا، ورنہ جو گورو مہاراج کو منظور ہو۔"

"تم اس ڈھوک میں کسی کو جانتے نہیں ہو؟"

ہرنام سنگھ مسکرا دیا۔

"جہاں سب کو جانتا تھا وہاں کسی نے آسرا نہیں دیا، سامان لوٹ لیا، گھر کو آگ لگا دی۔ یہاں جاننے والوں سے کیا امید ہو سکتی ہے؟ اُن لوگوں کے ساتھ تو میں کھیل کود کر بڑا ہوا تھا..."

صبح کا جھٹ پٹا صاف ہوا تو دونوں اٹھ کر گاؤں کی طرف جانے لگے۔ پہلے پیڑوں کا ایک جھنڈ آیا۔ شہتوت اور شیشم کے پیڑ تھے۔ جھنڈ کے باہر چھوٹا سا قبرستان تھا۔ ٹوٹی پھوٹی قبریں، چھوٹی بڑی، ان ہی کے ایک طرف کسی پیر کی قبر معلوم ہوتی تھی کیونکہ اس پر ایک دیا ٹمٹما رہا تھا اور ہری جھنڈیاں لٹک رہی تھیں۔ پھر کھیت آئے۔ گیہوں پک گیا تھا۔ کٹائی کے دن قریب تھے۔ پھر سپاٹ چھتوں والے مٹی کے کوٹھے سامنے آگئے، جن کے باہر گائے بھینسیں بندھی تھیں۔ کہیں مرغیاں اپنے چوزوں کے ساتھ ابھی سے دانہ دنکے کی تلاش میں گھومنے لگی تھیں۔

"بنتو! اگر وہ لوگ مارنے پر اتارو ہوئے تو میں پہلے تجھے ختم کر دوں گا، پھر اپنے آپ کو ختم کر لوں گا۔ اپنے جیتے جی میں تجھے ان لوگوں کے ہاتھوں میں نہیں پڑنے دوں گا۔"

پھر وہ گاؤں کے باہر پہلے ہی گھر کے سامنے رک گئے۔ دروازہ بند تھا، بدرنگ سا موٹی لکڑی کا دروازہ۔ نہ جانے کس کا گھر تھا۔ کون لوگ دروازے کے پیچھے رہتے تھے۔ دروازہ کھلے گا تو قسمت جانے کیا گُل کھلائے گی؟

ہرنام سنگھ نے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ پل بھر کے لیے اس کا ہاتھ ٹھٹکا رہا، پھر اس نے دستک دی۔

15

گوردوارہ کھچا کھچ بھرا تھا۔ سنگت مستی میں جھوم رہی تھی۔ وقت انمول تھا۔ راگی پورے انہماک کے ساتھ، آنکھیں بند کیے گا رہے تھے۔

"تم بن کون میرے گوسائیں...."

سنگت میں شریک سب ہی لوگ دست بستہ تھے، آنکھیں بند اور وجد میں سر ہلتے ہوئے کوئی کوئی آدمی ہاتھ پر تال دیے جا رہا تھا۔ یہ قربانی کی آواز صدیوں کے فاصلے طے کر کے پھر سے گونج رہی تھی۔ تین سو سال پہلے بھی ایسا ہی گیت دشمن سے لوہا لینے سے پہلے گایا جاتا تھا۔ اپنی ذاتی قربانی کے جذبے سے سرشار، وہ لوگ سب کچھ بھولے ہوئے تھے۔ اس لمحے ان کی روح اپنے اسلاف سے جا ملی تھی۔ وہ پھر سے ماضی میں جا پہنچے تھے۔ ترکوں سے لوہا لینے کا پھر سے وقت آ گیا تھا۔ سکھ قوم ایک بار پھر خطرے میں پڑ گئی ہے۔ یہ خطرہ اب کی بار بھی ترکوں کی طرف سے آیا ہے۔ ان کی فکر صدیوں پہلے کے ماحول میں سانس لینے لگی تھی۔ لشکر کس طرف سے آئے گا، یہ ابھی تک معلوم نہیں تھا۔ دشمن باہر سے ہی آئے گا، یا گاؤں کے اندر سے ہی نکلے گا، یہ بات بھی واضح طور پر معلوم نہیں تھی۔ دشمن کا کوئی اعتبار نہیں تھا لیکن سنگت کا ہر ایک سنگھ سر ہتھیلی پر رکھے بیٹھا تھا۔

گوردوارے کے اندر روشنی پیچھے کی دو کھڑکیوں سے آ رہی تھی جن کے اوپر ہرے، لال اور پیلے رنگ کے شیشے لگے تھے۔ لکڑی کے چار کھمبوں کے بیچ میں گورو گرنتھ صاحب کی چوکی تھی۔ چوکے ارد گرد پیتل کا کٹہرا لگا تھا۔ چوکی کو لال رنگ کے ریشمی کپڑے سے، جس پر سنہری کناری لگی تھی، ڈھانک دیا گیا تھا۔ اس کپڑے کا ایک سرا نیچے فرش پر پھیلا تھا، جہاں سفید چادریں بچھی تھیں۔ چوکی کے سامنے، فرش پر جگہ جگہ سکے، دونیاں، اکنیاں بکھرے پڑے تھے۔

ایک طرف آٹے کا ڈھیر لگا تھا۔

گوردوارے میں داخل ہونے پر بائیں طرف عورتیں بیٹھی دکھائی دیتی تھیں۔ سب ہی نے دوپٹوں سے منہ اور سر لپیٹ رکھے تھے۔ سب ہی کے چہرے دمک رہے تھے۔ سب کی آنکھوں سے قربانی کا نور چمک رہا تھا۔ کسی کسی عورت کی کمر میں کٹار بھی لٹک رہی تھی۔ ہر مرد عورت کا رُواں رواں یہ محسوس کر رہا تھا کہ سکھ تاریخ کے طویل سلسلے میں وہ بھی ایک کڑی ہے۔ جو اِس خطرے کے وقت اپنے اسلاف کی مانند قربانی پیش کرنے کے لیے میدان میں اتر رہی ہے۔

اسلحہ پیچھے کے برآمدے میں اور گرنتھی کی کوٹھری میں اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ گاؤں میں سات گورو سنگھوں کے پاس دونالی بندوقیں تھیں اور پانچ صندوق کارتوسوں کے تھے۔ جمعدار کشن سنگھ دفاع کا انتظام کر رہا تھا۔ کشن سنگھ گزشتہ جنگ میں برما کی لڑائی میں حصہ لے چکا تھا، اور برما کی لڑائی کے داؤ پیچ وہ اپنے قصبے کے مسلمانوں پر چلانا چاہتا تھا۔ دفاع کی کمان سنبھالتے ہی وہ گھر جا کر خاکی قمیص پہن آیا تھا جس پر سرکار انگلشیہ کے تین تمغے اور بے شمار رنگین فیتے لگے تھے۔ قمیص مسلی ہوئی تھی لیکن یہ اس پر استری کرانے کا وقت نہیں تھا۔ دو بندوقوں کا مورچہ گلی کے بائیں سرے پر ایک مکان میں بنایا گیا تھا۔ دو بندوقوں کا ایک اور مورچہ گلی کے دائیں سرے پر تھا لیکن بعد میں دائیں طرف والا مورچہ ناکارہ ثابت ہوا تھا کیوں کہ اس گھر میں رہنے والا سردار ہری سنگھ اپنے ہمسایوں پر گولیاں چلانے پر آمادہ نہیں تھا۔ باقی تین بندوقوں والا مورچہ گوردوارے کی چھت پر بنا تھا اور کشن سنگھ خود سارا وقت چھت پر کرسی بچھا کر بیٹھا رہتا تھا۔ بندوقوں کا استعمال بس یہیں تک تھا۔ باقی ماندہ اسلحہ میں، بھالے، برچھے، تلواریں، لاٹھیاں وغیرہ جیسے ہتھیار تھے۔ گوردوارے کی پچھلی دیوار کے ساتھ ساتھ یہ اسلحہ سجایا گیا تھا۔ رنگ برنگی مخملی میانوں میں بند تلواریں ایک کے ساتھ ایک کر کے دیوار سے لگا کر کھڑی کی گئی تھیں کھڑکی میں سے دھوپ کی کرنیں سیدھی ان پر پڑ رہی تھیں اور ان کی وجہ سے وہ بہت ہی کارگر معلوم ہو رہی تھیں۔ روشنی کی کرنیں بھالوں اور برچھوں پر بھی پڑ رہی تھیں جس کی وجہ سے وہ بھی جگمگا رہے تھے۔ چند ایک ڈھالیں بھی تھیں جو نہنگ سکھوں سے لی گئی تھیں دو نہنگ سکھ چھت پر پہرہ دے رہے تھے۔ دونوں کے پاس برچھے تھے

دونوں نے اپنا مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔ نیلا بانا، نیلی پگڑی اور پگڑی کے اوپر لوہے کا چکر اور پیلا کمر بند۔ چھاتی تانے، بھالے ہاتھ میں سنبھالے، ایک شخص ایک چھت کے سرے پر، دوسرا شخص دوسرے سرے پر تعینات تھا۔ دونوں دور دور تک نظریں جمائے کھڑے تھے۔ کون جانے لشکر کس سمت سے دھول اڑاتے چلے آئیں۔

"نہنگ سنگھ جی! بھالا نیچا کر دو۔ دھوپ میں اس کی نوک چمکتی ہے۔ دشمن اسے دور سے دیکھ سکتا ہے۔" ایک بار کشن سنگھ نے سمجھاتے ہوئے کہا تو نہنگ سنگھ بگڑ اٹھا۔

"نہنگ سنگھ کا برچھا نیچا کبھی نہیں ہو سکتا۔" نہنگ سکھ نے جواب دیا اور جیوں کا تیوں بھالا اٹھائے افق پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔ نہنگ سکھوں کی نگاہوں کے سامنے وہی پرانی لڑائیوں کے مناظر گھوم رہے تھے جب لشکر کوچ کیا کرتے تھے، تلواریں چمکتی تھیں، گھوڑے ہنہناتے تھے، نقّارے اور شنکھ گونجتے تھے۔ ان سب کا تصور کرتے ہوئے ان کے دلوں میں سکھ پنتھ کے ساتھ اپنی وابستگی پر فخر کا احساس بڑھ جاتا تھا۔

دو نہنگ نیچے گوردوارے کے داخلے کے دروازے پر تعینات تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں برچھے تھے اور دونوں بڑی مستعدی سے کھڑے تھے۔ دونوں نے مونچھوں کو تاؤ دے رکھا تھا اور نیلے بانے پر پیلا کمر بند باندھ رکھا تھا۔ پرانے زمانے میں خالصہ پیلا بانا پہن کر میدانِ جنگ میں اترتا تھا۔ اس ماحول میں بھی ہر شخص کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو، اس کی پوشاک میں اس غیر منقسم روایت کی کوئی نہ کوئی علامت شامل ہو سکے جس کے ذریعہ وہ ماضی کے ساتھ زیادہ گہرا رشتہ برقرار رکھ سکے۔

بشن سنگھ منیہاری والے نے جس کی ڈیوٹی خالصہ لنگر میں لگائی گئی تھی، پیلے رنگ کا ریشمی رومال اپنی پگڑی میں ٹھونس رکھا تھا۔ بسنت پنچمی کے میلے کے بعد اس نے پیلے رنگ کا رومال اپنے بیٹے کے سر پر سے اتار کر جیب میں ڈال لیا تھا۔ آج اچانک جیب میں ہاتھ ڈالنے پر اسے یہ رومال مل گیا تھا اور اس نے اپنی پگڑی میں ٹھونس لیا تھا۔ سنگت میں بعض لوگوں نے اپنے لباس پر کمر بند بھی باندھ رکھے تھے لیکن زیادہ تر

لوگ شلوار اور قمیص میں ملبوس تھے۔ اور تو اور، سردار کشن سنگھ نے بھی ٹخنوں والی خاکی قمیص کے نیچے پاجامہ ہی پہن رکھا تھا لیکن یہ وقت پوشاک کی طرف دھیان کا نہیں تھا۔ دلوں میں قربانی کا جذبہ لہریں لے رہا تھا۔ اگر ایسے وقت میں پوشاک کا دھیان بھی آتا تھا تو صرف اس جذبے کی شدت کی وجہ سے جو ہر لحاظ سے ماضی کے ساتھ وابستہ ہو جانا چاہتا تھا۔

گوردوارے کا ماحول بھرے بادلوں کی طرح گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ کیرتن میں سب کے سر جھوم رہے تھے۔ سب ہی کے شعور میں وہ تمام باتیں موجود تھیں جو ماضی بعید میں ہوا کرتی تھیں۔ قربانی کا جذبہ، مسلمان دشمن، ڈھال، تلوار، گورو کا فیض، اٹوٹ ایکتا۔ اگر نہیں تھا تو ان کے شعور میں انگریز نہیں تھا۔ قصبے سے پچاس میل کے فاصلے پر، انگریزوں کی، ملک بھر میں سب سے بڑی چھاؤنی تھی۔ اس چھاؤنی کی طرف کسی کا دھیان نہیں جا رہا تھا۔ شہر اور صوبے میں بیٹھے انگریز افسروں کی طرف بھی نہیں جیسے شہر میں ان کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ اگر وجود تھا تو ترکوں کا یا خالصہ کا، ان کے بڑھتے چلے آ رہے لشکروں کا، ذاتی قربانی کی ساعت میں اس جہانگیر کا، جس میں سب ہی لوگ، اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے تیار تھے۔

گولہ باری کا خوف سب سے زیادہ گوردوارے کے پچھواڑے کی طرف سے تھا جہاں شیخوں کے ہرے چھجے والے مکان میں قصبے کے مسلمان اسلحہ جمع کر رہے تھے۔ شیخوں کے مکان میں بھی تقریباً ویسے ہی احساسات کارفرما تھے۔ یہاں پر گاؤں کے سب ہی مسلمان — کسان، تیلی، نان بائی اب مجاہد بن گئے تھے۔ کافروں کے خلاف جہاد کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ یہاں بھی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا، اور قربانی کا جذبہ دلوں میں لہریں مار رہا تھا۔

گوردوارے کے عین سامنے گلی کے پار، سکھوں کی دکانوں کا سلسلہ تھا۔ دکانوں کے پیچھے تیکھا ڈھلان تھا جو سیدھا چھوٹی سی ندی تک چلا گیا تھا۔ ندی کے پار لوکاٹوں کا لمبا چوڑا باغ تھا۔ اس لیے سامنے کی طرف سے تو کوئی مائی کا لال حملہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر کوئی آتا تو چھت پر کشن سنگھ کی مورچہ بندی میں لگی بندوقیں اسے بھون ڈالتیں۔

بائیں طرف گلی کے سرے پر مسلمانوں کے چند مکان تھے اور ان کے پیچھے خالصہ اسکول کھڑا تھا، اور پھر کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ دائیں طرف بھی گلی کے سرے پر سے مسلمانوں کا پورا کا پورا محلہ شروع ہو جاتا تھا۔ لیکن یہاں مورچہ بندی کرلی گئی تھی۔

گورودوارے کے پچھواڑے دو گلیاں چھوڑ کر شیخ غلام رسول کا اونچا دو منزلہ مکان تھا اور مخبروں کی اطلاع کے مطابق مسلمانوں نے اسی کو اپنا قلعہ بنا رکھا تھا۔ اسی میں اسلحہ اکٹھا کرتے جا رہے تھے۔ چھجے کے پیچھے کے سب ہی دروازے بند تھے اوپر ہری کھڑکیوں والی برساتی بھی بند تھی، اور کوئی بھی چھجے پر کھڑا نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن اسی گھر پر سب کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ شاید پہلی گولی یہیں سے داغی جائے گی۔

یوں دیکھا جائے تو یہ گاؤں بڑا خوبصورت تھا۔ امن و سکون کے زمانہ میں کوئی شخص یہاں آتا تو اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے خدا نے اسے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ چھوٹی سی ندی کے اوپر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر یہ گاؤں گھوڑے کی نعل کی شکل میں کھڑا تھا۔ ندی کے نیلے بہاؤ کے پار لوکاٹوں کے گھنے باغ تھے جہاں کئی جھرنے بہتے تھے۔ ان دنوں لوکاٹ پک رہے تھے اور طوطوں کے جھنڈ پیڑوں میں بسے ہوئے تھے۔ ان دنوں ندی کا رنگ آسمان کے رنگ کی طرح گہرا نیلا لگ رہا تھا۔ زمین کی مٹی سرخی مائل تھی۔ گاؤں کے باہر کھیتوں کا وسیع سلسلہ اس پہاڑی تک چلا گیا تھا، جو اس صوبے کی پیٹھ پر کھڑی تھی۔ ہر گھڑی پہاڑی کا رنگ بدلتا رہتا تھا۔ کبھی تو وہ باریک سی نیلی چادر اوڑھ لیتی، کبھی اس کا چہرہ تپتے تانبے کی طرح دمکنے لگتا۔ کبھی اس کے کاندھوں پر سرمئی گھٹائیں کھیلنے لگتیں، کبھی اس پر ہریالی بچھ جاتی۔ اس پہاڑی کے دامن میں جھرنے ہی جھرنے تھے۔ یہاں انجیر کے بڑے بڑے پیڑ بھی تھے۔ حسین مناظرِ فطرت کی گود میں بسے اس گاؤں کے سب ہی لوگ یہاں نسل در نسل رہتے چلے آرہے تھے۔

اچانک گورودوارے کے اندر بجلی کی سی لہر دوڑ گئی۔ سب ہی کی آنکھیں داخلے

کے دروازے کی طرف اٹھ گئیں. جہاں سے گاؤں کے مکھیا سردار تیجا سنگھ تشریف لارہے تھے۔ گورودوارے کے چبوترے پر چڑھ کر تیجا سنگھ گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئے، اور پھر آگے کو جھک کر انھوں نے گورودوارے کی دہلیز کو آنکھوں سے چوم لیا۔ چبوترے پر رکھے ان کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کانپ کانپ اٹھیں۔

تیجا سنگھ بڑی دیر تک اپنا ماتھا دہلیز پر ٹکائے رہے، یہاں تک کہ ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ تیجا سنگھ وجد میں تھے۔ ان کا رُواں رواں ہنتھ کی حفاظت کے لیے نچھاور تھا۔

پھر وہ اٹھے اور دونوں ہاتھ باندھے، گردن جھکائے ان کی سفید داڑھی ان کے سینے کو ڈھانکے ہوئے تھی۔ آکر گورو گرنتھ صاحب کی ویدی کے سامنے سر نوانے کے لیے جھک گئے۔ یہاں بھی وہ دیر تک جھکے رہے۔ ان کا چہرہ لال ہوگیا اور ان کے آنسو فرش پر بچھی سفید چادر پر ٹپ ٹپ گرتے رہے۔

ساری سنگت دم سادھے دیکھے جارہی تھی۔ سب ہی کے کلیجے منھ کو آرہے تھے۔ جب تیجا سنگھ اٹھے تو سارے ہال میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔

وہ اٹھے اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے کھمبے کے پاس آکر کھڑے ہوگئے، جہاں ایک پرانی تلوار کھمبے کے ساتھ رکھی تھی۔ انھوں نے کانپتے ہاتھوں سے تلوار کے دستے کو پکڑا اور ہال کے درمیان کھڑے ہوگئے۔ یہ ان کے نانا کی تلوار تھی، جن کے پتا مہاراجا رنجیت سنگھ کے درباریوں میں شامل تھے۔

ہاتھ میں تلوار اٹھانے کی دیر تھی کہ سنگت میں جذبۂ ایثار و قربانی کا جیسے طوفان اُمڈ آیا۔ سر جھوم اٹھے۔ دروازے کے پاس کھڑے نوجوان پریتم سنگھ کے منھ سے ایک دم نعرہ پھوٹ پڑا۔

"جو بولے سو نہال!"

ساری سنگت نے بہ یک زبان جواب دیا۔

"ست سری اکا۔۔۔۔ل!"

نعرے کی گونج سے گورودوارے کی دیواریں لرز اٹھیں۔ یوں تو نعرہ لگانے

پر پابندی تھی۔ سنگت یہ نہیں چاہتی تھی کہ دشمن کو پتہ لگ جائے کہ گاؤں کی ساری سکھ جنتا گورودوارے میں جمع ہے۔ لیکن بعض باتوں پر انسان کا بس نہیں چلتا۔ اس شدید جذبے کا اظہار نعرے کے ذریعہ ہی کیا جا سکتا تھا۔

بوڑھے ہاتھوں نے تلوار کے دستے کو پکڑا، اسے اٹھا کر دونوں آنکھوں سے چوما تو ساری سنگت نے سسکاری بھری۔ داخلے کے دروازے پر کھڑا نہنگ دائیں بائیں جھولنے لگا۔ سینکڑوں سر ہلنے لگے۔

" آج پھر خالصہ پنتھ کو گورو کے سنگھوں کے خون کی ضرورت ہے۔" انھوں نے لرزتی جذبات سے مغلوب آواز میں کہنا شروع کیا۔

" ہمارے امتحان کا وقت آگیا ہے۔ ہماری آزمائش کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ ایسے موقع کے لیے مہاراج کا ایک ہی حکم ہے۔ 'قربانی! قربانی! قربانی'!"

تیجا سنگھ کے ذہن میں سنہری دھول سی اڑنے لگی تھی۔ یہی مستی تھی، یہی وجد تھا۔ سارے جذبے ایک ہی لفظ 'قربانی' پر آکر جمع ہو گئے تھے۔

" ارداس پڑھو، گورو کے سنگھو! ارداس پڑھو۔"

ساری سنگت اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہاتھ جڑ گئے۔ ماتھے جھک گئے۔ سب ہی لوگ گانے لگے۔ گورودوارہ گورووانی سے گونج اٹھا۔ دیر تک ارداس پڑھی جاتی رہی۔ آخری لفظوں پر آواز اپنے آپ اور اونچی ہو گئی۔

" راج کرے گا خالصہ، باقی رہے نہ کو..."

یہ آوازیں سارے گورودوارے کی فضا میں لہروں کی طرح اٹھ رہی تھیں۔

ارداس ختم ہونے کی دیر تھی کہ داخلے کے دروازے پر کھڑے نہنگ سنگھ نے ہاتھ اوپر اٹھایا اور آنکھیں بند کر کے اتنی اونچی آواز میں کہ اس کے گلے کی رگیں ابھر آئیں، پھر سے نعرہ لگایا۔

"جو بولے سو نہال!"

جواب میں سنگتوں نے ہاتھ اٹھا کر اور گہری سانس چھاتی میں بھر کر نعرے کا جواب دیا۔

"ست سری آ... کا... آل!"

نئے دلولے اٹھنے لگے۔ نعروں کی گونج میں اتحاد اور قربانی کے جذبے زیادہ شدید ہو جاتے ہیں۔

اسی وقت باہر کچھ فاصلے پر ایک فلک شگاف آواز سنائی دی۔

"نعرۂ تکبیر!"

اور جواب آیا "اللہ اکبر!"

"نعرۂ تکبیر!"

"اللہ اکبر!"

داخلے کے دروازے پر کھڑے نہنگ سنگھ جی نے پھر ہاتھ کی مٹھی بھینچی اور اسے کندھوں سے اونچا اٹھا کر نعرہ لگانا ہی چاہتے تھے کہ تیجا سنگھ جی نے انھیں روک دیا۔

"بس کافی ہے۔ دشمنوں کو پتہ چل گیا ہے۔"

لیکن مسلمانوں کے جوابی نعروں سے سنگتوں کو حقیقت حال کا تھوڑا بہت علم ضرور ہوا۔

"ہم نہیں چاہتے کہ دشمن کو ہماری طاقت کا پتہ چلے۔ ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ انھیں یہ اندازہ ہو کہ سکھ سنگت گوردوارے میں اکٹھا ہو چکی ہے۔ یہی حکمت عملی ہے۔"

اس کے بعد سنگتوں کو حالات کی تفصیل بتاتے ہوئے بولے "ہم نے کوشش کی ہے کہ ضلع کے حاکم اعلیٰ، ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کو اطلاع کر دی جائے کہ مسلمانوں نے یہاں کون سی حرکتیں شروع کر دی ہیں۔ رچرڈ صاحب کو میں جانتا ہوں، وہ بڑے ہی منصف مزاج آدمی ہیں۔ بڑی سوجھ بوجھ والے شخص ہیں۔ ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے کہ حاکم اعلیٰ تک اپنی آواز پہنچائیں۔ طرح طرح کی خبریں ہمارے پاس پہنچ رہی ہیں۔ ہمیں پتہ چلا ہے کہ رحیم تیلی کے گھر میں اسلحہ اکٹھا کیا جا رہا ہے۔ یہ بھی پتہ چلا ہے کہ گہرے نیلے رنگ کی ایک موٹر کار دوپہر کے وقت شہر کی طرف سے آئی تھی اور قصبے کے باہر فضل دین اسکول ماسٹر کے گھر کے سامنے رکی تھی اور اس میں سے کچھ سامان ماسٹر فضل دین کو دیا گیا تھا۔ اس کے بعد موٹر سیدھی آگے نکل گئی تھی۔ یہ موٹر جگہ جگہ جاتی اور رکتی رہی ہے۔ یہ بھی پتہ چلا ہے کہ یہاں کے مسلمانوں نے مرید پور کے مسلمانوں کو پیغام بھیجا ہے کہ اسلحہ لے کر یہاں پہنچیں۔

ہم نے پوری کوشش کی کہ شیخ غلام رسول اور گاؤں کے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ بات کریں لیکن ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔۔۔۔"

"آپ نے کوئی کوشش نہیں کی۔ ہے۔ یہ سراسر جھوٹ ہے۔"

اچانک سنگت کے اندر سے آواز آئی اور گوردوارے میں سکتہ چھا گیا۔ یہ کون تھا، بیچ میں بولنے والا؟ گوردوارے میں بیٹھے لوگوں کے تیور چڑھ گئے۔

ایک دبلا پتلا سا نوجوان اٹھ کھڑا ہوا۔ "ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا جا رہا ہے اور مسلمانوں کو ہمارے خلاف بھڑکایا جا رہا ہے۔ ہم جھوٹی افواہیں سن سن کر ایک دوسرے کے خلاف طیش میں آ رہے ہیں۔ ہمیں اپنی طرف سے پوری کوشش کرنی چاہیئے کہ گاؤں کے مسلمانوں کے ساتھ میل جول برقرار رکھیں اور حتی الوسع کوشش کریں کہ گاؤں میں فساد نہ ہو۔"

"بیٹھ جاؤ! بیٹھ جاؤ!"

"قوم کے غدار! کون ہے یہ؟"

"میں نہیں بیٹھوں گا۔ بھائیو! میں پھر یہی کہوں گا کہ ہمیں شیخ غلام رسول اور گاؤں کے دوسرے سنجیدہ مسلمانوں سے ملنا چاہیئے۔ اگر شیخ غلام رسول نہ مانے تو نہ سہی گاؤں میں اور بہت سے سنجیدہ مسلمان ہیں جن کے ساتھ مل کر ہمیں گاؤں میں امن برقرار رکھنا چاہیئے۔ اگر ان کے پاس مرید پور سے اسلحہ آ رہا ہے تو کیا ہم کھوٹا سے اسلحہ منگوانے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ قتل و غارت کوئی نہیں چاہتا۔ قصبے کے سکھ اور مسلمان آپس میں ملیں اور امن برقرار رکھیں۔ میں آج ہی صبح غلام رسول اور کچھ دیگر مسلمانوں سے ملا ہوں۔"

"تم وہاں کیوں گئے تھے؟ کیا لگتے ہیں وہ تمھارے؟"

"تیرا باپ لگتا ہے غلام رسول؟"

"مجھے بولنے دو۔ شرارت باہر کے لوگ کریں گے۔ ہمیں پوری کوشش کرنی چاہیئے کہ اس گاؤں میں باہر کے لوگ نہ آئیں۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ یہاں کے امن پسند سکھ اور مسلمان مل کر انھیں روکیں۔ وہ ہمارے ڈر سے اسلحہ اکٹھا کر رہے ہیں اور ہم ان کے ڈر سے اسلحہ اکٹھا کر رہے ہیں۔۔۔"

"مسلمانوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ بیٹھ جاؤ۔"

" وہ لوگ کہتے ہیں کہ سکھوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے ؟ "

" بیٹھ جاؤ " ایک بڑی عمر کا آدمی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سوہن سنگھ کو مخاطب کر کے غصّہ سے کانپتے ہونٹوں کے ساتھ بولا۔" تو کون ہوتا ہے بیچ میں بولنے والا؟ تیرے ہونٹوں سے ابھی تک تیری ماں کا دودھ نہیں سوکھا ہے، بڑوں کی باتوں میں بول رہا ہے !"

تین چار سردار جگہ جگہ پر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔" تم جانتے ہو شہر میں انھوں نے منڈی کو جلا دیا تھا۔۔۔"

" یہ سب انگریزوں کی شرارت ہے۔" سوہن سنگھ کی آواز اور اونچی اٹھ گئی تھی۔ ہمارا فائدہ اسی میں ہے کہ فساد نہ ہو۔ سنو بھائیو! شہر سے آج کوئی بس نہیں آئی۔ راستے کٹتے جا رہے ہیں۔ یہ سارا علاقہ مسلمانی ہے۔ اگر گاؤں پر باہر کے لوگوں نے حملہ کر دیا تو کہاں تک تم ان کا مقابلہ کر سکو گے ؟ کچھ یہ بھی سوچو۔ کہوٹا سے تمھیں کتنی مدد مل جائے گی ؟ تم اینٹھ کس بات پر رہے ہو؟"

تھوڑی دیر کے لیے گورودوارے میں خاموشی چھا گئی۔

پھر تیجا سنگھ جی گورودوارے کے بیچوں بیچ آ کر کھڑے ہو گئے اور اپنی کانپتی آواز میں بولے" میرا دل یہ دیکھ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے کہ ہمارے ہی بچے گمراہ ہو کر ایسی باتیں کرتے ہیں۔ اپنے ہی پنتھ کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ کیا ہم فساد چاہتے ہیں۔ میں نے خود شیخ غلام رسول سے بات کی ہے۔ اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ گاؤں میں کچھ نہیں ہوگا لیکن پیٹھ موڑنے کی دیر تھی کہ خالصہ اسکول پر کچھ لوگوں نے حملہ کیا۔ وہاں کا پنڈت چپراسی مار ڈالا گیا، اور مسلمان اس کی بیوی کو اٹھا کر لے گئے۔ یہ خبر میں نے ابھی تک آپ کو نہیں سنائی کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا آپ کو اشتعال دلاؤں۔"

غم و غصّہ کی لہر پھر گورودوارے میں دوڑ گئی۔

" آپ کو کسی نے غلط خبر دی ہے۔" سوہن سنگھ پھر بول اٹھا۔" خالصہ اسکول پر حملہ ضرور ہوا تھا لیکن گاؤں کے مسلمانوں نے نہیں کیا تھا۔ ڈھوک الٰہی بخش سے کچھ غنڈے

ملنے آئے تھے لیکن ہمارا ساتھی میر داد، جو شہر سے آیا ہے، وقت پر پہنچ گیا۔ اس نے اور گاؤں کے دو اور لڑکوں نے بیچ بچاؤ کر کے حالات کو بگڑنے سے بچالیا۔ چپراسی کو صرف چوٹیں آئی ہیں، وہ مرا نہیں ہے اور اس کی بیوی کو بھگا کر کوئی نہیں لے گیا ہے۔ وہ بھی اسکول میں موجود ہے۔"

"یہ میر داد کون ہے؟" ایک سردار بولا۔

"میں نے اسے میر داد کے ساتھ قہوہ خانہ میں بیٹھے دیکھا ہے۔ نہ جانے آپس میں کیا باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ایک طرف تو مُسلّے ہماری عورتوں کی عصمت لُوٹ رہے ہیں اور دوسری طرف ہمارے ہی لڑکے مُسلّوں سے گٹھ جوڑ کر رہے ہیں۔" پھر اسی دبلے پتلے سردار کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ "ہمیں کیا سمجھاتے ہو؟ مسلّوں کو جا کر سمجھاؤ۔ کیا سکھوں نے ابھی تک کسی کو مارا ہے، کسی کا گھر لُوٹا ہے؟ بڑا آیا ہمیں نصیحت کرنے والا۔"

فضا پھر بدل گئی۔ دروازے پر کھڑا نہنگ سکھ چلتا ہوا، قدم بڑھاتا ہوا، دبلے پتلے سردار کے پاس آیا اور سیدھا ایک دھول اس کی گردن پر جما دیا۔

"بس۔ بس! مت مارو۔ مت مارو۔"

پاس بیٹھے ہوئے کچھ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور نہنگ سکھ کا ہاتھ روک دیا
عین اسی وقت جبکہ یہ ہنگامہ گورودوارے میں چل رہا تھا، مسلمانوں کے محلّے میں میر داد کی جان مصیبت میں تھی۔

تین قصائیوں کی دکانیں ساتھ ساتھ تھیں لیکن اس وقت بند تھیں اور کچھ میر داد سے الجھ رہے تھے۔

"او۔ چُپ اوئے۔ انگریز کو کس نے دیکھا ہے؟ شہر میں کتنے ہی مسلمان ہلاک ہوئے ہیں۔ ان کی لاشیں ابھی تک گلیوں میں پڑی ہیں۔ انھیں انگریزوں نے مارا ہے، اوئے؟ مسجد کے سامنے خنزیر پھینکا ہے، وہ بھی انگریز ہی پھینک گیا ہے، اوئے؟"

"اُفوہ۔ کچھ تو سمجھا کرو۔" میر داد نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "اگر ہندو، مسلمان، سکھ آپس میں مل جاتے ہیں، ان میں اتحاد ہو جاتا ہے تو انگریز کی حالت کمزور

ہو جاتی ہے۔ اگر ہم آپس میں لڑتے ہیں تو ان کی حالت مضبوط بنی رہتی ہے۔"
وہی گھسی پٹی دلیل تھی جسے وہ لوگ روزانہ سنتے تھے لیکن اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ اس دلیل کا اثر کہیں نہیں ہوتا تھا۔
"جا۔ جا۔ سر پر بادام روغن کی مالش کر۔" موٹے قصائی نے کہا۔ "ہمارا انگریز نے کیا بگاڑا ہے اوئے؟ ہندو مسلمان کی عداوت پرانے زمانے سے چلی آرہی ہے۔ کافر کافر ہے اور جب تک دین پر ایمان نہیں لائے گا وہ دشمن ہے۔ کافر کو مارنا ثواب ہے۔"
"اوہ سن چاچا!" میر دادا بولا۔ "راج کس کا ہے؟"
"کس کا ہے؟ انگریز کا ہے۔ اور کس کا ہے!"
"فوج کس کی ہے؟"
"انگریز کی ہے۔" قصائی بولا۔
"اگر وہ لڑائی روکنا چاہے تو روک نہیں سکتا؟"
"روک سکتا ہے لیکن وہ ہمارے مذہبی معاملات میں نہیں پڑنا چاہتا۔ انگریز انصاف پسند ہے۔"
"مطلب یہ کہ ہم ایک دوسرے کا گلا کاٹیں اور وہ مذہبی معاملہ کہہ کر تماشا دیکھے۔ پھر وہ حاکم کیسا ہوا؟"
اس پر موٹا قصائی بپھر گیا۔ "سن اوئے میر داد! لڑائی ہندو مسلمان کی ہے، اس میں انگریز کا کوئی دخل نہیں ہے۔ تو یہاں بک بک مت کر۔ اگر باپ کا بیٹا ہے تو جا، اسی وقت گوردوارے میں جا۔ ان کو سمجھا کہ اسلحہ اکٹھا نہ کریں۔ انھیں جا کر منا لے، وہ مان جائیں۔ اپنا اسلحہ گولہ بارود گوردوارے میں چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ ہم بھی لڑائی نہیں چاہتے۔ ہم بھی اپنے گھروں میں جا بیٹھیں گے۔ بس، مرد کا بیٹا ہے تو جا۔ ان سے بات کر۔ ادھر ہمارا مغز مت کھا۔"
جب سے فسادات کے سبب تناؤ شروع ہوا تھا، میر داد قصبے میں جگہ جگہ، نان بائی کی دکان پر، گنڈا سنگھ چائے والے کی دکان پر، شیخ کی بیٹھک میں، کنوئیں جھلار پر، جہاں کہیں چار آدمی بیٹھے دیکھتا، وہاں یہی ذکر لے بیٹھتا تھا۔ لوگ اس کی بات کو سنتے تھے

اس لیے کہ وہ دو لفظ پڑھا ہوا تھا۔ لاہور، بمبئی، مدراس تک گھوم آیا تھا اور اب اپنے چھوٹے بھائی اللہ داد کے پاس شہر سے آیا تھا۔ لیکن قصبے میں کشیدگی بڑھنے، اور باہر سے طرح طرح کی خبریں آنے پر، وہ رفتہ رفتہ اکیلا ہوتا جارہا تھا۔ اس کی بات میں وزن اس لیے بھی نہیں تھا کہ اس کے پاس اپنی زمین نہیں تھی۔ نہ زمین، نہ مکان۔ نان بائی کی دکان کے باہر پلنگ بچھا کر سوتا تھا۔ شہر سے اس لیے آیا تھا کہ یہاں پر اسکول کھولے گا۔ گاؤں کے لوگ سمجھتے تھے کہ اسکول بن جانے سے اس کو کمائی کا چھوٹا موٹا ذریعہ مل جائے گا، جبکہ یہ خیال میرداد کے دل میں نہیں تھا۔ وہ تو اسکول کے ذریعہ قصبے کے لوگوں کو مل بیٹھنے کے لیے ایک ایسی جگہ فراہم کرنا چاہتا تھا۔ جہاں ہر شخص آجا سکے۔ لوگ بیٹھیں۔ کوئی انھیں اخبار پڑھ کر سنائے۔ وہ مختلف مسائل اور معاملات پر بحث کریں جس سے ان کی سوجھ بوجھ بڑھے۔ اسے دیودت نے قصبے میں جمے رہنے اور فساد کو روکنے کے لیے بھیجا تھا۔ سوہن سنگھ کو بھی اسی کام کے لیے بھیجا گیا تھا۔ دونوں ایک ہی پارٹی کے کارکن تھے۔ دونوں کے رشتہ دار اسی قصبے میں رہتے تھے لیکن دونوں میں سے کسی ایک کی بھی دال نہیں گل رہی تھی۔

اسی وقت قصائیوں کی دکانوں کے پاس ایک چھوٹا سا واقعہ رونما ہوا۔ دکانوں سے ہٹ کر گلی کے تاریک حصے میں، ایک ٹاٹ کے پردے کے پیچھے بیٹھا ایک آدمی ان کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ گوردوارے سے بھیجا ہوا مخبر تھا۔ آس پاس مسلمانوں کے گھر تھے لیکن اس بیچ والے گھر میں جس کے ٹاٹ کے پردے کے پیچھے گوپال سنگھ بیٹھا تھا، ایک بوڑھی بیوہ چنّن دیئی رہتی تھی۔ پچھلے گھر کی دیوار پھاند کر گوپال سنگھ یہاں آکر بیٹھ گیا تھا تاکہ مسلمانوں کے منصوبوں کو پتہ چلا سکے۔ میرداد اور قصائیوں کے درمیان ہو رہی باتیں سنتے ہوئے ایک بار اس نے ٹاٹ کا پردہ اٹھایا اور چپ چاپ گلی میں سرک کر ساتھ والے مکان کے چبوترے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ یہاں سے بات چیت زیادہ صاف سنائی دیتی تھی۔ گھروں کے دروازے بند تھے اور گلی میں اندھیرا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر کہیں سے کوئی آہٹ سنائی دے گی تو وہ جھٹ سے اٹھ کر ٹاٹ کے پردے کے پیچھے چھپ جائے گا۔ لیکن اسے اس کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ اس کے کان بات چیت پر لگے تھے کہ اچانک پیچھے سے آہٹ ہوئی۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ گلی کے اندھیرے میں بغل والے مکان

میں سے ایک آدمی نکلا اور چبوترے کی دو سیڑھیاں اتر کر سیدھا گوپال سنگھ کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ آدمی نیچے اتر آیا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ قمیص کے نیچے کیے ہوئے تھا، جیسے کوئی طمنچہ یا خنجر نکال رہا ہو۔ گوپال سنگھ مخبر گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے منھ سے چیخ نکل گئی۔ ٹاٹ کے پردے کی طرف کہاں لپکتا وہ تو سیدھا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اس ہڑبڑ میں وہ اس آدمی سے بری طرح ٹکرا گیا تھا جو قمیص کے نیچے سے طمنچہ نکالنا چاہ رہا تھا۔ اصل میں ٹکر ہونے سے پہلے وہ آدمی اپنا ازاربند کھول کر نالی پر تقریباً بیٹھ چکا تھا۔ گوپال سنگھ کی نظر اس کے پوپلے منھ، گھٹے ہوئے سر اور لگ بھگ اندھی آنکھوں کی طرف نہیں گئی۔ ٹکر ہونے پر بوڑھا نور خاں گلی میں گر پڑا، اور اس کے منھ سے بھی چیخ نکلی "مار دیتا، او مار دیتا۔"

یہ سب پلک جھپکتے میں ہو گیا تھا۔ بوڑھے نورو کی چیخ اور بھاگتے قدموں کی آواز سن کر قصائیوں کی دکانوں سے دو آدمی برچھے لے کر ایک ساتھ لپکے۔ اشرف قصائی سیدھا اس بھاگتے آدمی کے پیچھے دوڑا، اور زور سے اپنی لاٹھی پھینکی۔ لاٹھی تو گوپال سنگھ کو نہیں لگی لیکن اس کے قریب گرنے پر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اور وہ بھی چلا اٹھا۔

"بچاؤ۔ بچاؤ۔ مار ڈالا۔"

اس میں اتنا، کچھ اور لوگ بھی گلی میں آ گئے۔ بوڑھا نورو ابھی تک نالی کے کنارے اکڑوں پڑا تھا۔ اور کمر بند اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بلبلاتی آواز میں ابھی تک بولے جا رہا تھا "ماری دِتا۔ او، مجھی ماری دِتا۔"

گلی میں اشرف کو آوازیں لگائی جانے لگیں، "لوٹ آؤ۔ آگے نہیں جاؤ۔ واپس آ جاؤ۔"

اس وقت گلی میں کھڑے لوگوں میں سے میرداد آگے بڑھا اور نورو کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر موٹا قصائی آگ ببولہ ہو گیا۔ "دیکھ لیا۔ او میرداد کے بچے۔ نورو کو انگریز نے مارا ہے؟ چلا جا یہاں سے۔ خدا قسم، نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ اسی وقت چلا جا، دور ہو جا ہماری نظروں سے، ہٹ جا۔" میرداد کو قریب قریب دھکے دے کر وہاں سے نکال دیا گیا، "نہ گھر، نہ گھاٹ، نہ آگا، نہ پیچھا، امن کروانے آیا ہے۔ اوئے تو ہے کون؟ جنھیں ماں نہیں پوچھتی، وہ ہمارے پاس چلے آتے ہیں ــــ مفت خورے کہیں کے۔"

گلی کے سرے تک پہنچنے کے بعد میرداد نے مڑ کر دیکھا اور کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن

قصائی بپھرا ہوا تھا، کڑک کر بولا: "جا۔ جا، نکل جا یہاں سے مردود کہیں کا۔ ایک جھانپڑ دوں گا منھ پر، دانت باہر آجائیں گے۔ جا، اپنے باپ کو لیکچر دے۔"

دبلا پتلا میرداد کندھے جھکائے وہاں سے جانے لگا۔ کچھ لوگ جو شروع میں اس سے ملتے تھے اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے، وہ اب دیکھنے کو بھی نہیں مل رہے تھے یہی موٹا قصائی پہلے اس سے ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتا تھا لیکن اب اس کی آنکھوں میں بھی خون اتر آیا تھا۔

گوپال سنگھ مخبر جو بھاگتا اور چلاّتا ہوا گیا تھا گوردوارے کے نزدیک پہنچنے تک چلاّتا رہا۔ سنگتوں میں پھر اشتعال کی لہر دوڑ گئی۔ لوگ لپک لپک کر باہر آنے لگے۔ کچھ دیر کے لیے سارا ڈسپلن درہم برہم ہو گیا۔ دونوں نہنگ سکھ باہر آگئے۔ چھت پر کھڑے نہنگ سکھ سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئے۔ "کیا ہوا، کیا ہوا؟"، گوردوارے کے اندر زیادہ تر لوگ کھڑے ہو گئے۔

دس آدمیوں نے گوپال سنگھ کے جسم کے ہر حصّے کو دیکھا۔ اس کے جسم پر کہیں بھی چوٹ نہیں آئی تھی۔ البتہ وہ ہانپ رہا تھا۔ اس کا گلا سوکھ رہا تھا۔ بہت کوشش کرنے پر بھی وہ ٹھیک طرح سے نہیں سمجھا پایا کہ ہوا کیا تھا۔

"وہ سیدھا مجھ پر وار کرنے آرہا تھا..."

"کون تھا وہ؟"، تیجا سنگھ نے پوچھا۔

"اندھا بابا نورا"، گوپال سنگھ کے منھ سے نکل گیا۔ بھاگنے سے پل بھر پہلے اس نے بابا نورے کو پہچان لیا تھا۔

"اندھا بابا نورا؟"

"مجھے کیا معلوم کون تھا؟ اس کے گھر میں سے نکل کر آیا تھا..."

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر قصائی گلی میں سے لوگ آگئے۔ میں بھاگا تو مجھ پر لاٹھیاں پھینکنے لگے۔"

لوگوں کی بھیڑ گلی میں جمع ہونے لگی تھی۔ ایک سردار جی لوگوں کو ہٹانے لگے۔ "فکر کی کوئی بات نہیں، سنگھ خالصہ صحیح سلامت لوٹ آیا ہے۔ دشمن کے مورچے پر سے لوٹ آیا ہے۔ بال بال بچ گیا ہے۔ اندر چلو۔ سنگت اندر چلیں۔"

جب گوپال سنگھ کا سانس کچھ ٹھکانے آیا تو تیجا سنگھ نے آہستہ سے پوچھا: "کیا

کچھ سنا؟ ان کی کیا اسکیم ہے؟"

"وہاں پر میرداد اپنی بکواس کر رہا تھا۔ کچھ سننے ہی نہیں دیتا تھا۔ موٹا فضائی اس سے کہہ رہا تھا: جا۔ گوردوارے والوں کو سمجھا۔ ہمیں کیا سمجھاتا ہے۔ وہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں تو ہم بھی اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں گے.... ایسا ہی کچھ کہہ رہا تھا۔"

سنگت گوردوارے میں واپس آگئی لیکن گوپال سنگھ کی چیخ پکار سے اشتعال پھیلا ہوا تھا۔ کیرتن پھر سے چلنے لگا تھا۔ اور چھینے، طبلے اور باجے کی آواز اور زیادہ اونچی ہونے لگی تھی۔

"دیکھ لیا۔ دیکھ لیا سردار؟" ایک آدمی گوردوارے کے درمیان کھڑا ہو کر سوہن سنگھ پر برس رہا تھا۔ "بچ کر نکل آیا۔ مسلوں نے تو اسے مارنے کی پوری کوشش کی تھی۔ اب دیکھ لیا؟ بڑا آیا ہمیں نصیحت کرنے والا...."

اس پر ایک سردارجی نے اٹھ کر کہا: "میری تجویز یہ ہے کہ اس آدمی کو نظر بند کر دیا جائے۔ کال کوٹھری میں ڈال دیا جائے۔ اس پر ہمیں اعتبار نہیں ہے۔ کیا معلوم یہ ان کے لیے مخبری کرتا ہو۔"

اس پر نہنگ سکھ نے آگے بڑھ کر سوہن سنگھ کو ایک اور دھول جمادی۔

"بس۔ بس۔ مارو نہیں۔ مت مارو۔"

"سمجھانا ہے تو جا کر اپنے چاچوں کو، ان شیخوں کو سمجھاؤ جن کی بغل میں ہر وقت گھسے رہتے ہو۔ جاؤ یہاں سے۔" اور کیرتن پھر سے جاری ہو گیا۔

شام ہونے لگی تھی۔ گورو گرنتھ صاحب کی ویدی کے دائیں بائیں چھت سے لٹکتے دو فانوس نما لیمپ جلا دیے گئے تھے۔ لیمپ کے نیچے بیٹھے تیجا سنگھ کی نیلی پگڑی کے نیچے ان کا سفید دوپٹہ اور سفید داڑھی روشنی میں چمک اٹھے۔ روشنی عورتوں کے دمکتے چہروں پر بھی پڑ رہی تھی۔ جذبات کی شدت سے دمکتے چہرے۔ اضطراب، خوف، بے انتہا عقیدت اور اعتماد سب ہی ان کی آنکھوں میں چھائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی کسی نوجوان لڑکی کی حیران آنکھیں گوردوارے کا انوکھا منظر دیکھنے لگتی تھیں۔ ان ہی میں نوجوان لڑکیوں میں جسبیر بھی تھی۔ ہرنام سنگھ چائے والے کی بیٹی، جو اسی گاؤں میں بیاہی

گئی تھی۔ اٹوٹ مذہبی عقیدت اس نے اپنے باپ سے حاصل کی تھی۔ جس وقت اردا س گائی جارہی تھی اس وقت سنگت میں بیٹھے لوگوں کی آواز سے ایک ہی آواز میل نہیں کھارہی تھی وہ جسبیر کی آواز تھی۔ باریک، اونچی اور تیکھی آواز میں وہ بے جھجک گائے جارہی تھی۔ ایک چھوٹی سی کرپان کالی پٹی سے بندھی ہر وقت اس کی کمر سے جھولتی رہتی تھی۔ سنگت میں سب ہی لوگ اس کی آواز کو پہچانتے تھے اور سب ہی اسے 'گورو بیٹی' کہہ کر بلاتے تھے۔ جسبیر کا کشادہ چہرہ سب سے زیادہ دمک رہا تھا۔ وہ گورودوارے کی سیڑھیاں اپنے ہاتھ سے دھویا کرتی تھی۔ جو ریشمی کپڑا گورو گرنتھ صاحب کو ڈھانکنے کے لیے رکھا تھا' اس پر جسبیر کورنے ہی باریک کڑھائی کا کام کیا تھا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے ولولے اٹھتے رہتے تھے۔ اپنے آپ ہی اٹھ کر سنگت کو پنکھا جھلنے لگتی۔ ٹھنڈا پانی پلانے لگتی' سنگتوں کے جوتوں کی رکھوالی کرنے لگتی اور موج آتی تو اپنے دوپٹے کے آنچل سے سنگتوں کے جوتوں کو پونچھ پونچھ کر ان کے سامنے رکھنے لگتی۔ اس کا بس چلتا تو سنگتوں کے قدم چھو چھو کر اپنے ہاتھ سے انھیں جوتا پہناتی۔ جب سے یہ بحران شروع ہوا تھا' اس کی نگاہیں تیجا سنگھ کے ہونٹوں کی طرف لگی رہتی تھیں گویا ان کے مکھڑے سے اس کو غیبی پیغام ملنے کی توقع ہو۔ اس پیغام کو سننے کی امید میں وہ ہر لمحہ کان لگائے بیٹھی رہتی تھی۔ قریب قریب ایسا ہی جذبہ گورودوارے میں بیٹھے سب ہی مرد عورتوں کے دلوں میں ہلوریں لے رہا تھا۔

اسی وقت چھت پر تعینات نہنگ سکھ کو گاؤں کے پار' دور افق کے ساتھ دھول اڑتی نظر آئی۔ دھول کا طوفان تھا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ دھول کا طوفان بڑھتا چلا آرہا تھا۔ اس نے کشن سنگھ کو بتایا۔ کشن سنگھ نے اٹھ کر جھروکے میں سے دیکھا اور دیر تک دیکھتا رہا۔ دھول کا طوفان ہی تھا لیکن اس طرف سچ مچ بڑھتا چلا آرہا تھا۔ اسے پہلے تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے جب گہری بھنبھناتی سی آوازیں اس کے کانوں میں پڑنے لگیں تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ سب کو یقین تھا کہ شرارت گاؤں کے اندر سے ہوگی۔ کالو ملنگ' اشرف قصائی اور نبی تیلی جیسے لوگ فساد پر تلے ہوئے معلوم ہوتے تھے' لیکن بلوائی تو سچ مچ باہر سے آرہے تھے۔ وہ ابھی کھڑا سن ہی رہا تھا کہ ڈھول بجنے کی دبی دبی آواز بھی اس کے کانوں میں پڑنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے حالات نے سنجیدہ اور نازک صورت اختیار کرلی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ نیچے جاکر تیجا سنگھ کو اطلاع کرے لیکن یہاں مورچے پر کھڑے ہوکر دشمن کی نقل و

حرکت کو دیکھتے رہنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ اطلاع دینے کا کام اس نے ہنگ سکھ کے سپرد کر دیا۔
ہنگ بھاگتا ہوا سیڑھیوں سے اترنے لگا اور آخری سیڑھی تک پہنچتے پہنچتے چلّایا "ترک آگئے۔ ترک آگئے!"
بجلی کی سی لہر گوردوارے میں دوڑ گئی اور اسی لمحے دور سے ڈھول بجنے کی آواز بھی صاف سنائی دینے لگی۔
تیجا سنگھ تھوڑی دیر کے لیے سچ مچ حیران سے رہ گئے۔ انھیں یہ اندیشہ نہیں تھا کہ سچ مچ حملہ ہو جائے گا۔ ان کا خیال تھا کہ تیلیوں کے محلّے میں یا گاؤں کے سرے پر اِکّا دُکّا واردات ہو جائے گی اور اگر قصبے کے سنگھ ڈٹے رہے تو گاؤں کے مسلمانوں کی ہمت نہیں ہوگی کہ ہاتھ اٹھائیں۔ سکھ بھاری تعداد میں تھے اور مسلمانوں کا کاروبار بہت کچھ سکھوں کے ساتھ تھا۔ سکھ مالدار بھی تھے اور ان کے پاس بندوقیں اور دیگر ہتھیار بھی تھے۔ لیکن اب ایسا لگ رہا تھا جیسے بات الٹی پڑ گئی ہو۔
ڈھول بجنے کی آوازیں نزدیک آنے لگیں۔ "یا علی" کا شور بھی قریب سے سنائی دیا۔ اسی وقت پچھواڑے سے زور کا نعرہ بلند ہوا۔
"اللہ اکبر!"
پل بھر کے لیے ہال کے اندر سکتہ سا چھا گیا۔ پھر گوردوارے کے اندر بھی جوش کی لہر دوڑ گئی۔
"جو بولے... سو نہال، ست سری اکا آ... ل!" کا جوابی نعرہ فضا میں گونج گیا۔
"گورو کا پیارا کوئی سنگھ یہاں سے باہر نہیں جائے۔ سب اپنے اپنے مورچے پر پہنچ جاؤ۔"
جسبیر کور کا ہاتھ اپنی کرپان کے دستے پر پہنچ گیا۔ سنگھوں نے لپک کر دیوار کے ساتھ رکھی اپنی اپنی تلوار اٹھالی۔ ساری سنگت اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔
"ترک! ترک آگئے! ترک آگئے۔" سب کی زبان پر تھا۔ "ترکوں کا لشکر آگیا۔"
"ترک آگئے۔" جسبیر کور نے جذبات بھری آواز میں کہا اور اپنے سر سے دوپٹہ اتار کر گلے میں ڈال لیا، اور پاس کھڑی عورت کو گلے لگا لیا۔
"ترک آگئے۔" اس نے جذباتی ہیجان کے تحت کہا۔
سب عورتوں نے اپنے اپنے دوپٹے اتار کر گلے میں ڈال لیے تھے اور "ترک آگئے، ترک آگئے" کہتی ہوئی ایک دوسرے سے گلے مل رہی تھیں۔ گورو کے سنگھ بھی ایک، دوسرے

سے بغل گیر ہو کر یہی الفاظ دہرا رہے تھے۔

"سب اپنی اپنی جگہ پہنچ جاؤ۔"

چند ایک سنگھوں نے بال کھول لیے تھے اور تلواریں میانوں سے نکال لی تھیں۔

"ترک آ گئے، ترک آ گئے!"

پھر تین گلوں سے ایک ساتھ آواز آئی۔

"جو بولے سو..... نہال!"

سارا گوردوارہ ایک بار پھر گونج اٹھا۔

"ست سری اکا... آ... آ... ل!"

جنگی کمیٹی کے ممبر سردار منگل سنگھ سنار، پریتم سنگھ بجاج اور بھگت سنگھ پنساری تینوں سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچ گئے جہاں تیجا سنگھ اور کشن سنگھ کے ساتھ مل کر جنگی حکمت عملی پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔

ڈھول مجیرے بجاتے ہوئے ترک گاؤں کے قریب پہنچ گئے تھے۔ شاید اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لیے انھوں نے ہوا میں گولی چلائی تھی۔ نعروں سے آسمان گونجنے لگا تھا۔

"یا علی!"

"اللہ اکبر!"

"ست سری اکا... آ... آ... ل!"

پھر کسی نے کہا کہ ترک ندی کی طرف سے گاؤں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ پیچھے سے ڈھلان پر چڑھ کر سکھوں کے گھروں میں لوٹ مار کریں گے۔ آگ لگائیں گے، کیوں کہ گھروں میں اس وقت کچھ بوڑھے لوگوں کے سوائے، جنھیں دھرم کی حفاظت کے جوش میں ان کے بیٹے گھروں میں چھوڑ گئے تھے، کوئی نہیں تھا اور سامان پر ہاتھ صاف کرنا بڑا آسان تھا۔

شام کے سائے ابھی پوری طرح اتر نہیں پائے تھے اور ندی کا رنگ ڈوبتے سورج کی لالی کی وجہ سے لال ہونے لگا تھا۔ بائیں طرف کا مورچہ ان گھروں سے دور تھا جن کو اس وقت ترکوں سے خطرہ تھا۔

اچانک بلدیو کو اپنی ماں کا دھیان آیا۔ اسے وہ گھر میں اکیلا چھوڑ آیا تھا اور دن بھر اس کی خبر نہیں لی تھی۔ سنگت میں ایسے ہی کچھ اور لوگ بھی تھے جن کا دل دھک دھک

کر رہا تھا کہ اب ان کے بوڑھے ماں باپ پر کیا بیتے گی۔

بلدیو سنگھ سے نہیں رہا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بال کھول دیے، پاجامہ اتار دیا، تلوار ننگی کر لی۔ اور ایک کچھا اور بنیان پہنے ننگی تلوار سر کے اوپر جھلاتا ہوا اپنے گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

"خون کا بدلہ خون سے لیں گے۔" وہ چلایا۔

کچھ لوگوں نے اسے واپس بلانے کے لیے آواز دی لیکن وہ آگے بڑھتا ہی چلا گیا۔

"خون کا بدلہ خون سے لیں گے!" چلاتا ہوا وہ گلی میں بھاگنے لگا۔

ہڈیوں کا ڈھانچا، دبلا پتلا بلدیو سنگھ، بھاگتے وقت اس کی پتلی پتلی ٹانگیں بکری کی ٹانگوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ بائیں طرف کی گلی کی سمت میں کیوں بھاگ گیا ہے۔ سامنے کی ڈھلان اترتا تو سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ جوش میں بلوائیوں سے لوہا لینے جا رہا ہے۔ دائیں طرف جاتا تو وہ راستہ قصائیوں کی گلی کی طرف جاتا تھا۔ بائیں طرف جانے کی کیا تک تھی؟

لیکن تھوڑی دیر بعد ہی وہ گلی سے نکل کر گوردوارے کی طرف واپس آتا دکھائی دیا۔ وہ اب بھی ہاتھ میں تلوار تھامے ہوئے ہے لیکن اسے جھلا نہیں رہا ہے۔ تلوار کی دھار بھی شام کے سایے میں کالی سی نظر آ رہی ہے۔ نزدیک آنے پر لوگوں نے دیکھا، تلوار لہولہان ہو رہی تھی۔ بلدیو سنگھ کے بنیان اور کچھے پر بھی خون کے چھینٹے تھے۔ وہ اب چلا نہیں رہا تھا، اور نہ بھاگ رہا تھا بلکہ اس کے چہرے پر عجیب وحشت سی چھا گئی تھی۔

کچھ لوگ سمجھ گئے کہ وہ کسی کو قتل کر کے لوٹا ہے۔ وہ گلی کے نکڑ پر رہنے والے بوڑھے لوہار کریم بخش کے سینے میں تلوار بھونک آیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اس کی ماں تو اب بچ نہیں سکتی، اسے تو ترکوں نے موت کی گھاٹ اتار دیا ہوگا، اس نے خون کا بدلہ خون سے لینے کی ٹھان لی تھی اور بوڑھا کریم ہی اس کے ہتھے چڑھ سکا تھا۔

گاؤں پر سائے اتر آئے تھے۔ نعروں کی گونج اور زیادہ تیز ہونے لگی تھی۔ بائیں طرف ڈھلان کے اوپر سے واقعی کواڑ توڑنے اور چنگھاڑ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ گوردوارے میں اشتعال آخری حد تک پہنچ چکا تھا۔

16

ہرنام سنگھ نے دوسری بار کنڈی کھٹکھٹائی تو اندر سے کسی عورت کی آواز آئی۔
" گھر پر نہیں ہیں، مرد باہر گئے ہیں۔"
ہرنام سنگھ ٹھٹکا کھڑا رہا۔ بنتو کی نگاہیں دائیں بائیں دیکھ رہی تھیں کہ انھیں آس پاس کسی نے دیکھ تو نہیں لیا۔
" تو دروازہ کھولنے کے لیے کہہ، بنتو! اندر عورت ذات ہے۔" اور ہرنام سنگھ ایک طرف کو ہٹ گیا۔
بنتو نے دروازہ کھٹکھٹایا اور ساتھ میں اونچی آواز میں بولی۔
" کرماں والیو! دروازہ کھولو۔ اسی مصیبت دے مارے آئے ہیں۔"
اپنی بیوی کی آواز سُن کر پَل بھر کے لیے ہرنام سنگھ کی نگاہیں جھک گئیں۔ یہ وقت بھی دیکھنا قسمت میں لکھا تھا، جب اس کی بیوی پناہ مانگنے کے لیے گڑگڑائے گی۔
دروازے کے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر اندر سے کسی نے چٹخنی کھولی۔ دروازہ کھلا۔ ان کے سامنے اونچی لمبی بڑی عمر کی ایک دیہاتی عورت کھڑی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ گوبر میں سنے تھے اور اس نے دوپٹہ اتار رکھا تھا۔ اس کے پیچھے الجھے بالوں والی ایک نوجوان عورت کھڑی تھی، اس نے بھی دونوں آستینیں چڑھا رکھی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ گائے بھینس کے لیے سانی تیار کر رہی تھی۔
" کون ہو۔ کیا کام ہے؟" بڑی عمر کی عورت نے پوچھا، حالانکہ ایک ہی نظر میں وہ ان کی حالت سمجھ گئی تھی۔
" بدنصیب ہیں۔ ڈھوک الٰہی بخش سے آئے ہیں۔ وہاں فسادی آگئے تھے۔ ہمارا گھر بار

لوٹ لیا ہے۔ رات بھر چلتے رہے ہیں۔"

لمحہ بھر کے لیے وہ عورت ٹھٹکی کھڑی رہی۔ وہ فیصلہ کن لمحہ تھا۔ جب انسان اپنے حالات، روایات، خیالات اور اقدار کے قیمتی اثاثے کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرتا ہے۔ عورت کچھ دیر تک ان کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔

"آجاؤ۔ اندر آجاؤ۔"

ہرنام سنگھ اور بنتو کی پلکیں اٹھیں اور دونوں دہلیز طے کر کے آنگن میں آگئے۔ ان کے اندر آجانے کے بعد اس عورت نے باہر جھانک کر دائیں بائیں دیکھا اور پھر جھٹ سے چٹخنی چڑھادی۔

چھوٹی عمر کی عورت ایک ٹک ان دونوں کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہوں میں شک تھا۔ بے اعتباری تھی۔

"کھاٹ بچھادے، اکراں۔" بڑی عمر کی عورت نے کہا اور خود زمین پر بیٹھ کر پہلے کی طرح گوبر سے تھاپیاں بنانے لگی۔

اکراں کوٹھری میں سے کندھوں پر دوپٹہ ڈالتی ہوئی چلی آئی اور دیوار سے لگی ہوئی چارپائی کو وہیں پر بچھادیا۔

"بھلا ہو تمھارا بہن۔ ہم ایک ہی دن میں گھر سے بے گھر ہوگئے۔" اور بنتو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"ڈھوک الٰہی بخش میں ساری عمر کاٹی ہے۔ وہاں پر دکان تھی۔ اپنا گھر تھا۔ پہلے تو سب نے کہا، نہیں بیٹھے رہو۔ کچھ نہیں ہوگا۔ پھر کل کریم خاں نے مشورہ دیا کہ گاؤں میں جمے رہنے میں خطرہ ہے۔ تم چلے جاؤ۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہماری پیٹھ پھیرنے کی دیر تھی کہ بلوائی آگئے۔ دکان لوٹ لی اور اس میں آگ بھی لگادی۔" ہرنام سنگھ نے کہا۔ عورت خاموش رہی۔ اسی دوران بنتو چارپائی سے اٹھ کر نیچے آگئی اور اس عورت کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

اکراں آئی اور بڑے تسلے میں رکھی تھاپیاں اٹھا کر لے گئی اور انھیں ایک ایک کر کے آنگن کی دیواروں پر لگانے لگی۔ عورت خاموشی سے گوبر کے ڈھیر کی تھاپیاں بناتی رہی۔ منھ سے کچھ نہیں بولی۔

"مرد کہاں گئے ہیں؟" ہرنام سنگھ نے پوچھا۔

عورت نے ایک بار پلٹ کر ہرنام سنگھ کی طرف دیکھا مگر اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ ہرنام سنگھ کی سمجھ میں اچانک آگیا کہ مرد کہاں گئے ہوں گے اور اس کا سارا جسم جھنجھنا اٹھا۔

"ہم تو ان دو کپڑوں میں نکل آئے ہیں۔" بنتو بولی۔ "سلامت رہے کریم خاں، جس نے ہماری جان بچادی اور سلامت رہو بہن تم، جس نے ہمیں پناہ دی۔"

گھر میں عجیب طرح کی خاموشی چھائی ہوئی تھی، جس کی وجہ سے ہرنام سنگھ کچھ کہتے کہتے چپ ہو جاتا تھا۔ کم عمر کی عورت اندر چلی گئی تھی اور ہرنام سنگھ کو بار بار محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوٹھری کے اندھیرے میں کھڑی ان کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہی ہے۔

عورت اٹھ کھڑی ہوئی اور تسلے میں رکھے پانی میں ہاتھ دھو کر ایک طرف کو چلی گئی، جہاں باورچی خانے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ اس نے مٹی کا کٹورا اٹھایا اور اس میں لسی انڈیل کر لے آئی۔ ہرنام سنگھ نے بندوق ابھی تک کندھے پر لٹکا رکھی تھی۔ کارتوسوں کی پیٹی اس کی پسینے میں شرابور قمیص کے ساتھ گویا چپکی ہوئی تھی۔

"لو لسی پی لو۔ رات بھر کے تھکے ہو۔"

کٹورا ہاتھ میں لیتے ہی ہرنام سنگھ پھپک کر رو پڑا۔ سارے دن کی تھکان، ہیجان اور دبے ہوئے جذبات یکایک پھوٹ کر نکل آئے اور وہ بچوں کی طرح بلک اٹھا۔ آخر وہ ایک اچھا کھاتا پیتا دکاندار تھا۔ کمر کے ساتھ سو دو سو روپے بھی باندھ کر لے آیا تھا۔ ساری عمر کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا، لیکن ایک ہی دن میں در در کی ٹھوکریں کھانے لگا تھا۔

"یہاں اونچی آواز میں رؤ نہیں سردار جی۔ گلی محلے والے سنیں گے تو دوڑے چلے آئیں گے۔ چپ چاپ بیٹھے رہو۔"

ہرنام سنگھ اپنی سسکیاں دبا کر چپ ہو گیا اور پگڑی کا شملہ نکال کر آنسو پونچھنے لگا۔

"بھلا ہو تمھارا بہن۔ تمھارا احسان ہم کبھی نہیں اتار سکیں گے۔"

"رب گھروں بے گھر کسی آں نہ کرے۔ رب دی مہر ہوئی تاں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

(خدا کسی کو گھر سے بے گھر نہ کرے۔ خدا کی مہربانی ہوئی تو سب ٹھیک ہو جائے گا)

عورت ابھی تک لسّی کا کٹورا ہاتھ میں لیے بنتو کے سامنے کھڑی تھی۔ لسّی کے کٹورے کو دیکھ کر بنتو شش و پنج میں پڑ گئی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر شوہر کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ مسلمان کے ہاتھ سے کٹورا کیسے لے لے؟ اُدھر رات بھر کی تھکان، حلق سوکھ رہا تھا۔ ان کی جھجک کو گھر کی عورت سمجھ گئی۔

"تمھارے پاس اپنا کوئی برتن ہو تو اس میں ڈال لو۔ اِدھر گاؤں میں ایک پنڈت کی دکان ہے۔ اگر وہ گھر پر ہوا تو اس کے یہاں سے تمھارے لیے دو برتن لے آؤں گی۔ مگر کیا معلوم، وہ ملتا ہے یا نہیں۔ ہمارے ہاتھ سے مت لو۔ لیکن دن بھر کیسے بھوکے پڑے رہو گے؟"

اس پر ہرنام سنگھ نے آگے بڑھ کر کٹورا لے لیا۔

"تیرا ہاتھ کا دیا ہوا امرت کے برابر ہے بہن۔ ہم تمھارا احسان کبھی نہیں اتار سکتے۔"

دھوپ نکل آئی تھی اور آس پاس کے گھروں سے آوازیں آنے لگی تھیں۔ ہرنام سنگھ نے آدھی لسّی پی کر کٹورا بنتو کی طرف بڑھا دیا۔

"سنو، سردار جی! میں تم سے کچھ چھپاؤں گی نہیں۔" مالکن بولی۔ "میرا گھر والا اور بیٹا گاؤں والوں کے ساتھ باہر گئے ہوئے ہیں۔ وہ ابھی لوٹتے ہوں گے۔ میرا گھر والا تو اللہ سے ڈرنے والا آدمی ہے۔ وہ تمھیں کچھ نہیں کہے گا۔ لیکن میرا بیٹا لیگی ہے اور اس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی ہیں۔ تم سے وہ کیا سلوک کریں گے، میں نہیں جانتی۔ تم اپنا نفع نقصان سوچ لو۔"

ہرنام سنگھ کا دل دھک سے رہ گیا۔ ابھی ابھی تو یہ عورت الگ سے برتن دینے تک کی بات کر رہی تھی۔ اور اب کچھ اور ہی سنانے لگی ہے۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"اس وقت دن دہاڑے ہم کہاں جائیں گے؟"

"میں کیا جانوں۔ اور کوئی دن ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی مگر اب کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ میں نے تمھیں بتا دیا ہے کہ مرد باہر گئے ہوئے ہیں اور اب لوٹنے والے ہوں گے۔ وہ تمھارے ساتھ کیسا سلوک کریں گے، میں نہیں جانتی۔ اگر کوئی بھلی بری بات ہو گئی تو مجھ سے مت کہنا۔"

ہرنام سنگھ دیر تک گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر کانپتی سی آواز میں بولا۔

"ست بچن۔ جو واہگورو کو منظور ہوگا۔ تیرے دل میں رحم جاگا، تو نے دروازہ کھول دیا۔ اب تو کہتی ہے کہ باہر چلے جاؤ تو ہم باہر چلے جائیں گے۔ چل بنتو! اٹھ...."

ہرنام سنگھ نے بندوق سنبھالی اور دونوں میاں بیوی دروازے کی طرف بڑھے۔ وہ جانتا تھا کہ دروازے کے باہر قیامت منھ پھاڑے کھڑی ہے مگر کوئی چارہ نہیں تھا۔

عورت جیوں کی تیوں چپ چاپ آنگن میں کھڑی انھیں دیکھتی رہی۔

جب ہرنام سنگھ نے چٹخنی کھولنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو عورت اچانک بول اٹھی۔

"نہ جاؤ جی، رک جاؤ۔ چٹخنی چڑھا دو۔" وہ کہنے لگی۔ "تم نے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ دل میں کوئی آس لے کر آئے ہو۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ تم لوٹ آؤ۔"

پیچھے تاریک کوٹھری کی دہلیز پر کھڑی اکراں اپنی ساس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ ساس کو رائے بدلتے دیکھ کر بولی "جانے بھی دو ماں۔ ہم نے مردوں سے پوچھا بھی نہیں ہے۔ انھیں بہت برا لگے گا۔"

"میں جواب دے لوں گی۔ تو اندر جا کر سیڑھی اٹھا لا۔ جلدی کر۔ گھر آئے کو نکال دوں؟ اللہ کے دربار میں سب ہی کو جانا ہے۔ جا، کھڑی میرا منھ کیا تک رہی ہے؟ اندر سے سیڑھی اٹھا لا۔"

ہرنام سنگھ اور اس کی بیوی دروازے پر سے پلٹ آئے۔ ہرنام سنگھ نے پھر ہاتھ جوڑ دیے۔

"واہ گورو، تمھیں سلامت رکھے بہن۔ تم جیسا کہو گی، ہم ویسا ہی کریں گے۔"

دن نکل آیا تھا۔ پاس پڑوس کی عورتیں ایک دوسرے کے گھر آنے جانے لگی تھیں۔ جگہ جگہ جھگڑے فساد کا ذکر ہو رہا تھا۔ اس گاؤں سے بھی گذشتہ شام بہت سے مرد منھ

لگاتے، برچھے بھالے ہوا میں جھلاتے اور ڈھول بجاتے پہلے گاؤں میں گھومتے پھرے تھے اور بعد میں مشرق کی سمت نکل گئے تھے۔ نہ جانے وہ کہاں گھومتے رہے تھے اور رات بھر کیا کرتے رہے تھے۔ مگر اب دن نکل آیا تھا اور گھر گھر میں ان کا انتظار تھا۔

اکراں سیڑھی لے آئی۔ اس کی ساس نے سیڑھی اس کے ہاتھ سے لے لی اور دیوار کے ساتھ لگا دی، جہاں کوٹھری سے اوپر ایک چھوٹی سی دوچھتی بنی ہوئی تھی۔

"ادھر آؤ جی، تم دونوں اوپر چڑھ کر میانی میں بیٹھ جاؤ۔ آواز نہیں کرنا کسی کو پتہ نہیں چلے کہ تم یہاں پر ہو۔ آگے اللہ مالک ہے۔"

ہرنام سنگھ کو چڑھنے میں تکلیف ہوئی۔ ایک تو بوجھل جسم، دوسرے کندھے پر لٹکتی بندوق بار بار ٹانگوں سے الجھ رہی تھی۔ جیسے تیسے ہانپتا ہوا وہ اوپر پہنچا۔ پیچھے پیچھے بنتو بھی چڑھ گئی دوچھتی چھوٹی سی تھی، مشکل سے اکڑوں بیٹھنے کی جگہ تھی۔ پیچھے ٹھساٹھس سامان بھرا تھا۔ جب ہرنام سنگھ نے روشن دان بند کر دیا تو اندھیرا ہو گیا۔ دونوں چپ چاپ بیٹھے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ نہ کچھ سوچنے کو تھا، نہ کہنے کو۔ ایک کمزور سی ڈوری میں ان کی قسمت لٹک رہی تھی۔

ہرنام سنگھ دیر تک ہانپتا رہا۔ دوچھتی میں گھٹن تھی، اندھیرا تھا۔ کچھ دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد مجبور ہو کر ہرنام سنگھ نے روشن دان کو تھوڑا سا کھول دیا، تاکہ کچھ ہوا اور روشنی اندر آ سکے۔ اس تھوڑی سی جگہ میں سے باہر کھلنے والا دروازہ اور آنگن کا تھوڑا سا حصہ نظر آ رہا تھا۔ نیچے خاموشی تھی۔

اسے لگا کہ ساس اور بہو جیسے آنگن میں سے ہٹ گئی ہوں۔

"اگر کوئی بُری بات ہو گئی بنتو، ہماری جان پر بن آئی تو میں پہلے تم پر گولی چلاؤں گا۔ تمھیں اپنے ہاتھوں سے ختم کر دوں گا۔۔۔" ہرنام سنگھ نے پھس پھسا کر تیسری بار کہا: "اگر ہم پکڑے گئے، اور کوئی چارہ نہیں رہا۔"

بنتو چپ رہی۔ وہ ایک ایک لمحہ گن رہی تھی کہ اب کیا ہوگا، اب کیا ہوگا، اس کی سوچ اس سے آگے بڑھ ہی نہیں پا رہی تھی۔

نیچے پچھلی کوٹھری میں ساس بہو کے بیچ دبی دبی گفتگو چل رہی تھی۔ اکراں منہ پھلائے

ہوئے تھی۔

" کافراں دی پناہ دینے اد۔ بہو ماڑا کرنے او۔ مرڑ تداں پوچھ سن۔"

(کافروں کو پناہ دی ہے، بہت برا کیا ہے۔ مرد آکر تم سے پوچھیں گے۔"

لیکن اس کی ساس پریشان نہیں ہوئی۔

" توں چپ کر۔ بد نصیب کوئی آتے میں دھکا دے کر باہر کھدیڑ دیواں۔"

(تو چپ رہ۔ کوئی بد نصیب آئے تو میں اسے دھکا دے کر باہر نکال دوں۔)

" نہ جان نہ پہچان۔ یہ ہمارے کیا لگتے ہیں؟ کتنا بُرا لگے گا، ابا کو بھی اور رمضان کو بھی۔ اوپر دونوں چڑھ بیٹھے ہیں اور سکھڑے کے ہاتھ میں بندوق ہے۔ ہمارے مرد آئے اور اس نے گولی چلادی، تو؟ تم نے تو اعتبار کر کے انھیں اوپر بٹھا دیا ہے۔"

ساس آکراں کا منھ دیکھتی رہ گئی۔ اس کی بات میں وزن تھا۔ اگر بات بگڑ جائے، مردوں کے لوٹنے پر انھیں پتہ چل جائے اور ان کے بیچ تو تو، میں میں ہو جائے، گالی گلوچ ہو جائے، رمضان یوں بھی کتنے دنوں سے بوکھلایا ہوا ہے اور وہ اوپر بیٹھا گولی چلادے تو کیا ہوگا؟ نیچے کھڑے آدمی کو تو ہلاک کر ہی دے گا۔ کسی کو پناہ دینا اور بات ہے اور اپنے بیٹے اور گھر والے کی جان جوکھم میں ڈالنا دوسری بات۔ اس میں کیا عقلمندی ہے؟ یہ بات اسے سوجھی کیوں نہیں؟

وہ اٹھ کر بُرجھتی کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔" سُن سردار جی، میری بات۔" اس نے دبی آواز میں کہا۔

ہرنام سنگھ نے روشن دان کو اور تھوڑا سا کھول دیا۔

" کیا ہے بہن؟"

" اپنی بندوق مجھے دے دے۔ ادھر سے لٹکا دے، میں پکڑ لوں گی۔"

ہرنام سنگھ بندوق دینے سے پہلے ٹھٹکا رہا۔

" میں بندوق کیسے دے دوں بہن۔"

" نہیں تو بندوق دے دے۔ بندوق لے کر تم اوپر نہیں بیٹھ سکتے۔"

پھر دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔ بندوق دے دینے کا مطلب تھا اپنی جان ان کے ہاتھ میں دے دینا۔ اب اگر وہ انکار کر دے تو وہ اسے فوراً گھر سے باہر نکال

سکتی ہے اور باہر، دن دہاڑے، بندوق بھلے ہی کندھے سے لٹک رہی ہو، کوئی حفاظت نہیں۔

" سنتے ہو سردار جی، بندوق دے دو۔ میرے گھر کے اندر رہتے تجھے بندوق کی کیا ضرورت ہے۔"

" بندوق دے کر تو میں بالکل نہتا ہو جاؤں گا بہن! کہاں مارا مارا پھروں گا۔ اس کا مجھے حوصلہ ہے۔"

" تو بندوق دے دے۔ ادھر لٹکا دے۔ جب جائے گا تو میں لوٹا دوں گی۔"

ہرنام سنگھ نے اپنی بیوی کے منھ کی طرف دیکھا۔ پھر بندوق خاموشی سے نیچے لٹکا دی۔

بندوق دے چکنے کے بعد ہرنام سنگھ کو خیال آیا کہ وہ اس میں سے گولیاں تو نکال لیتا۔ بھری ہوئی بندوق اس کے ہاتھ میں دے دی۔ لیکن اس نے سر جھٹک دیا۔ جہاں زندگی ہی غیر امکانی ہو، وہاں کیا فرق پڑتا ہے کہ بندوق سے گولیاں نکالیں یا نہیں نکالیں۔ گولیاں نکال لیتا تو موت کا ایک اور منصوبہ کم ہو جاتا، نہیں نکالیں تو موت کے ایک ہزار منصوبوں میں ایک اور منصوبہ جا ملا۔ ہرنام سنگھ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اتنی گہری کہ بنتو کو لگا کہ اسے نیچے کھڑی عورت اور اس کی بہو نے بھی سن لیا ہوگا۔

پرچھتی میں پھر اندھیرا چھا گیا۔

کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ کل اس وقت بنتو اپنے گھر میں صندوق میں سے کپڑے سنبھال رہی تھی۔ آج میاں بیوی چوہوں کی طرح اس اندھیری پرچھتی میں چھپے بیٹھے تھے۔ کل وہ اور کریم خاں ان فسادوں کو برا کہہ رہے تھے، ان لوگوں کو برا بھلا کہہ رہے تھے جن کی آنکھوں سے مروت ختم ہو گئی تھی۔ جیسے جو کچھ ہو رہا تھا، وہ باہر کہیں ہو رہا تھا۔ جس پر وہ بس بحث کر سکتے تھے، اپنی رائے دے سکتے تھے اور اب وہ فساد کے ایک ہی جھونکے میں کہاں سے کہاں پٹک دیے گئے تھے۔

اچانک یہ سوچ کر اس کا دل ڈوب گیا کہ بندوق اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہے اور وہ اب اسے واپس نہیں ملے گی۔ یہ میں کیا کر بیٹھا؟ اپنے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ کاٹ لیے۔ بندوق تو میرے لیے اندھے کی لاٹھی کی طرح تھی۔ اب وہ مجھے کہاں ملے گی؟ یہ سوچتے، سوچتے ہرنام سنگھ کو پسینہ چھوٹ گیا ہے۔ اسے اپنے سے زیادہ اپنی بیوی کی فکر تھی۔ اب میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا تو کس بوتے پر؟ اب تو لوگ پتھر مار مار کر ہمیں مار

ڈالیں گے۔ بھکتی گیان اور انسان دوستی کی برسوں کی کمائی ہرنام سنگھ حقیقت کے ایک ہی تھپیڑے میں کھو بیٹھا تھا۔

"جسبیر کا کچھ پتہ چل جاتا۔" اچانک بنتو بڑبڑائی۔

ہرنام سنگھ چپ رہا۔ کہتا بھی کیا! رہ رہ کر کسی کسی وقت بنتو کے اندر سے ماں بولنے لگتی تھی۔ رات کو نالے کے کنارے چلتے ہوئے بھی اس نے ایک دو بار اپنے بچّوں کو یاد کیا تھا اور اب پھر سے کرنے لگی تھی۔ جب اس کے اپنے سر سے خطرے کا سایہ ٹل سا جاتا، اسے بچّوں کی یاد ستانے لگتی تھی۔

گاؤں میں شور ہوا۔ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ مرد عورتوں کی ایک ساتھ آوازیں سنائی دینے لگیں۔ تبھی کسی نے دروازے کو زور سے کھٹ کھٹایا اور کسی عورت کی آواز آئی:

"ری اکراں، آ باہر، دیکھ وہ لوٹ آرہے ہیں۔"

یہ اکراں کی کسی سہیلی کی آواز تھی۔ اکراں دروازہ کھول کر بھاگتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اوپر بیٹھے ہرنام سنگھ کا دل پھر سے دھڑکنے لگا۔ بنتو نے نظریں اٹھا کر خاوند کے چہرے کی طرف دیکھا۔ دمکتا رہنے والا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور کپڑے مسلے ہوئے اور میلے ہو رہے تھے۔

پرچھتی کے ادھ کھلے روشن دان سے ہرنام سنگھ کو گھر کی مالکن نظر آئی۔ آنگن میں کھلے دروازے کے سامنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے وہ کھڑی تھی۔ اس کا اونچا قد اور خود اعتمادی دیکھ کر اس کا من سنبھل گیا۔ اس کا اعتماد جیسے پھر لوٹ آیا۔ اس عورت کے رہتے ابھی سب کچھ کھو نہیں گیا ہے۔ سب کچھ مر نہیں گیا ہے۔

"اگر واہ گرو منظور ہوگا تو ہم پر آنچ نہیں آئے گی۔ تم تو بھگت ہو، تمھیں کس بات کا ڈر ہے۔" بنتو نے اپنے شوہر کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہا۔ ہرنام سنگھ چپ رہا۔

باہر آوازیں بڑھنے لگیں۔ ہنسی قہقہوں کی آوازیں تھیں۔ بڑھتے قدموں کا شور تھا۔ آنگن کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ تبھی اکراں کے بولنے اور اونچا اونچا ہنسنے کی آواز آئی۔ ہرنام سنگھ سمجھ گیا کہ گھر کے مرد رات بھر کی کارگزاریوں کے بعد لوٹ آئے ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد اکراں کا سسر اور اکراں ایک بڑا سا کالے رنگ کا ٹرنک اٹھائے ہوئے اندر آئے۔ سسر کے سر کی پگڑی بیٹھی ہوئی تھی۔ شاید وہ ٹرنک کو گاؤں تک سر

پر اٹھا کر لایا تھا۔

ہرنام سنگھ نے ہاتھ بڑھا کر بیوی کے گھٹنے کو چھوا۔

"ہمارا ٹرنک ہے۔ بڑا والا ٹرنک۔ ہماری دکان لوٹتے رہے ہیں۔"

بنتو نے باہر جھانک کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

"ابھی تک تالا بند ہے۔" ہرنام سنگھ بڑبڑایا۔

اکراں کا سسر ٹرنک کے اوپر بیٹھ گیا تھا اور پگڑی اتار کر ماتھے کا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ اس کی بیوی نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔

"رمضان نہیں آیا۔"

"رمضان تبلیغ کرنے گیا ہے۔"

اوپر بیٹھے ہرنام سنگھ نے پھر ہاتھ بڑھا کر اپنی بیوی کا گھٹنا چھوا: "احسان علی ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ اس کا میرے ساتھ لین دین رہا ہے۔"

"بند کا بند ٹرنک اٹھا لائے ہو ابا، کیا معلوم اس میں کچھ ہے بھی یا نہیں۔"

"کیوں؟ اتنا بھاری ہے۔ میری تو کمر دوہری ہو گئی۔ کپڑوں کا ٹرنک ہے۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہو گا۔"

"بس ایک ٹرنک ہی لائے ہو! رمضان بھی کچھ لا رہا ہے؟"

"وہی اسے کھینچ کر باہر لایا تھا۔ پورا کا پورا ٹرنک اٹھا لائے ہیں۔ تمہیں اور کیا چاہیئے؟"

"لاؤ، اسے کھولتے ہیں۔ اس کا تالا توڑیں؟ اکراں نے کہا اور بھاگ کر وہ کوٹھڑی میں سے ہتھوڑی اٹھا لائی۔ چوری کے مال کو دیکھنے کے جوش میں وہ پرچھتی میں چھپے مظلوموں کے بارے میں اپنے سسر کو بتانا بھی بھول گئی تھی۔ اس کی ساس اب بھی چپ چاپ پاس ہی کھڑی تھی۔

"لسی پلا راجو، پیاس لگی ہے۔" سسر نے کہا اور اس کی بیوی راجو الٹے قدموں لسی لانے چلی گئی۔

ٹرنک کے تالے پر ٹھکا ٹھک شروع ہو گئی۔

احسان علی کٹورا ہاتھ میں لیے لسی پی رہا تھا جب راجو یعنی اس کی بیوی نے اسے بتایا کہ اس نے گھر میں ایک سکھ اور اس کی بیوی کو پناہ دے رکھی ہے۔

تبھی اوپر سے ہرنام سنگھ نے پورا روشن دان کھول دیا اور گردن نکال کر کہا: ”تالا کیوں توڑتی ہو بیٹی، یہ لو چابی، یہ ہمارا ہی ٹرنک ہے۔“ پھر احسان علی سے مخاطب ہو کر کہا: ”گرو مہاراج تمھیں سلامت رکھیں۔ یہ ٹرنک ہمارا ہے، پر اسے اب تم اپنا ہی سمجھو۔ اچھا ہوا جو یہ تمھارے ہاتھ لگا۔“

احسان علی نے نظر اوپر اٹھائی تو جھینپ گیا۔ جیسے وہ چوری کرتے پکڑا گیا ہو۔

اکراں کے ہاتھ رک گئے اور وہ چلّا کر بولی: ”اماں نے انھیں پناہ دی ہے۔ میں نے کہا بھی تھا، کافر ہیں، انھیں اندر نہ گھسنے دو۔ مگر اماں نے میری بات نہیں مانی۔“

اکراں اپنے سسر کو خوش کرنے کے لیے کہہ رہی تھی مگر احسان علی ابھی تک ٹھٹکا کھڑا تھا اور شرمندگی سی محسوس کر رہا تھا۔ کسی زمانے میں دونوں کے بیچ میں لین دین رہا تھا اور اچھی جان پہچان تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہرنام سنگھ کے ساتھ کیسا برتاؤ کرے۔ ایسے حالات کی اسے امید نہیں تھی۔ اس کے خون میں اس قدر گرمائی بھی نہیں تھی کہ وہ کسی ہندو یا سکھ کو دیکھ کر آگ بگولا ہو اٹھتا۔

”ہرنام سنگھ نیچے آجا۔“ پھر اپنی چوری کو اس احسان کے نیچے چھپاتے ہوئے جو اس کی بیوی نے ان دو لوگوں پر کیا تھا، ذرا دلیری سے بولا: ”خیر مناؤ، جو تم نے میرے گھر میں پناہ لی۔ اور کسی گھر جاتے تو اس وقت جان سے بھی ہاتھ دھو چکے ہوتے۔“

اکراں تالا کھولنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی لیکن راجو نے اس کے ہاتھ سے چابی لے لی تھی اور اس کے بار بار مانگنے پر بھی دینے سے انکار کر رہی تھی۔

”میں تو تم سے کچھ نہیں کہوں گا، ہرنام سنگھ۔ تم میرے گھر آئے ہو مگر اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میرے بیٹے کو پتہ چل گیا کہ تم یہاں پر ہو تو وہ تمھارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کرے گا۔ گاؤں والوں کو پتہ چلا کہ ہم نے تمھیں پناہ دی ہے تو ہمارے لیے بہت برا ہوگا۔“

”ہمیں سب منظور ہے احسان علی، ہمارا کیا کوئی بس چل سکتا ہے؟ لیکن اس وقت دن دہاڑے ہم باہر جائیں گے تو ہمیں کون چھوڑے گا؟“

احسان علی چپ ہو گیا اور اپنی بیوی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا، جیسے کہہ رہا ہو، یہ کون سا بکھیڑا تم نے کھڑا کر دیا ہے۔

"کل رات بھی لوگ تمھیں ڈھونڈ رہے تھے۔" احسان علی نے کہا: "اب بھی کسی کو پتہ چل گیا کہ تم یہاں چھپے بیٹھے ہو، تو لوگ ہمیں بھی نہیں چھوڑیں گے۔ تمھارا بھی اسی میں بھلا ہے اور ہمارا بھی اسی میں بھلا ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

اکراں بغیر کہے جاکر سیڑھی اٹھالائی اور اسے پرچھتی کے نیچے لگا دیا۔ دونوں میاں بیوی چپ چاپ نیچے اتر آئے۔ دونوں قربانی کے بکرے نظر آرہے تھے۔

لیکن پھر وہی ناٹک ہوا جو صبح کو ہوا تھا۔ دونوں نیچے اتر آئے۔ دونوں میں سے کوئی بھی نہیں گڑگڑایا۔ دونوں مطمئن تھے اور خاموش کھڑے تھے۔ ہرنام سنگھ اپنی بندوق مانگنے والا تھا اور راجو آنگن کے بیچ و بیچ چپ چاپ کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ احسان علی نے کہا: "انھیں بھوسے کی کوٹھڑی میں بٹھا دے راجو اور باہر سے تالا لگا دے۔ لے یہ بھی تالا کھول کر لے جا، جا جلدی کر۔" پھر ہرنام سنگھ پر احسان جتاتے ہوئے کہا: "نگاہ کا لحاظ ہے ہرنام سنگھ، لیکن جو کچھ کافروں نے شہر میں کیا ہے، اسے یاد کر کے تو خون کھول اٹھتا ہے۔"

آگے آگے راجو چل رہی تھی اور پیچھے پیچھے بنتو اور ہرنام سنگھ۔ کوٹھری پھلانگ کر گھر کے پیچھے وہ ایک اندھیرے سے دالان میں پہنچے جہاں گوبر، چارے اور مویشیوں کی تیز بو آرہی تھی۔ یہاں پر راجو نے ایک کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ کوٹھری فرش سے چھت تک بھوسے اور چارے سے بھری تھی۔

"ادھر بیٹھ جاؤ۔ میرا آدمی بڑا نیک بخت ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم لوگوں کی جان پہچان ہے۔ جیسے تیسے یہاں وقت کاٹ لو۔"

ہرنام سنگھ اور اس کی بیوی یہاں بھی اسی طرح سے بیٹھ گئے جیسے پرچھتی میں بیٹھے تھے۔ یہاں راجو نے دروازہ بند کر دیا اور باہر سے چٹخنی چڑھا دی۔

وقت کٹنے لگا۔ دونوں کو کچھ کچھ حوصلہ ہونے لگا کہ یہاں شام تک پناہ ملی رہے گی۔ دن میں کسی وقت راجو روٹیاں اور لسی بھی دے گئی۔ دونوں کے پیٹ میں روٹی گئی تو جان میں جان آئی۔ دونوں دیر تک اندھیرے میں بیٹھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ بنتو نے ہرنام سنگھ سے پوچھا: "تم کیا سوچتے ہو، اقبال سنگھ گاؤں میں ہی ہوگا یا وہاں سے بھاگ گیا ہوگا؟"

"جو واہ گرو کو منظور ہوگا۔ کوئی نیک بخت اسے بھی مل جائے تو اس کی بھی جان بچ جائے۔"
جسبیر وا کیلی نہیں ہے۔ یہ اچھا ہے۔ گاؤں میں اپنی سنگت کے لوگ بہت ہیں سب ہی ایک جگہ اکٹھے ہوگئے ہوں گے۔"

اچانک ہرنام سنگھ نے کہا: "یہ لوگ ہماری بندوق لوٹا دیں گے نا؟ تو کیا سوچتی ہے؟ مگر میرا دل نہیں مانتا۔"

وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کوٹھری بند تھی۔ لیکن اتنی امس نہیں تھی جتنی پرچھتی میں تھی۔ چارے کے گٹھڑوں کے آگے بیٹھے بیٹھے ان کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ رات بھر کے تھکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ان کی آنکھ لگ گئی۔

ان کی نیند اس وقت ٹوٹی جب ان کے دروازے پر کلہاڑے پڑ رہے تھے اور کوئی چلا چلا کر کہہ رہا تھا: "نکل آؤ باہر، کہاں اندر گھسے بیٹھے ہو۔ تمھاری ماں کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نکالو باہر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمھاری ۔ ۔ ۔ ۔"

کلہاڑی کے وار بڑھتے جا رہے تھے۔ ہرنام سنگھ اور اس کی بیوی دونوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے جیسے کوئی بُرا خواب دیکھ کر اٹھے ہوں اور سر سے پاؤں تک اٹھے ہوں۔

"نکال چابی، کافروں پناہ دی ہے۔ تمھاری کافروں کی میں۔ ۔ ۔" اور پھر ایک اور وار دروازے پر پڑا۔

"آہستہ بول رمضان۔" کسی عورت کی آواز تھی۔ شاید اکرام اپنے شوہر سے آہستہ بولنے کو کہہ رہی تھی۔

دروازے پر پھر کلہاڑی پڑنے لگی۔ دروازہ اوپر سے چر گیا جس سے روشنی ایک اور لکیر نظر آنے لگی۔

پھر کسی دوسری عورت کی آواز سنائی دی۔ "کیوں بھونک رہا ہے تو کیا ہوا ہے؟" را.جو کی آواز تھی: "کدھر ہے وہ چڑیل؟ تیری میں نے زبان نہ کھینچ لی تو کہنا۔ حرام زادی، تجھے منع کیا تھا، اپنے خصم کو نہ بتانا! کیوں بتایا ہے؟ تیرے پیٹ میں بات نہیں پچتی؟ ۔ ۔ ۔ تو کیا چاہتا ہے، رمضان؟ گھر میں خون کرے گا؟ گھر میں پناہ لینے والے کو مارے گا؟ یہ آدمی ہماری جان پہچان کا ہے۔ ہم اس کے دین دار رہے ہیں۔"

"بہت بک بک نہیں کر ماں، شہر میں ان کافروں نے دو سو مسلمان مار ڈالے

ہیں۔" اس کے ساتھ ہی کلہاڑی کا ایک وار ہوا۔ "نکل آؤ، باہر کافرو، تمھاری ......"

دو مزید واروں میں ہی کنڈا ٹوٹ گیا اور دروازہ بھر بھرا کر کھل گیا۔ بہت ساری روشنی ایک دم اندر آگئی تھی۔ رمضان ہانپ رہا تھا۔ کلہاڑی اس کے ہاتھ میں تھی۔ پاس میں اکواں کھڑی تھی، پیلا پیلا سہما سا چہرہ، ایک طرف راجو کھڑی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ کمر پر تھے۔

"نکل آؤ، باہر، کافرو۔"

رمضان نے جھانک کر اندر دیکھا۔ ہرنام سنگھ اور اس کی بیوی اندھیرے میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر بیٹھے دروازے کی طرف چندھیائی آنکھوں سے دیکھے جا رہے تھے۔ دروازہ کھلنے پر ہرنام سنگھ اٹھ کھڑا ہوا اور خاموشی سے باہر آگیا۔

"مار ڈال ......" کھوکھلی آواز میں ہرنام سنگھ نے کہا۔

"تیری میں ......" رمضان بولا اور بایاں ہاتھ بڑھا کر ہرنام سنگھ کی گردن پکڑ لی۔ ہرنام سنگھ کی گاڑھے کی قمیص کا اوپر والا بٹن ٹوٹ کر گر پڑا۔ اس جھٹکے میں ہرنام سنگھ کی پگڑی ڈھیلی ہو گئی۔ پھر، جس تیزی سے رمضان نے اس کے گلے کو پکڑا تھا، اسی تیزی سے چھوڑ بھی دیا۔ گردن پر انگلیوں کے لال لال نشان پڑ گئے تھے۔

ہرنام سنگھ کو اس نے بھی پہچان لیا تھا۔ اس کی دکان پر اس نے بھی ایک دو بار چائے پی تھی۔ اس کی داڑھی اب پہلے سے کہیں زیادہ سفید ہو گئی تھی اور جسم دبلا ہو گیا تھا۔

رمضان نے دو تین بار کلہاڑی اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ اسے اٹھا نہیں پایا۔ کافر کو مارنا اور بات ہے اور اپنے گھر میں کسی جان پہچان والے پناہ گزین کو مارنا دوسری بات۔ اس کا خون کرنا پہاڑ کی چوٹی سر کرنے سے زیادہ مشکل ہو رہا تھا۔ مذہبی جنون اور نفرت کے اس ماحول میں مروت کی ایک پتلی سی لکیر کہیں پر اب بھی کھنچی تھی جسے پار کرنا بہت مشکل تھا۔ اسے رمضان بھی پار نہیں کر پا رہا تھا۔

رمضان اس کے سامنے ہانپتا کھڑا رہ گیا۔ پھر گالیاں بکتا ہوا باہر چلا گیا۔

آدھی رات کا وقت ہوگا، جب اونچی لمبی راجو آگے آگے چلی جا رہی تھی۔ ہرنام سنگھ اور بنتو اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ پیڑوں کے جھرمٹ تک راجو ان کے ساتھ آئی۔ چاند، پیڑوں

کے جھرمٹ کے اوپر کھِلا تھا۔ اور آسمان اس کی چاندنی میں جھلملا رہا تھا۔ پھر وہی، پھر وہی تنہائی، وہی پُراسرار اور خوفناک ماحول، پھر وہی چاندنی اور اندھیرا آپس میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے پیڑوں کے جھرمٹ اور اس کے پار پھیلا ہوا لامحدود ماحول اور پُراسرار اور بھیانک نظر آنے لگا تھا۔ آگے آگے چلتی راجو کا جسم بڑا بھاری بھرکم لگ رہا تھا۔ راجو ہاتھ میں دونالی بندوق اٹھائے ہوئے تھی۔

وہ پھر سے ندی کے پار اتر رہے تھے۔ بائیں طرف دور، آسمان لال ہو رہا تھا۔ ہرنام سنگھ نے دھیرے سے اپنی بیوی کا ہاتھ دبا کر کہا: "بائیں طرف دیکھو... دیکھا؟"

"ہاں، کوئی گاؤں جل رہا ہے۔"

"واہ گرو....." بنتو بدبدائی۔

چلتے چلتے ہرنام سنگھ کے پاؤں پھر ٹھٹک گئے۔ بہت فاصلے پر دوسری طرف بھی فضا لال ہو رہی تھی۔

"وہ گاؤں کون سا ہے؟ وہ بھی جل رہا ہے۔"

بنتو چپ رہی۔

ہرنام سنگھ نے گھوم کر دیکھا۔ چاندنی میں گاؤں کے مٹی کے گھر کھڑے تھے۔ کسی کسی گھر میں چراغ ٹمٹما رہے تھے۔ گھروں کے باہر بھوسے کے اونچے اونچے ڈھیر تھے اور کہیں کوئی بیل گاڑی کھڑی تھی۔

پیڑوں کے جھرمٹ میں پیر کی سفید قبر انھیں نظر آئی۔ اس پر چراغ نہیں جل رہا تھا۔ آج اس پر چراغ جلانا لوگ بھول گئے تھے۔

راجو جھرمٹ کے کنارے کنارے چلتی جا رہی تھی۔ پھر جھرمٹ ختم ہونے پر وہ ڈھلان آگئی جس پر چڑھ کر اسی دن صبح سویرے ہرنام سنگھ اور اس کی بیوی گاؤں میں داخل ہوئے تھے۔ راجو رک گئی۔ راجو نے اپنے ہاتھ میں پکڑی بندوق ہرنام سنگھ کے ہاتھ میں دے دی۔

"جاؤ اب، رب راکھا۔ سیدھے کنارے کنارے چلے جاؤ۔ آگے تمھاری قسمت!" اس کی آواز بھرا گئی۔

"تم نے ہم نے بڑا احسان کیا ہے راجو بہن، ہم اسے کبھی نہیں بھول سکتے۔" بنتو نے کہا۔

"اگر زندگی رہی تو تیرا احسان...." ہرنام سنگھ کی آواز لڑکھڑا گئی۔

" میں کے جاناں بھین، اپڑنا اپڑنا نصیب ۔چھواں پاسے آگ لگی ہے "۔

(میں کیا جانوں بہن ؟ میں نہیں جانتی، میں تمھاری جان بچارہی ہوں یا تمھیں موت کے منھ میں جھونک رہی ہوں ۔ چاروں طرف آگ لگی ہے ۔)

یہ کہتے ہوئے راجو نے اپنا ہاتھ اپنے کرتے کی جیب میں ڈالا اور سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک چھوٹی سی پوٹلی نکالی۔

" یہ لو، یہ تمھاری چیز ہے ۔"

" کیا ہے راجو بہن ؟ "

" ایہہ تواڈے صندوق وچ ملے ہَن ۔ مَیں کڈ لیائی پاں، تساں دے اوپر اوکھا ویلا آیا ہے ۔ زیور کول ہوئے تاں سہارا ہووے گا "۔

(یہ تمھارے ٹرنک میں سے ملے ہیں ۔ میں نکال لائی ہوں ۔ تمھارے اوپر سخت وقت ہے۔ زیور پاس میں ہو تو سہارا رہتا ہے ۔)

" واہ گرو تمھیں سلامت رکھیں بہن ۔ اچھے کرم کیے تھے جو تم سے ملنا ہوا "۔ کہتے ہوئے بنتو رو پڑی ۔

" جاؤ، رب راکھا، دیر ہو رہی ہے "۔ راجو نے کہا ۔

وہ انھیں نہیں بتا سکتی تھی کہ کس سمت میں جائیں، کس گاؤں کی طرف جائیں، کس گھر کا دروازہ کھٹ کھٹائیں ۔ اس کے لیے کچھ بھی کہہ پانا ناممکن تھا ۔

دونوں میاں بیوی ڈھلان اترنے لگے ۔ راجو ٹیلے پر کھڑی انھیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی ۔ وہ راستہ بڑا اوبڑ کھابڑ، ریت مٹی اور گول گول پتھروں سے اٹا ہوا تھا ۔ اوپر چاند چمک رہا تھا جس کی وجہ سے سارا میدان کالی اور سفید پرچھائیوں میں بٹا ہوا تھا ۔ کہیں اندھیرے کا پھیلاؤ تھا تو کہیں پارے سی چاندنی تھی ۔

تھوڑی دور تک جانے کے بعد انھوں نے گھوم کر دیکھا ۔ راجو ابھی تک ٹیلے پر کھڑی تھی اور انجانی منزل کی طرف بڑھتے ان کے قدموں کو دیکھ رہی تھی ۔ پھر ان کے دیکھتے دیکھتے وہ پلٹی اور گاؤں کی طرف جانے لگی ۔ اس کے چلے جانے سے چاروں طرف پھیلا ویرانہ ان دونوں کے لیے اور بھی زیادہ بھیانک ہو گیا تھا ۔

17

اسی دوران دیہات کی ادبر کھابڑ زمین پر ایک اور ناٹک کھیلا جا رہا تھا۔ رمضان اور اس کے ساتھی ڈھوک الٰہی بخش اور مراد پور کی طرف سے لوٹ مار کا سامان اٹھائے ہنستے گپیں لڑاتے لوٹ رہے تھے جب انھیں دور ایک ٹیلے کے پاس بھاگتا ہوا ایک سکھ نظر آ گیا۔ یہ نہیں معلوم کہ وہ اس گروہ کو دیکھ کر بھاگا تھا یا پہلے سے ہی بھاگتا آ رہا تھا۔ لیکن جب وہ ان لوگوں کو نظر آ گیا تو انھیں سچ مچ ایک کھیل مل گیا "یا علی!" رمضان نے للکارا اور سبھی لوگ جو بیس تیس رہے ہوں گے، اس کے پیچھے بھاگ کھڑے ہوئے۔ زمین ہموار نہیں تھی۔ جگہ جگہ ٹیلے، نیچی کھائیاں اور ٹیلوں کے بیچ طرح طرح کوہ بنے تھے۔ سردار نے منھ تو گاؤں کی طرف ہی کر رکھا تھا لیکن بیل گاڑیوں کا راستہ چھوڑ کر کھیت کیاریوں کے بیچ میں سے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ لوگوں کی نظروں سے بچ جائے گا۔

ایک بار نظر آنے کے بعد وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

"چھپ گیا ہے سکھڑا!" رمضان نے کہا اور قدم تیز کر دیے۔ ابھی پچاس سو گز ہی گیا ہوگا کہ سردار کی ایک اور جھلک ملی، ٹیلوں کھائیوں کے راستے پر سردار ابھی بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ لیکن جب وہ لوگ اس جگہ پر پہنچے جہاں سردار نظر آیا تھا تو وہ وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔

"کسی کوہ میں گھس گیا ہے!" نوردین بولا "نکالو ماں کے۔۔۔ کو!"

اس وقت یہ لوگ ٹیلے کے اوپر کھڑے تھے۔ کچھ دیر پہلے سے ہی ان مجاہدوں نے ڈھیلے اور پتھر اٹھا اٹھا کر اس بھاگتے سکھ کی طرف پھینکنے شروع کر دیے تھے اور اب وہ ٹیلے میں

ہی گپھاؤں میں چاند ماری کرنے لگے کہ اگر وہ سکھ کسی گپھا میں چھپا ہوا ہے تو پتھر کھا کر اپنے آپ باہر نکل آئے گا۔ اگر سردار بھاگتا رہتا تو پتھروں کی اس بوچھار میں یقیناً اس طرح مارا جاتا جیسے برساتی چوہا مارا جاتا ہے لیکن شاید وہ بھاگتے رہنے کی بجائے ٹیلے کے اندر کسی اندھیری کوہ میں چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ آس پاس اَن گنت گپھائیں تھیں اور ان میں سے کسی میں وہ چھپا بیٹھا ہے اسے ڈھونڈھ لینا ان لوگوں کے لیے آسان نہیں تھا۔

"او سکھا نکل باہر!" نور دین نے اونچی آواز میں کہا جس پر سبھی لوگ قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ نور دین رمضان کے ہی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ گدھوں پر مٹی اور اینٹیں لاد کر لاتا لے جاتا تھا۔ اس کے مسوڑھے لال لال تھے اس لیے جب وہ ہنستا تو مسوڑھے دور تک نظر آتے تھے۔

کچھ لوگ نیچے اترے۔

"اس کوہ میں ہوگا۔" ایک بولا۔

"نکل باہر، تیری ماں کی...۔" دوسرے نے کہا اور پتھر اٹھا کر زور سے اندر پھینکا مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کوہ میں اندھیرا تھا اور وہ کافی گہری تھی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔

پھر بہت سے لوگوں نے ایک ساتھ بہت سے ڈھیلے پتھر اندر پھینکے مگر ان کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔

"اندر جا کر دیکھتا ہوں، اس طرح سے پتہ نہیں چلے گا۔" رمضان بولا۔

"سنبھل کر جانا رمضان، اس کے پاس کرپان ہوگی۔"

"اس کی ماں کی...۔" رمضان نے ہنس کر کہا مگر پھر بھی احتیاط کے طور پر اپنا چاقو کھول لیا۔ رمضان اندر گھسا تو اس کے پیچھے پیچھے دو تین ساتھی اور پہنچ گئے۔

"نکل اوئے کراڑا...!"

رمضان چلایا اور کچھ لوگ اور اندر گھس گئے۔

ان لوگوں نے ساری کوہ چھان لی مگر سردار نہیں ملا۔ وہ کسی دوسری کوہ میں چھپا بیٹھا تھا۔

تبھی گروہ کا ایک آدمی جو ابھی ٹیلے پر کھڑا تھا، چلا اٹھا: "وہ جا رہا ہے، ادھر ہی گیا ہے۔" اس نے بائیں طرف کے دو تین ٹیلے چھوڑ کر ایک ٹیلے کی طرف اشارہ کیا۔ سردار کے جھلملاتے کپڑے اسے

اس سمت نظر آگئے تھے۔

سب ہی لوگ اس طرف دوڑے۔ دو تین گپھاؤں میں ایک کے بعد ایک پتھر پڑنے لگے۔ ایک کوہ میں ایک پتھر سردار کے گھٹنے پر لگا مگر وہ چلایا نہیں بلکہ اور پیچھے دبک کر بیٹھ گیا۔ پھر دھڑادھڑ ڈھیلے پڑنے لگے۔ کوئی پتھر کوہ کی دیوار سے ٹکراتا تو کوئی اس کے سر، پیر، گھٹنے یا ماتھے سے ٹکراتا تھا اور سردار سسکی لے کر رہ جاتا تھا۔ ڈھیلے تینوں گپھاؤں میں لگاتار پڑتے رہے۔ آخر تھوڑی دیر بعد ایک کوہ میں سے کراہنے اور بلبلانے کی دبی دبی آواز آنے لگی۔ اب حملہ آوروں کو یقین ہو گیا کہ وہ اسی کوہ میں دبکا بیٹھا ہے۔ انھوں نے ڈھیلوں کی بوچھار اور تیز کر دی۔

تبھی ایک عقل مند کو ایک خیال سوجھا اور وہ چلا کر بولا: "اوے، ٹھہرو، اوئے! پتھر مت مارو!"

کچھ لوگوں نے ہاتھ روک لیے۔ اکا دکا پتھر پھر بھی چلتا رہا۔

پھر وہ دانش مند کوہ کے دہانے پر آکر کھڑا ہو گیا اور اونچی آواز میں بولا: "او سردار، دین قبول کر لے، ہم تجھے چھوڑ دیں گے!"

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ بس کانپتی سی کراہنے کی آواز آتی رہی۔

"بول سردار اسلام قبول کر لے گا یا نہیں؟ اگر منظور ہے تو اپنے آپ باہر آجا۔ ہم تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔ دوسری صورت میں ہم ڈھیلے مار مار کر تجھے مار ڈالیں گے۔"

اندر سے پھر بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ اکے دکے پتھر اب بھی پڑتے جا رہے تھے تاکہ سردار جلدی فیصلہ کر سکے۔

"نکل باہر خنزیر کے تخم، نہیں تو اندر سے تیری لاش نکلے گی۔"

پھر بھی خامشی۔ اندر سے آواز نہیں آئی۔ لوگ پھر سے پتھر اٹھا اٹھا کر مارنے لگے۔ رمضان علی ایک بڑا سا پتھر اٹھا لایا اور کھوہ کے سامنے کھڑے ہو کر کہنے لگا:

"ابھی نکل آؤ، ورنہ اس پتھر سے بھرتہ بنا دوں گا۔"

کچھ لوگ ہنس دیے۔ پتھر برابر چل رہے تھے۔

تبھی کھوہ کے اندر سے ہاتھ پیروں کے بل چلتا ہوا سردار کھوہ کے دہانے پر آگیا۔ اس کی پگڑی کھل کر گلے میں لٹک آئی تھی۔ کپڑے مٹی سے سنے تھے اور جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اور پتھروں کی مار سے اس کا ماتھا اور گھٹنا جگہ جگہ سے سوج گئے تھے۔ اس کے زخموں

سے خون رس رہا تھا۔
سردار اب بھی چوپائے کی طرح بیٹھا تھا اور اس کی آنکھیں اِدھر اُدھر تاکے جا رہی تھیں۔ درد کے مارے اس کا منھ ٹیڑھا ہو رہا تھا۔
"بول کلمہ پڑھے گا یا نہیں؟" رمضان نے کہا۔ وہ اب بھی بڑا سا پتھر ہاتھ میں اٹھائے ہوئے تھا۔
سردار پہلے تو احمق کی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس نے اوپر نیچے سر ہلا دیا۔
نوردین کے پیچھے کھڑے آدمی نے سردار کو پہچان لیا۔ یہ اقبال سنگھ تھا۔ میرپور میں کپڑے کی دکان کرتا تھا۔ اس کے باپ ہرنام سنگھ کی ڈھوک الٰہی بخش میں چائے کی دکان تھی۔ شاید وہ ڈھوک الٰہی بخش کی طرف ہی بھاگا جا رہا تھا کہ راستے میں گھیر لیا گیا۔ پہچانتے ہی وہ آدمی اور زیادہ نوردین کے پیچھے ہو گیا تاکہ اقبال سنگھ سے اس کی نظریں نہ مل پائیں۔ بلکہ بعد میں وہ پیچھے ہی پیچھے رہا۔ نہ کچھ بولا، نہ پتھر پھینکا۔ مگر اس نے دوسرے لوگوں کو منع بھی نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے منع کرنے کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔
"منھ سے بول مادر...! بول، نہیں تو دیکھ، یہ پتھر ابھی تیری کھوپڑی پر پڑے گا۔"
"کلمہ پڑھوں گا۔" سسکیوں کے بیچ اقبال سنگھ نے کہا۔
تبھی فلک بوس آواز بلند ہوئی:
"اللہ ہو اکبر!"
"نعرۂ تکبیر! اللہ اکبر!" سب نے پھر نعرہ لگایا۔
رمضان نے پتھر ایک طرف پھینک دیا۔ سبھی نے اپنے اپنے ہاتھ سے پتھر پھینک دیے۔ رمضان نے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا: "اٹھ آ، اب تو ہمارا بھائی ہے۔"
اقبال سنگھ کا بدن جگہ جگہ سے درد کر رہا تھا۔ وہ اب بھی کراہ رہا تھا۔ درد، گھبراہٹ اور تھکن کے مارے اس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔
"آجا، گلے مل لے۔" رمضان نے کہا اور اسے گلے لگا لیا۔
رمضان کے بعد سبھی نے اسے باری باری گلے سے لگایا۔ پہلے سر دائیں کندھے پر رکھتے پھر وہاں سے اٹھا کر بائیں کندھے پر، پھر دوبارہ دائیں کندھے پر۔ بغل گیر ہونے کا یہی مسلمانی طریقہ تھا۔

اقبال سنگھ کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اور گلا سوکھ رہا تھا۔ لیکن تین چار بار کی مشق سے وہ بغل گیر ہونے کا ڈھنگ سمجھ گیا۔

اقبال سنگھ کو امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی ماحول بدل جائے گا اور اس کے خون کے پیاسے لوگ اسے سینے سے لگالیں گے۔

وہ ٹیلوں کے جھرمٹ سے باہر نکل آئے۔ رمضان اسے تھامے ہوئے تھا۔ پھر گیہوں کے لہلہاتے کھیتوں کے بیچ سے آگے آگے اسے ہانکتے ہوئے سے لے چلے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی فتح کی نشانی کے طور پر اس کی نمائش کرتے چلیں یا ایک حقیر قیدی کی طرح جس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور آخر میں پکڑا گیا تھا یا ایک ہم مذہب بھائی کی طرح لے چلیں جسے انھوں نے گلے لگالیا تھا۔ اقبال سنگھ سے ٹھیک طرح چلا نہیں جارہا تھا۔ کوئی پانچ پتھر اس کے گھٹنے پر لگے تھے۔ پیشانی سے بھی خون رِس رہا تھا۔ ایک جگہ کھیت کی مینڈ پار کرتے ہوئے وہ ذرا سا لڑکھڑایا تو مذاق میں اسے نور دین نے دھکا دے دیا جس سے وہ اوندھے منھ گر پڑا۔

"دیکھو رمضان جی، مجھے اب بھی دھکے مار رہے ہیں۔" اس نے اٹھتے ہوئے بلبلا کر کہا، اس بچّے کی طرح جس سے اچھا برتاؤ کرنے کی قسم کھانے کے بعد بھی اسے پیٹا جارہا ہو۔

"دھکا نہیں دو، اوئے۔" رمضان نے کہا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا اور آنکھ ماری۔

"دھکّا نہیں دو، اوئے۔" پیچھے سے کسی نے رمضان کی نقل اتارتے ہوئے کہا اور ایک ہلکا سا دھکّا اقبال سنگھ کو اور مار دیا۔

نفرت اور جلن اتنی جلدی محبت اور خیر سگالی میں نہیں بدلا کرتے، وہ صرف بھونڈے مذاق اور طنز میں ہی بدل سکتے ہیں۔ وہ اقبال سنگھ کو مار نہیں سکتے تھے تو کم از کم اسے تیکھے طنز و مذاق کا نشانہ تو بنا سکتے تھے۔

"دیکھو رمضان بھائی، کسی نے مجھے پیچھے سے ٹھونگا مارا ہے۔"

اقبال سنگھ کی عزت نفس بالکل ختم ہو چکی تھی، وہ اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں زندگی کی جاہیں صرف گڑگڑایا ہی جا سکتا ہے۔ اس سے ہنسنے کے لیے کہا جائے تو وہ ہنس دے گا، رونے کے لیے کہو تو رونے لگے گا۔

نوردین کو مذاق سوجھا۔" ٹھہر اوئے،" ہاتھ پکڑ کر روکتے ہوئے اس نے کہا۔
اقبال سنگھ رک گیا اور سپاٹ آنکھوں سے نوردین کی طرف دیکھنے لگا۔
" اس کی شلوار اتار دو۔ اسے ننگا گاؤں میں لے چلو۔ یہ ہم سب سے بہت چھپاتا تھا۔"
اور اس نے آگے بڑھ کر اقبال سنگھ کی شلوار میں ہاتھ ڈالا۔ کچھ لوگ ہنسنے لگے۔
" دیکھو رمضان جی ...." اقبال سنگھ نے رمضان کی طرف دیکھ کر شکایت کی۔
" خبردار اوئے، کسی نے سلوار اتاری تو...." رمضان نے چلا کر کہا۔
" ابھی اس نے کلمہ نہیں پڑھا ہے۔ جب تک یہ کلمہ نہیں پڑھ لیتا' یہ کافر ہے' مسلمان نہیں ہے۔ اتارو اس کی سلوار۔"
رمضان کو اپنی طرف داری کرتے دیکھ کر اقبال سنگھ کا حوصلہ بڑھ گیا۔ وہ بھی اچک کر بولا:
" نہیں اتارنے دوں گا سلوار۔ کر لو جو میرا کرنا ہے۔"
اس پر کچھ لوگ ہنس دیے۔
اس طرح اقبال سنگھ سے کھیلتے مذاق کرتے' اسے ذلیل کرتے ہوئے وہ گاؤں میں پہنچے۔
امام دین تیلی کے گھر پر تبلیغ کی رسم ادا کی جانے لگی۔ گاؤں کا نائی بھی پہنچ گیا۔ مسجد کا ملا بھی وہاں آگیا۔ تیلی کے گھر کے آنگن میں ساری بھیڑ جمع ہو گئی۔
نائی کی انگلیاں تھک گئیں۔ بال کاٹے نہیں کٹ رہے تھے۔ اتنی بھیڑ میں زمین پر بیٹھا اقبال سنگھ اپنی حالت زار پر گھبرا اٹھا تھا۔ شروع شروع میں نائی قینچی سے بال کاٹتا رہا۔ پھر گھوڑے کے گوبر اور موت سے اس کے بالوں کے گچھے الگ الگ باندھ کر بال کاٹے اور آخر میں وہ گھوڑوں کے بال کاٹنے والی مشین لے آیا تو اقبال سنگھ کی کھوپڑی پر لہریے سے بننے لگے۔ پھر استرے سے اس کی چاند صاف کی گئی۔ اس کے بعد اقبال سنگھ کو گردن سیدھی کرنے کا موقعہ ملا۔ داڑھی صاف نہیں گئی۔ جب داڑھی کا وقت آیا تو بہت سی آوازیں ایک ساتھ سنائی دینے لگیں:" داڑھی کی تراش مسلمانی ہونی چاہیے۔"
" خط نکال کر داڑھی کاٹو' مونچھیں پتلی کر دو۔"
اقبال سنگھ کا پچکا ہوا چہرہ اس کی ڈری ہوئی سپاٹ آنکھوں کے باوجود سچ مچ مسلمان نظر آنے لگا تھا

بھیڑ میں سے اپنا راستہ بناتا ہوا نور دین اندر آیا۔ جب اقبال سنگھ کے بال کاٹے جانے لگے تھے تو وہ بیچ میں سے نکل گیا تھا جس کا کسی کو پتہ نہیں چلا تھا۔ لیکن اب وہ لوٹ آیا تھا اور لوگوں کو دھکیل دھکیل کر اندر گھس رہا تھا۔

"ہٹو اوئے آگے سے، راستہ دو۔"

اندر آ کر وہ اقبال سنگھ کے پاس بیٹھ گیا۔ بائیں ہاتھ سے اقبال سنگھ کا منہ کھولا اور دائیں ہاتھ میں پکڑا گوشت کا بڑا سا ٹکڑا جس میں سے ٹپ ٹپ خون کی بوندیں گر رہی تھیں، اقبال سنگھ کے منہ میں ڈال دیا۔ اقبال سنگھ کی آنکھیں، باہر آ گئیں۔ اس کا سانس رک رہا تھا۔

"کھول منہ، تیری ماں کی۔۔۔۔ کھول منہ۔ اب چوس جا اسے مادر۔۔۔"

اور نور دین لوگوں کی طرف دیکھتا ہوا اپنے لال لال مسوڑھے دکھاتا ہوا کھی کھی کر کے ہنسنے لگا۔

اسی وقت ملّا اور گاؤں کے ایک بزرگ سامنے آ گئے۔ بزرگ نے نور دین کو ڈانٹ کر وہاں سے اٹھا دیا۔ "ہٹو یہاں سے، تم دین قبول کرنے والے اپنے ایک بھائی کو پریشان کر رہے ہو۔"

بزرگ کے اندر آ جانے سے سارا ماحول بدل گیا۔ لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ اقبال سنگھ کو سنبھال کر اٹھایا گیا۔ ایک آدمی چارپائی اٹھا لیا اور اسے اس پر بٹھایا گیا۔ باقی کی رسم بڑی ہوشیاری سے انجام دی جانے لگی۔

تسبیح ہاتھ میں لیے مُلّا نے اقبال سنگھ کو کلمہ پڑھوایا:

"لا الٰہ الا اللہ
محمدؐ رسول اللہ"

تین بار کلمہ دوہرایا گیا۔ آس پاس کھڑے لوگوں نے انگلیوں کو آنکھوں سے لگایا؛ پھر انھیں چوم لیا۔ پھر ایک ایک کر کے بیسیوں آدمی اس سے گلے ملے۔

اس کے بعد جلوس کی شکل میں اسے کنویں پر لے جایا گیا۔ غسل کے بعد نئے کپڑے پہننے کو دیے گئے۔

جب نہا دھونے کے بعد نئے کپڑے پہن کر اقبال سنگھ سامنے آیا تو وہ سچ مچ اقبال احمد

نظر آنے لگا تھا۔ لوگوں نے پھر نعرے لگائے:

"نعرۂ تکبیر! اللہ اکبر!"

جلوس پھر امام دین تیلی کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ ماحول میں گہری سنجیدگی اور مذہبی جذبات اجاگر تھے۔ دن ڈھلتے ڈھلتے اقبال کی سنّت ہوئی۔ اب درد کو برداشت کرنا اس کے لیے مشکل نہیں رہ گیا تھا۔ بزرگ سارے وقت اسے سہارا دیے رہے۔ سنّت کے وقت وہ بار بار اس کے کان میں کہہ رہے تھے: "تیرا نکاح کرائیں گے۔ بڑی خوبصورت عورت تمھیں دیں گے۔ کالو تیلی کی بیوہ تیری عمر کی ہے۔ جوان، گداز۔ اسے دیکھ کر تیری روح خوش ہو جائے گی۔ اب تو ہمارا اپنا ہے۔ شیخ ہے، شیخ اقبال احمد!"

شام ہوتے ہوتے اقبال سنگھ کے بدن پر سے سکھوں کی سب علامتیں دور کر دی گئی تھیں اور مسلمان کی سب نشانیاں اتر آئی تھیں۔ پرانے نشان ہٹا کر نئی نشانیاں بنانے کی دیر تھی کہ انسان بدل گیا تھا۔ اب وہ دشمن نہیں تھا، دوست تھا۔ کافر نہیں تھا، مسلمان تھا۔ سب مسلمانوں کے دروازے اس کے لیے کھل گئے تھے۔

چارپائی پر پڑا اقبال احمد رات بھر تڑپتا رہا۔

18

ترک آئے تھے مگر وہ اپنے ہی پڑوس والے گاؤں سے آئے تھے۔ ترکوں کے ذہن میں بھی یہی تھا کہ وہ اپنے پرانے دشمن سکھوں پر حملہ بول رہے ہیں اور سکھوں کے ذہن میں بھی وہ دو سو سال پہلے کے ترک تھے جن کے ساتھ خالصہ لوہا لیا کرتا تھا۔ یہ لڑائی تاریخی لڑائیوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہی تھی۔ لڑنے والوں کے پاؤں بیسویں صدی میں تھے اور سر وسطِ صدی میں۔

گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ دو دن اور دو رات تک چلتی رہی۔ پھر اسلحہ ختم ہو گیا اور لڑنا ناممکن ہو گیا۔ اب گرو گرنتھ صاحب کی چوکی کے پیچھے، سفید چادروں سے ڈھکی سات لاشیں پڑی تھیں۔ پانچ لاشوں کے سر اپنی اپنی گود میں رکھے پانچ عورتیں بیٹھی تھیں۔ بہت ضد کرنے پر وہ کچھ دیر کے لیے اٹھ جاتیں۔ لیکن تیجا سنگھ کے پیٹھ موڑنے کی دیر ہوتی تھی کہ وہ پھر آ بیٹھتی تھیں۔ دو لاشوں کا ولی وارث کوئی نہیں تھا۔ ان میں سے ایک لاش نہنگ سکھ کی تھی جو اس وقت بھی، جب گولیوں کی بوچھاڑ پڑنے لگی تھی، مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا، چھاتی تانے چھت پر کھڑا رہا تھا۔ دوسری لاش سوہن سنگھ کی تھی جو شہر سے فساد روکنے کے لیے آیا تھا۔ یہ آدمی گلی کے سرے پر مارا گیا تھا۔ جہاں وہ لڑائی کے دوسرے دن فساد روکنے کے لیے ایک تجویز پیش کرنے شیخ غلام رسول سے ملنے جا رہا تھا۔ اس کی لاش وہیں پڑی رہتی مگر کچھ مسلمان، کافی رات گئے، گردوارے کے قریب پھینک گئے تھے۔ سکھوں کو یہ بتانے کے لیے کہ یہ ہے جواب اس تجویز کا جو تم نے سوہن سنگھ کے ہاتھ بھیجی تھی۔ اس کی لاش ایک طرف پڑی تھی، اسے کسی نے گود میں نہیں لے رکھا تھا۔ یوں بھی سوہن سنگھ کے مرنے کے کچھ دیر پہلے ہی سے سوہن سنگھ کی اور میر داد کی پوزیشن امن قائم کرانے والوں کی بجائے

محض ہرکاروں کی رہ گئی تھی۔

ان کے علاوہ بہت سی لاشیں قصبے کے اندر جگہ جگہ بکھری پڑی تھیں انھیں ٹھکانے لگانے کا ابھی سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ خالصہ اسکول کے چپراسی کی لاش اسکول کے آنگن میں پڑی تھی۔ بلوے کے دن سبھی لوگ جب گوردوارے میں جمع ہونے لگے تھے، چپراسی کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اسکول میں ہی ڈٹا رہے۔ چپراسی کی بیوی زندہ تھی لیکن اسے نمبردار نے گھر میں رکھ لیا تھا اس لیے وہ زندہ سلامت تھی۔ مائی بھاگاں کی لاش اس کے گھر کے اندر ہی آنگن میں پڑی تھی۔ مائی بھاگاں نے مرکر بھی اپنے زیور بچا لیے تھے کیوں کہ وہ دیوار میں دفن تھے اور حملہ آوروں کو ان کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں تھا۔ مائی بھاگاں کا گھر آگ کی نذر ہونے سے بھی بچ گیا تھا کیوں کہ برابر کا گھر رحیم تیلی کا تھا۔ مائی بھاگاں ایک جھاپڑ میں جان سے گزر گئی تھی۔ بوڑھا سوداگر سنگھ بھی مرا پڑا تھا، اسے بھی لوگ گوردوارے میں پہنچانا بھول گئے تھے۔

کچھ لاشیں قصبے سے باہر بھی جگہ جگہ پڑی تھیں۔ ایک لاش کنوئیں کے پاس اوندھی پڑی تھی۔ یہ آدمی مغالطے میں مارا گیا تھا۔ یہ قصبے کا بہشتی اللہ رکھا تھا جو فساد کے باوجود اپنی مشک لے کر چاندنی رات میں کنوئیں پر چلا آیا تھا۔ شیخ کے گھر میں پانی کی کمی ہو گئی تھی اور بچے پانی مانگ رہے تھے۔ اسی لیے بھشتی مشک اٹھا کر پانی لینے آ گیا تھا اور شیخ کے گھر کی چھت پر سے ہی سیدھا نشانہ اس کی پیٹھ پر لگا تھا۔ ایک لاش کسی سردار کی تھی جو شہر سے آنے والی سڑک پر پڑی تھی۔ فتح دین نان بائی، جس کی دکان گوردوارے کو جانے والی گلی کے بائیں سرے پر پڑتی تھی، خود تو بچ گیا تھا لیکن اس کی دکان پر کام کرنے والے دونوں چھوٹے چھوٹے لڑکے مارے گئے تھے۔ فساد کے باوجود یہ بچے بھاگ بھاگ کر دکان میں سے باہر آ جاتے تھے۔ کبھی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگتے، کبھی گلی میں کھیلنے لگتے تھے۔ اس کے علاوہ خالصہ اسکول میں سے آگ کے شعلے بھی نکل رہے تھے۔ بائیں گلی کے سرے پر ندی کے عین اوپر والے حصے میں سکھوں کے سب ہی مکان آگ کی نذر کر دیے گئے تھے۔ دوسری طرف قصائیوں کی تینوں دکانیں اور تیلی محلّے کے تین چار مسلمانوں کے گھر ابھی تک جل رہے تھے۔

اب گوردوارے میں اسلحہ تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ چھت پر بیٹھا کشن سنگھ ہرمنٹ

دو منٹ بعد گولی چلا دیتا تھا تاکہ دشمن کو معلوم رہے کہ مورچہ قائم ہے ورنہ اندر تو حالت پتلی ہو چکی تھی ہمارے گوردوارے میں ایک طرح کی تھکن چھانے لگی تھی۔ آنکھیں ایک دوسرے کو دیکھتیں، لیکن منھ سے بول نہیں نکلتے تھے۔" بارود ختم ہو رہا ہے۔" نہ جانے کس کے منھ سے نکلا تھا۔ جس کے بھی کانوں میں یہ جملہ پڑا، وہی دھک سے رہ گیا۔ اسلحہ، دوسری طرف، شیخوں کے قلعے میں بھی ختم ہو گیا تھا اس کو چھپانے کے لیے وہ بار بار نعرے لگائے جا رہے تھے۔" اللہ اکبر!" کے نعروں کی آواز اب ایک سمت کی بجائے تین اطراف سے آنے لگی تھی۔ ان نعروں کا جواب گوردوارے سے بھی دیا جاتا، پہلے سے بھی زیادہ اونچی آواز میں لیکن ان نعروں کا کھوکھلاپن کسی سے چھپا نہیں تھا۔

مخبروں نے خبر دی تھی کہ مسلمانوں کو باہر سے کمک پہنچنے والی ہے جبکہ سکھوں کا تعلق باہر سے کٹ گیا تھا۔ دو آدمی چھپ چھپا کر کہوٹا کی طرف کمک کے لیے بھیجے گئے تھے جو ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ مجلس جنگ کا خیال تھا کہ کچھ رقم دے دلا کر صلح کر لی جائے اور انھوں نے اپنے ایلچی کے ذریعے شیخوں سے بات چیت شروع کر دی تھی۔

گوردوارے کے اندر دروازے کے پاس مجلس جنگ کے پانچوں ممبر تیجا سنگھ کے ساتھ سمجھوتے کی شرطوں پر غور کر رہے تھے۔

" دو لاکھ مانگتے ہیں۔ دو لاکھ ہم کہاں سے دیں؟" تیجا سنگھ نے تردد سے کہا۔

" آپ نے چھوٹے گرنتھی کو کیا کہلا بھیجا تھا؟" ایک ممبر نے پوچھا۔

سمجھوتے کی بات چیت کے لیے تیجا سنگھ نے سوہن سنگھ کے مر جانے کے بعد میر داد کو ایلچی بنانے کی کوشش کی تھی کیوں کہ فساد سے پہلے وہ صلح کرانے کی کوشش کرتا رہا تھا لیکن جب اسے پتہ چلا کہ روپیہ دے لے کر گولی چلنی بند ہو گی تو اس نے منھ پھیر لیا۔ مجبور ہو کر تیجا سنگھ نے گرنتھی کے چھوٹے بھائی جسے سب ہی " چھوٹا گرنتھی" کہہ کر پکارتے تھے، کو پیغام دے کر بھیجا تھا۔

" میں نے کہا تھا بیس تیس ہزار کہنا۔" تیجا سنگھ نے کہا۔" مگر وہ دو لاکھ مانگتے ہیں۔"

" انھیں پتہ چل گیا ہو گا کہ ہماری حالت کمزور پڑ گئی ہے۔"

" ان کے باپ کو بھی پتہ نہیں چل سکتا۔" پنساری ہیرا سنگھ نے طیش میں آ کر کہا۔

"ہم نے ان کے کم آدمی نہیں کاٹے ہیں۔ انیس بیس کا ہی فرق ہوگا، سنگھ جی! یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اسلحہ ختم ہوگیا۔۔۔"

دور سے پھر آواز آئی: "اللہ اکبر!"

"زیور گہنے کتنے اکٹھے ہوئے ہیں؟" ایک اور ممبر نے پوچھا۔

تیجا سنگھ اٹھ کر گرو گرنتھ صاحب کی چوکی کے سامنے رکھے ایک بکسے کے پاس گئے۔ اسے کھول کر انھوں نے گہنوں کو ــــــ جو عورتیں اپنے بدن پر سے اتار اتار کر ڈال گئی تھیں ــــ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور ان کا اندازہ لگاتے ہوئے ان کی قیمت کا اندازہ لگانے لگے۔

"بیس پچیس ہزار سے زیادہ کا نہیں ہوگا۔۔۔ وہ دو لاکھ مانگتے ہیں۔ ہم دو لاکھ کہاں سے دیں گے؟"

"دینا چاہیں تو دو لاکھ آپ اکیلے دے سکتے ہیں، تیجا سنگھ جی۔ آپ نے بڑی مایا اکٹھی کی ہے۔"

لیکن تیجا سنگھ نے اس جملے پر توجہ ہی نہیں کی تھی۔

"کہو، پچاس ہزار دیں گے۔"

"پچاس ہزار بہت کم ہیں۔ وہ نہیں مانیں گے۔"

"تم کہہ کے تو دیکھو۔ نیچے سے شروع کریں گے تو کہیں ایک لاکھ پر فیصلہ ہوگا۔"

تیجا سنگھ نے چھوٹے گرنتھی کو بلا بھیجا۔ "جاؤ گرنتھی جی، ان کے ساتھ ایک لاکھ تک فیصلہ کر لو۔ مگر شرط یہ ہے کہ باہر سے آنے والے لوگ ندی کے پار چلے جائیں، پھر وہ اپنے تین نمائندے بھیج دیں۔ ہمارے آدمی تھیلیاں لیے کھڑے ہوں گے۔"

چھوٹے گرنتھی نے ہاتھ باندھ کر کہا: "ست بچن، مہاراج! لیکن اگر انھوں نے کہا کہ تھیلیاں پہلے دو، ہم ندی بعد میں پار کریں گے تو میں کیا کہوں؟"

اس پر پنساری پھر طیش میں آگیا۔ "کیوں، کیا ہماری زبان پر اعتبار نہیں ہے؟ کیا ہم لاہوریے ہیں؟ امرتسریے ہیں کہ آج کچھ کہیں اور کل کچھ؟ ہم سید پور کے رہنے والے ہیں۔ ہماری زبان پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔"

سید پور کے شہری ہونے کا سکھوں کو بھی اسی قدر غرور تھا جتنا مسلمانوں کو سب

ہی کو جہاں سید پور کی لال مٹی پر، بڑھیا گیہوں پر، لوکاٹ کے باغوں پر، یہاں تک کہ سید پور کے شدید موسم سرما اور برفیلی ہواؤں تک پر ناز تھا، اسی طرح اپنی مہمان نوازی پر، دریادلی پر اور ہنس مکھ برتاؤ پر بھی ناز تھا، فساد شروع ہونے پر دونوں طرف کے لوگ سید پور کے باسی ہونے کے ناطے سینہ ٹھوک کر میدان میں اترے تھے۔

چاند پھر نکل آیا تھا جس سے مورچے والوں کو رات کا منظر بھیانک لگنے لگا تھا۔ آج رات پھر گولا باری ہوئی تو کچھ بھی ہو سکتا ہے، آتش زنی ہو سکتی ہے، لوٹ مار ہو سکتی ہے۔ اب سب ہی فیصلے غلط لگنے لگے تھے۔ گردوارے میں جمع ہونا بھول تھی، شیخ غلام رسول اور اس کے ساتھیوں سے بات چیت توڑ دینا بھول تھی۔ ان بھولوں کا کوئی اختتام نہیں تھا۔ اگر دشمن پر غالب آجائیں تو یہی بھولیں میدان جنگ کی سیاست کی چالیں مانی جاتیں۔

شیخ غلام رسول کے گھر کے باہر چبوترے پر کچھ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ابھی لاشیں ٹھکانے لگانے کا انھیں بھی موقعہ نہیں ملا تھا۔ جہاں گوردوارے کی پوزیشن ایک گھری ہوئی جگہ کی تھی وہیں شیخوں کا مکان کھلی جگہ پر تھا۔ اس کا متعلق آس پاس کے سب ہی گاؤوں سے تھا۔

چبوترے پر بیٹھے مجاہد باہر سے آئے تھے۔ سب ہی اپنے اپنے کارناموں کے قصے سنا رہے تھے، اپنے اپنے تجربے گنا رہے تھے:

"ہم جب گلی میں گھسے تو شکار بھاگنے لگے۔ کوئی ادھر جائے کوئی اُدھر جائے۔ ہندوؤں کی ایک لڑکی اپنے گھر کی چھت پر چڑھ گئی۔ ہم نے دیکھ لیا جی۔ بس دس بارہ آدمی اس کے پیچھے چھت پر پہنچ گئے۔ وہ چھت کی منڈیر پھلانگ کر دوسری چھت پر جا رہی تھی کہ ہم نے اسے پکڑ لیا۔ نبی، لالو، میرا، مرتضیٰ، باری باری سے سبھی نے اسے دبوچا۔

"ایمان سے!" ایک نے مزے میں پوچھا۔

"قسم اللہ پاک کی۔ جب میری باری آئی تو نیچے سے نہ ہوں نہ ہاں۔ وہ ہلے ہی نہیں۔ میں دیکھا تو لڑکی مری ہوئی۔" پھر وہ کھوکھلی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا: "میں لاش سے ہی زنا کیے جا رہا تھا۔"

"ایمان سے؟" اس کے ساتھی نے ہنکارا سا بھرتے ہوئے کہا۔

"قسم قرآن شریف کی، میں ٹھیک کہتا ہوں۔ پوچھ لو جلال سے۔ یہ بھی وہیں پر

تھا۔ تبھی ہم نے دیکھا کہ عورت مردہ ہے۔" اور اس نے منہ ٹیڑھا کر کے تھوک دیا۔
ایک اور مجاہد سنانے لگا: "وقت وقت کی بات ہے۔ ایک باگڑی عورت کو ہم نے گلی میں پکڑا۔ ہم کراڑوں کے گھر کے اندر سے نکل رہے تھے۔ ایسا ہاتھ چل رہا تھا کہ جو سامنے آتا' ایک ہاتھ میں اس کی گردن صاف ہو جاتی۔ یہ عورت سامنے آئی تو چلانے لگی۔ حرام زادی کہے جا رہی تھی' مجھے مارو نہیں۔ مجھے تم ساتوں اپنے پاس رکھ لو۔ ایک ایک کر کے جو چاہو کر لو۔ مجھے مارو نہیں۔"
"پھر؟"
"پھر کیا؟ عزیز نے سیدھا خنجر اس کی چھاتی میں اتار دیا۔ وہیں ختم ہو گئی۔"
ڈھلان پر چھٹکی چاندنی میں چھوٹا گرنتھی دھیرے دھیرے ڈھلان اتر رہا تھا۔ ندی کے کنارے مسلمانوں کے نمائندے بات چیت کے لیے کھڑے تھے۔ گردوارے کی ایک کھڑکی سے ڈھلان نظر آتی تھی' اسی لیے بہت سے لوگ دم سادھے چھوٹے گرنتھی کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ چاندنی رات میں بس ایک سایہ سا نیچے اترتا نظر آ رہا تھا۔ تبھی چھت پر بھاگتے قدموں کی آواز آئی اور ایک نہنگ سکھ نے وہیں سے آواز دی: "پچھم سے بلوائی آ رہے ہیں۔ دشمنوں کو کمک مل گئی ہے۔"
اور دیکھتے دیکھتے دور سے سچ مچ فسادیوں کی جانی پہچانی آوازیں کانوں میں پڑیں۔ ڈھول بجنے کی آواز اور 'اللہ اکبر!' کے نعرے کی آواز۔
تیجا سنگھ کا منہ اتر گیا۔ بڑا گرنتھی جو کھڑکی سے جڑا اپنے چھوٹے بھائی کو ڈھلان سے اترتا دیکھ رہا تھا' چلا اٹھا: "مت جاؤ موہر سنگھ، لوٹ آؤ!"
لیکن چھوٹے گرنتھی نے نہیں سنا۔ وہ برابر ندی کنارے گول گول پتھروں پر ٹیڑھا میڑھا چلتا ہوا نیچے اترتا چلا جا رہا تھا۔
"لوٹ آؤ موہر سنگھ' آ جاؤ!"
بڑے گرنتھی نے کہا اور پھر دوسری کئی آوازیں اٹھیں۔ چھوٹے گرنتھی نے ایک بار رک کر پیچھے کی طرف دیکھا اور پھر آگے بڑھنے لگا۔
ڈھول پیٹتے اور بڑھتے آ رہے بلوائیوں کی آوازیں اور زیادہ نزدیک آتی جا رہی تھیں۔ جواب میں اب ندی کنارے کھڑے مجاہد بھی "اللہ اکبر" کے نعرے لگانے لگے تھے۔ چھوٹے گرنتھی

چاندنی رات کی سفید اور کالے سایوں کی روشنی میں کھوتا چلا جا رہا تھا۔

کھڑکی میں سے اب بہت صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن انھیں لگا کہ کچھ لوگ چھوٹے گرنتھی سے ملنے کے لیے آگے بڑھ آئے ہیں، پھر انھیں یہ بھی لگا کہ لوگوں نے چھوٹے گرنتھی کو گھیر لیا ہے، پھر یہ بھی کہ کچھ لاٹھیاں اٹھی ہیں، چاندنی میں کوئی چیز چمکتی بھی لگی تھی، جو یا تو کسی کی کلہاڑی تھی یا چھوٹے گرنتھی کی تلوار تھی۔ اور فوراً ہی 'اللہ اکبر' کا نعرہ بھی بلند ہوا تھا۔

تیجا سنگھ کو کاٹو تو لہو نہیں۔ بڑا گرنتھی بدحواس ہو کر چلایا: "مارا گیا، میرا بھائی مارا گیا!" اور بغیر سوچے سمجھے ننگے پاؤں، نہتا گردوارے سے نکل کر، گلی پار کر کے ڈھلان اترنے لگا۔

"روکو، روکو اسے"، کسی نے چلّا کر کہا، جس پر دروازے پر تعینات نہنگ سکھ، گرنتھی کے پیچھے لپکا اور ڈھلان کے بیچ میں پہنچ کر اسے کمر سے پکڑ لیا اور اسے ہاتھوں میں اٹھا کر واپس لانے لگا۔

ڈھول مجیرے کی آوازیں گاؤں میں پہنچ چکی تھیں۔ چاروں طرف سے نعرے گونجنے لگے تھے، پھر سے گولیاں داغی جانے لگی تھیں۔ لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔

"جو بولے سو نہال!

ست سری اکال!"

ہوا کو چیرتا ہوا نعرہ اٹھا۔

تلواریں ہوا میں اٹھیں اور دوسرے لمحے جھومتی تلواروں کو تھامے تھامے سکھوں کا ایک جتھا جس کے بیچ دوسرے لوگوں کے ساتھ بڑا گرنتھی بھی تھا، نعرے لگاتا، دشمن کو للکارتا ڈھلان اترنے لگا۔ کیس کھلے ہوئے، پتھروں پر ان کے پیر الٹے سیدھے پڑ رہے تھے۔ انھوں نے جیسے مرنے مارنے کی ٹھان لی تھی۔

گردوارے کے اندر بائیں ہاتھ کی دیوار کے ساتھ عورتوں اور بچّوں کا جمگھٹ تھا۔ بڑھتے تناؤ میں سبھی عورتیں جیسے خود ہی سمٹ کر ایک جگہ پر آ گئی تھیں۔ جسبیر کور کا چہرہ مدہوش سا ہوا جا رہا تھا۔ کمر سے لٹکتی کرپان کی موٹھ کو اس نے کس کر پکڑا ہوا تھا۔

عورتیں اپنے آپ ہی گائتری کا پاٹھ کرنے لگی تھیں۔ گردوارے میں ان کی گنگناتی

آواز اونچی اٹھنے لگی۔

تبھی بائیں طرف گلی کے کنارے کے مکانوں سے آگ شعلے بلند ہونے لگے اور ماحول میں پہلے سے بھی زیادہ تناؤ آگیا۔

"آگ لگی ہے۔ اسکول کے پاس کی گلی میں آگ لگی ہے۔ کشن سنگھ کے گھر کو آگ لگی ہے"۔ جسبیر نے سنا مگر جیسے نہیں سنا ہو۔ اس کے جسم میں بار بار ایک لہر سی اٹھ رہی تھی اور آنکھوں کے سامنے کچھ بھی صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا، جیسے سب چیزیں تیر رہی ہوں، ادھ کھلی روشنی میں اس کے ارد گرد گھوم رہی ہوں۔ وہ عورتوں کے درمیان روشنی کے نیچے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے سے اب بھی جلال ٹپک رہا تھا۔

گلی کے بائیں سرے کا مورچہ بھر بھرا کر گر گیا۔ چاندنی میں نہائی ڈھلان پر کچھ آدمی رینگ رینگ کر چڑھتے نظر آئے۔ چھت پر کھڑے ہنگ سکھ نے انھیں سب سے پہلے دیکھا۔ اس نے کشن سنگھ کو بتایا لیکن کشن سنگھ نے بس مایوسی میں سر ہلا دیا۔ ڈھلان چڑھنے والوں کے کالے، رینگتے سایوں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی تھی اور اب آگ کی روشنی میں وہ صاف نظر آنے لگے تھے۔ مگر اسلحہ کہاں تھا جو ان پر گولی چلائی جاتی؟ کشن سنگھ نے ایک دوبار فایر کیے اور پھر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

گردوارے کے باہر کھڑا سکھوں کا ایک اور جتھا بال کھولے، ننگی تلواریں ہاتھ میں لیے بائیں سمت گلی میں آگے بڑھنے لگا کیوں کہ گلی کا سرے والا مورچہ ٹوٹنے پر ترک اسی راستے گردوارے پر حملہ کرنے والے تھے۔ تبھی چیخ و پکار کی آوازیں آئیں۔ دو چار گولیاں بھی چلیں اور پھر آسمان کو چیرتی ہوئی آواز آئی: "اللہ اکبر!"

اور تلواریں چلاتے سردار گلی کے اندھیرے میں کھو گئے۔

اسی وقت گردوارے میں سے اجلے کپڑوں میں ملبوس عورتوں کا ایک غول سا نکلا۔ آگے آگے جسبیر کور تھی، نیم وا آنکھیں، تمتماتا چہرہ۔ تقریباً سب ہی عورتوں نے اپنے دوپٹے سر سے اتار کر گلے میں ڈال لیے تھے۔ سب ہی کے پیر ننگے تھے۔ سب ہی چہرے تمتما رہے تھے۔ منتر کی طرح وہ گردوارے میں سے نکلتی آ رہی تھیں۔

"ترک آگئے۔ ترک آگئے": کچھ عورتیں چلا رہی تھیں۔ کوئی گوروبانی کا پاٹھ کر رہی تھی، کوئی بے خود سی ہو کر چلا رہی تھی: "جہاں میرا شیر گیا ہے، وہاں میں بھی جاؤں گی۔"

کچھ کے ساتھ ان کے بچے تھے۔ دو ایک نے بچّوں کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ کوئی اپنے بچّوں کو کلائیوں سے پکڑے انھیں گھسیٹتی لیے جا رہی تھی۔

گردوارے میں سے نکل کر عورتوں کا یہ غول گلی میں دائیں اور بائیں اطراف میں مڑ گیا۔ پھر کچھ دور جا کر دو گھروں کے بیچ چھوٹی سی پگڈنڈی ڈھلان پر نیچے اترتی تھی اور بل کھاتی سیدھی کنوئیں تک چلی گئی تھی۔ اسی سمت یہ عورتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔

چاروں طرف ہاہا کار مچی تھی۔ لپ لپاتی آگ کی لپٹیں اب دو جگہوں سے اٹھنے لگی تھیں، ڈھلان پر، مکانوں کی دیواروں پر، گلی کے اینٹوں کے فرش پر آگ کے سائے ناچ رہے تھے۔ ندی کے پانی میں لال لپٹوں کا سایہ جھلملا رہا تھا۔ پانی اپنے آپ ہی لال ہونے لگا تھا۔ اس سنّاٹے میں گھروں کے دروازے توڑنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ قصبے میں لوٹ مار شروع ہو گئی تھی۔ گردوارے کے سامنے گلی کے بیچ و بیچ تہنگ سکھ برچھا اونچا کیے چلا جا رہا تھا:

"آؤ ترکوں، آؤ، کس میں سکت ہے، آؤ! میں للکارتا ہوں، آؤ!"

عورتوں کا گروہ اس پکے کنوئیں کی طرف بڑھتا جا رہا تھا جو ڈھلان کے نیچے دائیں ہاتھ بنا تھا، اور جہاں گاؤں کی عورتیں نہانے، کپڑے دھونے، گپ شپ لڑانے کے لیے جایا کرتی تھیں۔ کسی منتر سے بندھی ڈور کی طرح وہ اسی طرف بڑھتی جا رہی تھیں۔ کسی کو اس وقت دھیان نہیں آیا کہ وہ جا کہاں رہی ہیں، کیوں جا رہی ہیں۔ چھٹکی چاندنی میں جیسے کنوئیں پر اپسرائیں اترتی آ رہی تھیں۔

سب سے پہلے جسبیر کنوئیں میں کود گئی۔ اس نے کوئی نعرہ نہیں لگایا، کسی کو پکارا نہیں، صرف 'واہگرو' کہا اور کنوئیں میں کود گئی۔ اس کے کودتے ہی کنوئیں کی جگت پر کتنی ہی عورتیں چڑھ گئیں۔ ہری سنگھ کی بیوی پہلے جگت کے اوپر جا کر کھڑی ہوئی، پھر اس نے اپنے چار سال کے بیٹے کو کھینچ کر اوپر چڑھا لیا اور پھر اسے اپنے ساتھ لے کر نیچے کود گئی۔ دیوی سنگھ کی گھر والی اپنے دودھ پیتے بچّے کو چھاتی سے لگائے کود گئی۔ پریم سنگھ کی بیوی خود تو کود گئی مگر اس کا بچّہ کھڑا رہ گیا، جسے گیان سنگھ کی بیٹی نے دھکیل کر ماں کے پاس پہنچا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کی دسیوں عورتیں اپنے بچّوں کو لے کر کنوئیں میں کود گئی تھیں۔

جب ترک بیچ بیچ گلی کے بائیں سرے سے لاشوں کو روندتے ہوئے گردوارے کی طرف

بڑھنے لگے تو گردوارے میں ایک بھی عورت نہیں تھی۔ کنوئیں کے اندر سے چیخنے چلانے کی آوازیں، بچوں کا شوروغل سنائی دیتا رہا۔ گاؤں کے پاس جگہ جگہ سے 'اللہ اکبر' اور ست سری اکال' کے نعروں کے ساتھ کنوئیں میں ڈوبتی عورتوں اور بچوں کی چیخیں مل گئی تھیں۔

چاندنی پیلی پڑ گئی۔ دھیرے دھیرے پو پھٹنے لگی۔ رات کا بھوتیا ماحول ٹوٹنے لگا۔ صاف ٹھنڈی ہوا روز کی طرح بہنے لگی۔ گاؤں کے باہر پکے گیہوں کے کھیت ہوا میں جھومنے لگے۔ ہوا میں لوکاٹوں کی مہک تھی۔ ندی کی طرف سے ہوا کا جھونکا آیا۔ لوکاٹوں کی خوشبو سے بھرا ہوا۔ اس میں ان سفید پھولوں کی بھی بھینی بھینی مہک ملی ہوئی تھی جو اس موسم میں خودرو جھاڑیوں میں اگتے تھے۔ کبھی کبھی لوکاٹ کے باغوں میں توتوں کا جھنڈ پر پھڑپھڑاتا، چیں چیں کرتا اڑ جاتا۔ ندی کا پانی نیلا نیلا ہو رہا تھا۔ ہوا کا جھونکا آتا تو پانی میں لہر سی آتی۔

نہ جانے رات کے کس وقت لوٹ مار بند ہو گئی تھی۔ زیادہ گھروں کو آگ بھی نہیں لگائی گئی تھی کیوں کہ گردوارے والی گلی کو چھوڑ کر گاؤں کی ہر گلی میں مسلمانوں اور سکھوں کے گھر پاس پاس تھے۔ اسکول الگ الگ تھا یا ٹکڑوالے کچھ گھر الگ تھے۔ صبح ہونے تک آگ کی لپٹیں مدھم پڑ گئی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے گھر تھے، جل کر راکھ ہوتے انھیں دیر نہیں لگی۔ سلگتے گھروں میں سے اب پیلا پیلا دھواں زیادہ نکلنے لگا تھا۔

گردوارے کے اندر ایک بتی اب بھی جل رہی تھی۔ ایک طرف مجلس جنگ کے چار دن ممبر آخری گھڑی کا جیسے انتظار کر رہے تھے۔ تیجا سنگھ جی تھکے ماندے گردوارے کی رسد والی کوٹھری میں گیہوں کی ایک بوری پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ کشن سنگھ چھت پر ابھی تک اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ایک نہنگ سکھ برچھا لیے اب بھی دروازے کی آڑ میں کھڑا تھا۔

جب روشنی پھیلنے لگی تو ڈھیروں چیلیں اور کوے آسمان میں اڑنے لگے۔ ان گنت گدھ بھی منڈلاتے ہوئے آ گئے۔ اسکول کے باہر کھڑے خزاں رسیدہ پیڑ پر دس پندرہ گدھ آ کر بیٹھ گئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے سر، بڑی بڑی پیلی چونچیں۔ کچھ گدھ کنوئیں کی جگت پر بھی بیٹھے تھے، جہاں لاشیں پھولنے لگی تھیں اور پھول پھول کر کنوئیں کے منھ تک پہنچنے لگی تھیں۔ گھروں کی منڈیروں پر بھی جگہ جگہ گدھ آ کر بیٹھ گئے تھے۔ گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ بکھری لاشیں گاؤں کے سناٹے کو اور بھی گہرا بنا رہی تھیں۔ اب گاؤں کی گلیوں میں کوئی دھیرے سے بھی چلتا تو اس کے پیروں کی چاپ گونجتی تھی۔ بلوائی لوٹ مار کا سامان لے کر دوڑ گئے تھے۔

گردوارے سے کنوئیں کی طرف جانے والے راستے پر جگہ جگہ عورتوں کی چادریں، دوپٹے، چوڑیاں گری پڑی تھیں۔ گردوارے کے قریب خاص طور سے ہاتھوں میں سے ٹوٹ کر گری چوڑیوں کے ٹکڑے جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔ گلیوں میں ٹوٹے پھوٹے خالی صندوق، کنستر، چارپائیاں اپنی لوٹ کی کہانی سنا رہی تھیں۔ مکانوں کے کواڑ کہیں ادھ کھلے تھے تو کہیں ٹوٹے پڑے تھے۔ جگہ جگہ اس آندھی کے نشان تھے جو رات بھر چلتی رہی تھی۔

مگر لڑائی ابھی بند نہیں ہوئی تھی۔ موٹے قصائی کا بڑا لڑکا چھپتا چھپاتا گردوارے کے پچھواڑے پہنچ گیا تھا اور گردوارے کی پچھلی کھڑکیوں پر تیل چھڑک کر آگ لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔

اچانک فضا میں ایک عجیب سا لفظ سنائی دینے لگا۔ گہرا، دھیما، گھرگھراتا سا لفظ۔ وہ آواز کیا تھی؟ یہ آواز کوٹھری میں بیٹھے تیجا سنگھ نے بھی سنی۔ گردوارے کی چھت پر تعینات کشن سنگھ نے بھی سنی۔ شیخوں کی حویلی میں سب ہی کے کانوں میں یہ آواز پڑی۔ سب ہی ٹھٹھک گئے۔ موٹے قصائی کا بیٹا بھی ٹھٹھک گیا جو گردوارے کو آگ لگانے جا رہا تھا۔ یہ کیسی آواز تھی؟ گھرگھراتی گہری سی آواز جو برابر بلند ہوتی جا رہی تھی۔ دروازوں، دیواروں کی آڑ میں کھڑے یا بیٹھے اکے دکے لوگ باہر جھانکنے لگے۔ کشن سنگھ کرسی پر سے اٹھ گیا اور بھاگ کر منڈیر کے پاس جا کھڑا ہوا۔

ہوائی جہاز تھا۔ بڑا سا، بڑے بڑے کالے پنکھوں والا ہوائی جہاز۔ گھاٹیوں، پہاڑیوں پر پنکھ پھیلائے، گھرگھراتا گاؤں کی طرف آ رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کے پنکھ گہرے سیاہ پڑ جاتے اور کبھی وہ چاندی کی طرح جھلملانے لگتے۔ کبھی اس کا دایاں پنکھ نیچے کی سمت جھک جاتا تو کبھی بایاں۔ ہوائی جہاز جیسے ہوا میں اٹھکھیلیاں کرتا چلا آ رہا تھا۔

جب وہ نزدیک پہنچا تو لوگ اٹھ اٹھ کر باہر آنے لگے۔ گلیوں، چھتوں، چبوتروں پر آ کر لوگ کھڑے ہو گئے اور بڑی دلچسپی سے ہوائی جہاز کی طرف دیکھنے لگے۔ گاؤں پر اڑتے وقت جہاز اور بھی نیچے آ گیا تھا اور جہاز کے اندر بیٹھا گورا فوجی اپنا ہاتھ ہلا ہلا کر خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی عینکوں کے نیچے کچھ لوگوں کو اس کی مسکراہٹ تک نظر آ گئی تھی۔

"مسکرایا ہے، میں نے خود دیکھا ہے۔" باہر کھڑا ایک لڑکا دوسرے سے بولا: "اس نے

ہاتھ میں سفید رنگ کا دستانہ پہن رکھا ہے۔ یوں ہاتھ ہلا رہا تھا، تو نے نہیں دیکھا؟"

"سبھی ہاتھ تھم گئے"، اور اب کچھ نہیں ہوگا۔ انگریز تک فساد کی خبر پہنچ گئی ہے۔ اب کوئی آگ نہیں لگائے گا، بندوق نہیں چلائے گا۔ موٹے قصائی کے بیٹے نے، جس نے گردوالے کی کھڑکیوں پر تیل چھڑک دیا تھا اور بس دیا سلائی لگانے ہی کی دیر تھی، اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔ لوگ منھ اٹھائے، ہوائی جہاز کی طرف دیکھتے ہی جا رہے تھے۔

کاک پٹ میں بیٹھے گورے سپاہی نے اڑتے ہوئے اوپر سے ہاتھ ہلایا۔ نیچے چھت پر کھڑے کشن سنگھ کو لگا جیسے گورے ہوا باز نے بس اسی کو ہاتھ ہلایا ہے گویا اس نے اپنے ساتھی سپاہی کا خیر مقدم کیا ہے۔ کشن سنگھ جو ابھی تک پریشان اور بد حواس کھڑا تھا، اٹنشن ہو گیا اور اس نے ایڑیاں بجا کر سیلوٹ مارا۔ سپاہی آخر سپاہی، ہی ہوتے ہیں۔ ایک سپاہی دوسرے سپاہی کو سیلوٹ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کشن سنگھ کا دل بلّیوں اچھلنے لگا۔ برما کے محاذ پر وہ ہر شام اپنے کپتان جیکسن سے ملنے جایا کرتا تھا۔ جیکسن ہمیشہ بڑی توجّہ سے اس کی بات سنتا تھا اور اس کے سیلوٹ کا جواب باقاعدہ سیلوٹ سے دیا کرتا تھا۔

کشن سنگھ نے جذباتی ہو کر زور زور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے چلّا کر کہا:

"گاڈ سیو دی کنگ، صاحب، گاڈ سیو دی کنگ!"

ہوائی جہاز آگے جا چکا تھا اور اب شیخوں کی حویلی کے اوپر سے اڑ رہا تھا۔ کشن سنگھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس طرف دیکھنے لگا۔ شیخ کے گھر کی چھت پر بھی لوگ چڑھ آئے تھے اور ہاتھ ہلا ہلا کر انگریز ہوا باز کا خیر مقدم کرنے لگے تھے۔ کشن سنگھ دیکھنا چاہتا تھا کہ گورے نے مسلّوں کا خیر مقدم کا جواب دیا ہے یا نہیں۔ اور اسے سچ مچ لگا، جیسے پائلٹ نے ہاتھ اندر کھینچ لیا ہے۔ یہ دیکھ کر کشن سنگھ کو دلی خوشی ہوئی۔ وہ وہیں کھڑا کھڑا چہک اٹھا:

"دو دن پہلے آجاتے صاحب تو ہمارا اتنا زیادہ نقصان تو نہیں ہوتا۔ مگر کوئی فکر نہیں......"

پھر کشن سنگھ کو جوش آگیا۔ مٹھیاں بھینچ کر، شیخوں کے گھر کی طرف دیکھ کر چلّا کر بولا:

"اب چلاؤ گولی، مسلّو، لو میں سامنے کھڑا ہوں! چلاؤ گولی! اب کیوں نہیں چلاتے؟ پہلے بڑے شیر بنتے تھے، اب چلاؤ گولی!" اور بھاری بھرکم جسم والا کشن سنگھ منڈیر کے پاس کھڑا، ہاتھ جھلاتا، مٹھیاں دکھاتا پاگلوں کی طرح ناچنے لگا۔

تیجا سنگھ سوچ رہے تھے کہ جلدی سے شہر پہنچنا ہوگا اور وہاں ڈپٹی کمشنر صاحب

سے ان سارے حالات کو بتانا ہوگا۔ سارے نقصان کی فہرست بنا کر انھیں دینی ہوگی۔ اب آئے تو کیا آئے، مگر کوئی بات نہیں، ہم نے بھی اچھے بھونے ہیں۔ مسلّے پھر کبھی ہمارے ساتھ لڑنے کی ہمّت نہیں کریں گے۔

گردوارے کے پچھواڑے میں کھڑے موٹے قصائی کے بیٹے نے مٹّی کے تیل کی بوتل نالی میں انڈیل کر چبوترے کے نیچے چھپا دی۔ سوکھی تھگلیاں گردوارے کے ایک جھروکے میں سے اندر کو پھینک دیں اور دیا سلائی سے سگرٹ سلگا کر سگرٹ کے کش لیتا ہوا جدھر سے آیا تھا، ادھر ہی لوٹ گیا۔

ہوائی جہاز نے قصبے کے اندر تین چکر لگائے۔ تیسرا چکر لگاتے وقت نیچے کھڑے گاؤں کے لوگوں نے بھی ہاتھ ہلا ہلا کر اس کا استقبال کیا تھا۔ تین چکر لگانے کے بعد وہ دوسرے گاؤں کی طرف آگے بڑھ گیا۔

قصبے کا ماحول بدل چکا تھا۔ لوگ باہر آنے لگے تھے۔ لڑائی بند ہوگئی، لاشیں ٹھکانے لگائی جانے لگیں، کچھ لوگ اپنے گھنوں کپڑوں کی جانچ کرنے اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔ دیکھیں کیا بچا ہے، کیا کچھ لٹ گیا ہے۔ سیوادار اور نہنگ سکھ گردوارے کو دھونے، صاف کرنے میں لگ گئے۔ ادھر شیخ کے حکم سے مسجد بھی دھوئی اور صاف کی جانے لگی۔ دونوں مذہبوں کے لوگ اپنی اپنی عبادت گاہوں کو دھو دھو کر صاف کر رہے تھے۔

جس جس گاؤں پر ہوا جہاز اڑتا گیا، وہیں پر بجتے ڈھول خاموش ہو گئے۔ نعرے بازی بند ہو گئی۔ آتش زنی اور لوٹ مار ختم ہو گئی۔

19

شہر کی سڑک پر نکلتے ہی پتہ چل جاتا تھا کہ ماحول بدل گیا ہے۔ محلّہ قطب الدین کی مسجد کے سامنے، سڑک کے پار چار ہتھیار بند فوجی کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ سڑک پر چلتے ہوئے ہر چوک پر دو تین فوجی بندوقوں سے لیس، کسی مکان کے چبوترے پر بیٹھے یا سڑک کے کنارے کھڑے نظر آتے۔ شہر میں فوج تعینات کر دی گئی تھی۔ فساد کے چوتھے دن اٹھارہ گھنٹے کا کرفیو لگا دیا گیا تھا لیکن آج پانچویں دن کرفیو کی میعاد بارہ گھنٹے کر دی گئی تھی۔ شام کے چھ بجے سے لے کر صبح کے چھ بجے تک کانوں کان خبر پھیل چکی تھی کہ بکتر بند گاڑی میں سٹی مجسٹریٹ اور ڈپٹی کمشنر بھی مسلح سپاہیوں کے ساتھ شہر کا دورہ کرتے ہیں۔ کہیں کہیں پر دکان دار دکان کا ایک ایک طاق کھول کر دکانوں میں بیٹھنے لگے تھے۔ بڑی سڑکوں پر گھڑ سوار پولس کے دو، دو سپاہی کمر میں پستول لٹکائے پالتو شاندار گھوڑوں پر جگہ جگہ گشت کر رہے تھے۔ دفتر، اسکول، کالج ابھی بھی بند تھے۔ گلیوں کے اندھیرے حصّوں میں یا ناکوں پر ابھی بھی گنے چنے لوگ برچھے بھالے اٹھائے، ڈھاٹا باندھے چھپ چھپا کر بیٹھے نظر آتے تھے۔ مگر کرفیو لگ جانے اور فوج تعینات کر دینے سے فساد کی شدّت نہیں رہی تھی۔ لوگ باہر نکلنے لگے تھے۔ ایک محلّے سے دوسرے محلّوں میں بھی دائیں بائیں جھانکتے ہوئے جانے لگے تھے۔ خبروں کا رُخ بدل گیا تھا۔ سننے میں آرہا تھا کہ دور فیوجی کیمپ کھلنے جا رہے ہیں جس میں ۲۰ گاؤں سے آنے والے لوگ ٹھہرائے جائیں گے۔ چھاؤنی اور شہر کے دو سرکاری اسپتالوں میں نہ صرف زخمیوں کو بھرتی کیا جانے لگا تھا بلکہ مردے بھی اٹھا اٹھا کر اکٹھے کیے جانے لگے تھے۔ ہر خبر میں ڈپٹی کمشنر کا نام ضرور سننے میں آتا تھا۔ پائپ منہ میں لگائے وہ ہر جگہ موجود تھا۔ اس کے بارے میں سنتے تھے کہ کرفیو شروع ہونے کے بعد گشت کرتے ہوئے اس نے ایک اسپتال کے باہر ایک نوجوان کو

کھڑے دیکھا، دوبار اس نے للکارا اور پھر گولی سے اڑا دیا تھا۔ سارے شہر کو کان ہوگئے تھے کہ اب دنگا فساد نہیں ہو سکتا۔ کانگریس کی طرف سے ایک اسکول کے اندر ریلیف دفتر کھل گیا تھا جہاں گاؤں دیہاتوں سے آنے والے لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ وہاں پر بھی ڈپٹی کمشنر تین مرتبہ ہو آیا تھا۔ سماجی اداروں کے ساتھ مل کر سرکار مسئلوں کو سلجھانا چاہتی تھی۔ سرکار کا یہ رجحان دیکھ کر سماجی اداروں کے لیڈر پہل کرنے لگے تھے اور ادھر سرکاری افسروں میں چستی آگئی تھی۔ یہاں تک کہ سیاسی حلقوں میں بھی ڈپٹی کمشنر کے بارے میں رائے بدلنے لگی تھی۔ بھلے ہی ڈپٹی کمشنر سامراج وادی مشین کا پرزہ ہو مگر یہ ڈپٹی کمشنر محض پرزہ نہیں ہے۔ یہ بڑی سوجھ بوجھ والا اور ہمدرد آدمی ہے۔ اسی شام جب ڈپٹی کمشنر نے اسپتال کے باہر ایک آدمی کو گول کا نشانہ بنایا تھا، تو وہ اتنا بے چین ہو اٹھا تھا کہ رات بھر سو نہیں سکا۔ پروفیسر رگھوناتھ کا تو کہنا تھا کہ یہ آدمی درحقیقت انتظامیہ کے کام کے لیے بنا ہی نہیں ہے۔ وہ نرم جذبات والا کتابی آدمی ہے، جسے برٹش سرکار نے اس کام پر لگا کر اس کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی کی ہے۔ ہاں کچھ سیاسی لوگ ابھی بھی اسے گالیاں دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ بس اسی کا کیا کرایا ہے۔

دورے پر نکلے رچرڈ کی جیپ گاڑی، ہیلتھ آفیسر کے گھر کے سامنے رکی۔ ہیلتھ آفیسر کو ٹیلی فون پر خبر دے دی گئی تھی کہ صاحب آرہے ہیں اور یہ خبر ملنے پر وہ اندر ہی اندر پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اور ہیلتھ آفیسر نے جان بوجھ کر کوٹ پتلون کی جگہ دیسی لباس ـــــ سلک کا کرتا، سرسراتی پنجابی سلوار اور پشاوری جوتی ـــــ پہن رکھی تھی۔ اس کی بیوی نے چائے پانی کا انتظام کر لیا تھا۔ صاحب کے اندر آتے ہی پائپ کے تمباکو کی مہک سارے آنگن میں پھیل گئی۔ لیکن ڈپٹی کمشنر نے چائے پی، نہ کافی۔ تقریباً پانچ منٹ تک کھڑے ہی کھڑے بات کی۔ ہیلتھ آفیسر سے ہاتھ ملاتے ہی بولا:

"نائس! ویری نائس! تمھیں ان دنوں بھی اپنے لباس کا خوب خیال رہتا ہے۔ دیسی لباس تم پر خوب جچتا ہے۔"

پھر ہیلتھ آفیسر کی بیوی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: "آپ کے لیے ابھی دن نہیں چڑھا ہے کیا؟" کیوں کہ ہیلتھ آفیسر کی بیوی ابھی تک ڈریسنگ گاؤن میں تھی۔

پھر ہیلتھ آفیسر کو مخاطب کر کے بولا: "رفیوجی کیمپوں میں پانی کا بندوبست ایک بار

پھر دیکھ لینا ہوگا۔" ڈپٹی کمشنر نے اس لہجے میں کہا جیسے اپنے آپ سے بات کر رہا ہو۔" اور پانی بہنے کے لیے نالیاں بھی ابھی تک نہیں کھودی گئی ہیں۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ مسکراہٹ کا مطلب تھا یاددہانی کہ دو دن پہلے کہا ہوا کام ابھی تک نہیں ہو پایا ہے۔

"میں نے انتظام کر دیا ہے۔ آج سے کام شروع ہو جائے گا۔"

"گڈ۔" ڈپٹی کمشنر نے کہا اور پھر مسکرایا۔" جس گاؤں میں عورتیں اور بچے کنوئیں میں کود گئے ہیں، وہاں بیماری پھیلنے کا ڈر ہے۔ آپ کو وہاں جانا چاہیئے۔"

ہیلتھ آفیسر کے کان کھڑے ہو گئے۔ گاؤں کے لوگ بھاگ کر شہر میں آ رہے تھے، میں کیا کرنے جاؤں گا؟ مگر ڈپٹی کمشنر کو ہر بات کا دھیان تھا۔

"آج تیسرا دن ہے۔ وہاں پر لاشیں پھول کر سڑنے لگی ہوں گی۔ کنوئیں میں فوراً ڈِس انفیکٹنٹ ڈالنا ہوگا تاکہ کوئی بیماری نہ پھیلے۔ کل سے روز صبح آپ جائیے۔ بس کا انتظام میں نے کر دیا ہے۔ دو مسلح سپاہی آپ کے ساتھ جائیں گے، ڈر کی کوئی بات نہیں ہے۔"

ڈپٹی کمشنر کا ہاتھ نہ صرف شہر کی نبض پر تھا بلکہ ضلع بھر کی نبض پر تھا۔

ہیلتھ آفیسر کی بیوی اس دوران کپڑے بدل کر اور جوڑا بنا کر چاق و چوبند ہو کر آ گئی تھی۔ اس نے چائے کافی کی پھر آفر کی تو ڈپٹی کمشنر مسکرا دیا۔

"ڈیر وِل بی ٹائم فار ٹی مسز کپور، بٹ ناٹ ناؤ تھینک یو!" پھر اسی طرح اپنے پَن کے لہجے میں مزید کہا: "ویل، آپ کو بھی تھوڑی مدد کرنی ہوگی۔ رفیوجی کیمپ میں دو ہزار چارپائیاں تو آج پہنچ جائیں گی لیکن کپڑوں وغیرہ کا تھوڑا انتظام کرنا ضروری ہے۔ عورتوں کی ایک چھوٹی سی ریلیف کمیٹی بن جائے تو اچھا کام ہو سکتا ہے۔" اور رچرڈ نے پھر مسکرا کر سر ہلا دیا۔

رچرڈ میں یہ بہت بڑی خوبی تھی۔ وہ بات اس ڈھنگ سے کرتا کہ لگتا، کوئی مسئلہ مشورے کے لیے اٹھا رہا ہے لیکن حقیقت میں وہ حکم ہوتا، آرڈر ہوتا۔ ہیلتھ آفیسر کی بیوی بھی پھولی نہیں سمائی۔ ڈپٹی کمشنر کی بیوی کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملے گا، اس سے بڑھ کر کیا چاہیئے۔ لیکن بیشتر اس کے کہ وہ کوئی جواب دے۔ رچرڈ ہیلتھ آفیسر کو ساتھ لیے ڈیوڑھی سے گزر کر باہر جا چکا تھا۔

"مردوں کو جلانے کے بارے میں تم کیا سوچتے ہو؟ میں سمجھتا ہوں، یہ کام میونسپل کمیٹی کی طرف سے کیا جانا چاہیئے اور عام لوگوں کو اس کی خبر دینا ضروری نہیں ہے۔ اس سے تناؤ پھر بڑھ سکتا ہے۔"

ہیلتھ آفیسر سو فی صد متفق تھا۔

"پہلے سے ہی ایسے کیا گیا ہے۔ گڑھے میں پھینکو اور جلا دو۔ اب ایک ایک کی ارتھی اٹھنے لگی تو تناؤ بڑھے گا۔" ہیلتھ آفیسر نے ڈپٹی کمشنر کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ پھر دھیرے سے بڑبڑایا: "پہلے تو ایک دوسرے کو مارتے کاٹتے ہیں اور پھر سرکار سے یہ امید کرتے ہیں کہ سرکار ان کے مردوں کو بھی ٹھکانے لگائے۔"

ڈپٹی کمشنر نے کنکھیوں سے ہیلتھ آفیسر کی طرف دیکھا۔ لمحہ بھر کے لیے وہ ٹھٹھک سا گیا، پھر مسکرا دیا: "ویل لیٹس گٹ گوئنگ۔ نو ٹائم ٹو ویسٹ۔" اور سر ہلا کر جیپ میں سوار ہو گیا۔

دس منٹ کے بعد ریلیف کمیٹی کے دفتر میں، جہاں شہر کے چیدہ چیدہ لوگ جمع تھے، وہ سرکار کے ریلیف پروگراموں کی تفصیل بتا رہا تھا۔

"بازار کھل گئے ہیں۔ کوئلے کے چار ویگن ریلوے اسٹیشن پر موجود ہیں۔ دس ویگن اور، منگل تک پہنچ جائیں گے۔ ابھی کچھ دن تک شام کو چھ بجے سے صبح چھ بجے تک کرفیو جاری رہے گا۔ ساتھ ہی فوج بھی تعینات رہے گی اور پولیس کا گشت بھی جاری رہے گا۔ شہر میں سے لاشیں اٹھوا دی گئی ہیں اور ان کو ٹھکانے لگانے کا کام سرکار خود کرے گی۔ پوسٹ آفس آج دوپہر کو کھل جائے گا۔ لیکن پچھلی ڈاک کو تقسیم کرنے کا کام ہاتھ میں نہیں لیا جا سکتا۔ بڑے ڈاکخانے میں ساری ڈاک باہر رکھ دی گئی ہے۔ ہاں البتہ رجسٹرڈ لیٹر اور پیکٹ بانٹے جائیں گے۔" بولتے وقت کبھی کبھی رچرڈ کا چہرہ لال ہو جاتا اور اس کے ہونٹ تھرتھرا سے جاتے، جیسے وہ تقریر کرنے کا عادی نہ ہو لیکن پھر بھی اس کا کوئی بھی جملہ کوئی بھی لفظ بے ربط اور بے مطلب نہیں ہوتا تھا۔

"رفیوجی کیمپوں میں ہم چاہیں گے کہ عوامی ادارے سرکار کو تعاون دیں۔ راشن کی سپلائی کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ ٹینٹ لگا دیے گئے ہیں۔ ہمیں کچھ ڈاکٹروں کی ضرورت ہوگی اور بہت سے رضاکاروں کی بھی جو رفیوجیوں کی دیکھ بھال میں مدد دے سکیں۔۔۔"

بولنے کے دوران رچرڈ کی تیز نظر نے مجمع میں بیٹھے ان گنت لوگوں کو پہچان لیا تھا اور ان کا رخ بھی بھانپ لیا تھا۔ دہلیز کے پاس منوہر لال کھڑا تھا، کالا، موٹا، منوہر لال۔ لاپروائی کے انداز میں باہیں چھاتی پر باندھے کھڑا مسکرائے جا رہا تھا۔ ڈپٹی کمشنر کے ایک ایک جملے پر ناک بھوں چڑھا رہا تھا۔ یہ وہی آدمی تھا جو فساد سے پہلے بلوائیوں کے وفد کے ساتھ آیا تھا اور رچرڈ کے دفتر کے باہر اونچا اونچا بول رہا تھا۔ رچرڈ کے منظر میں یہ آدمی یہاں بھی بکواس کر سکتا تھا۔ دوسرا آدمی کمیونسٹ دیو دت تھا۔ پچھلے ایک سال میں رچرڈ اسے دو بار تین تین مہینے کے لیے جیل بھیج چکا تھا۔ یہ آدمی فساد کے پہلے اور فساد کے دنوں میں بھی فساد کو روکنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے کارکنوں کو ایک ساتھ مل بیٹھنے اور شہر میں امن بنائے رکھنے کے لیے تیار کرتا رہا تھا۔ اس کی نظر ابھی بھی امن پر ہی تھی، اس وقت یہ اس کے علاوہ کوئی بات نہیں کرے گا۔ دفتر میں کانگرس کارکن بخشی اور دوسرے بہت سے لوگ تھے جنھیں وہ جانتا تھا، بہت سے وکیل تھے جنھیں وہ پہچانتا تھا۔ اسی مجلس میں ایک اور آدمی بھی تھا جو کانگرس میں بھی تھا، سوشلسٹ پارٹی میں تھا اور سی۔ آئی۔ ڈی میں بھی تھا۔ وہ آدمی گڑبڑ بھی کر سکتا ہے، نعرے لگاتا ہوا میٹنگ میں سے واک آؤٹ بھی کر سکتا ہے، سرکار کو گالیاں بھی دے سکتا ہے۔

مگر رچرڈ نے سیدھی لائن پکڑی، شہر کی حالت پر بحث ہونے ہی نہیں دی، اپنے مشورے دیے اور بیٹھ گیا۔

رچرڈ کے بیٹھنے کی دیر تھی کہ لالہ لکشمی نارائن اٹھ کھڑا ہوا: "ہم ڈپٹی کمشنر صاحب کو یقین دلاتے ہیں کہ شہر کی جنتا اور شہر کی سبھی سنستھائیں سرکار کے ساتھ پورا پورا سہیوگ کریں گی۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اتنا لائق، ہمدرد حاکم اس ضلع میں موجود ہے..."

اس پر رچرڈ اٹھ کھڑا ہوا۔ ریلیف کمیٹی کے عہدیداروں سے اجازت لی اور باہر نکل گیا۔ لکشمی نارائن اور کچھ وکیل بھاگتے ہوئے اسے جیپ تک چھوڑنے آئے۔ میٹنگ پندرہ منٹ میں ختم ہو گئی۔ اچانک پیچھے کے دروازے کی طرف سے آواز آئی:

"یہاں سب ہی ٹوڈی جمع ہیں، سرکار کی چاپلوسی کرنے والے۔ ہم کسی سے ڈرتے نہیں ہیں، صاف بات منھ پر کہتے ہیں۔ ان فسادوں کے لیے ذمہ دار کون ہے؟ سرکار اس وقت کہاں تھی جب شہر میں تناؤ بڑھ رہا تھا۔ اب کرفیو لگایا گیا ہے، اس وقت کیوں نہیں لگایا گیا؟

—— اس وقت صاحب بہادر کہاں تھے ؟ ہم کسی سے ڈرتے نہیں ہیں، صاف بات منھ پر کہتے ہیں ...۔" منوہرلال بولے جارہا تھا۔

مگر اس وقت تک جیپ جا چکی تھی۔

"بس، بس، اتنی باتوں کو یہاں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔" ریلیف کمیٹی کے کارکن اٹھنے لگے تھے جب ایک شخص نے ان کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا: "نکال لو گالیاں سرکار کو، کیا بنالوگے؟ سرکار کو اس وقت گالیاں دینے سے تمھیں کیا مل جائے گا؟"

"ارے بخشی جی آپ بھی ایسی بات کہتے ہیں ؟ آپ بھی اب جاکر چرخہ کاتیے یا گلیاں صاف کیجیے۔ سیاست آپ کے بس کا روگ نہیں ہے۔"

"تو اتنا چلاتا کیوں ہے ؟ کیا میں نہیں جانتا کہ فساد انگریز کرواتا ہے۔ گاندھی جی نے ایک بار نہیں، دس بار کہا ہے ...۔"

"پھر آپ نے کیا کیا ہے ؟"

"کیا نہیں کیا ہے ؟ مسلم لیگ والوں کے پاس گئے ہیں کہ شہر میں امن رکھنے کے لیے ہمارے ساتھ مل کر کام کرو۔ ڈپٹی کمشنر کے پاس گئے ہیں کہ فوج لگاؤ اور فساد کو روکو۔ اور ہم کر ہی کیا سکتے تھے ؟ اور اب جب لوگ برباد ہوکر آئے ہیں، ہمارا کیا فرض ہے۔ ہم ان کی مدد کریں یا سرکار کو گالیاں دیں ؟ بڑا آیا انقلابی!"

"ہم نے بھی بہت دیکھے ہیں، ہم سے نہ کہلوایئے بخشی جی، ہم سب جانتے ہیں۔ کانگرس کے ممبر رفیوجی کیمپ میں سرکار سے سپلائی کے ٹھیکے لے رہے ہیں۔ کہو تو نام بھی بتا دوں ؟"

"ٹھیکے لے رہے ہیں تو میں کیا کروں ؟"

"آپ لوگوں نے انھیں کانگرس میں بھی چودھری بنا رکھا ہے۔"

تبھی ایک شخص منوہرلال کے پاس آیا اور منوہرلال کی کمر میں اپنا ہاتھ ڈال کر اسے وہاں سے لے چلا: "چھوڑو یار، ہم نے بہت دیکھے ہیں، یہاں سب توتے بیٹھے ہیں۔ گاندھی جی واردھا میں بیٹھے حکم دیتے ہیں تو یہاں پر عمل ہونے لگتا ہے۔ لیکن وہ خود کچھ نہیں سوچ سکتے۔"

"ڈپٹی کمشنر کو یہاں بلانے کا کیا مطلب تھا؟"

مگر منوہر کا دوست اسے ڈھکیلتا ہوا پھاٹک تک لے گیا۔ گیٹ پر پہنچ کر منوہر لال نے ۔بڑبڑانا چھوڑ دیا۔

" لاؤ اب سگریٹ تو نکالو، دو کش تو لگائیں۔۔"

اور دونوں دوست گیٹ کے پاس چبوترے پر بیٹھ گئے۔

ڈپٹی کمشنر کے چلے جانے کے بعد بخشی جی کے دل کی حالت بھی کچھ کچھ ویسی ہی ہو رہی تھی۔ فساد کروانے والے بھی انگریز، فساد روکنے والے بھی انگریز، بھوکوں مارنے والے بھی انگریز، روٹی دینے والے بھی انگریز، گھروں میں بسانے والے بھی انگریز۔۔۔۔۔ مگر جب سے فساد شروع ہوئے تھے بخشی جی کے دماغ میں دھول سی اڑنے لگی تھی۔ یہی جملہ وہ بار بار کہتے تھے " انگریز پھر بازی لے گیا۔" مگر شروع سے آخر تک حالات ان کے قابو میں نہیں آئے۔

جس دوران رچرڈ شہر کا دورہ کر رہا تھا، تب لیزا بوریت سے پریشان ہو رہی تھی۔

اپنے بیڈ روم سے نکل کر وہ بڑے کمرے میں آئی۔ الماریوں میں ٹھسا ٹھس بھری کتابیں چھاتی کا بوجھ بنی ہوئی تھیں۔ محسوس ہوتا تھا کہ وقت کی رفتار رک گئی ہے اور ہر شے ساکت ہو گئی ہے۔ ہر چیز کو لقوہ مار گیا ہے۔ اگر کچھ زندہ ہے تو گوتم بدھ اور بودھی ستو کی آنکھیں، جو اندھیرے کونوں میں چھل اور کپٹ سے بھری بے گنتی بھاؤ ناؤں کے جال بچھاتی سی اس کی طرف دیکھا کرتی ہیں۔ شام کے وقت اس کمرے میں آتے ہوئے اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ جگہ جگہ کھڑے مجسمے اسے زہریلے سانپوں کے سر جیسے لگتے تھے۔

وہ کھانے کے کمرے میں آئی۔ یہاں کا ماحول کہیں زیادہ پُر سکون تھا۔ یہاں پھول تھے، ہلکی روشنی تھی، یہاں مجسمے نہ تھے، نا ہی کتابوں کا بوجھ تھا۔ یہاں ماحول میں اپنائیت تھی، یہاں آدمی سب کچھ بھول سکتا تھا، بہت کچھ یاد کر سکتا تھا۔ ایسی روشنی محبت کرنے کے لیے بنی تھی، وصل اور بھوسوں کے لیے۔ لیزا کو اپنا گلا رندھا سا محسوس ہوا اور آنکھوں میں آنسو چبھنے سے لگے۔ اندر ہی اندر پھر سے کچھ امڈنے لگا تھا اور دھیرے دھیرے اس کی بے چینی بڑھنے لگی۔ اس کمرے کی خوشگواریت بھی اتھاہ سناٹے میں بدل گئی۔ اچانک اس کے اندر بے قراری سی جاگی، اپنی سسکی کو دباتی ہوئی وہ اٹھی اور برآمدے کے پاس آ کر زور سے چلائی: "بیرا!"

زور سے دیواروں کو لانگھتی پھلانگتی ہوئی سی آواز آئی "میم ساب!"

اور کندھے پر جھاڑن لٹکائے، ڈُلکی چال چلتا ہوا خان ساماں میم صاحب کے سامنے آ کر

کھڑا ہو گیا۔ چار بج رہے تھے۔ وہ جانتا تھا، کیا حکم ہو گا۔ کبھی تین بجے، کبھی چار بجے، کبھی ساڑھے چار بجے تک میم صاحب کا صبر جواب دے جاتا تھا اور وہ جس کمرے میں بھی ہوتیں، چلا کر بلاتی تھیں: "بیر لاؤ، ٹھنڈا بیر مانگتا!"

اور لیزا ہلکی سی کراہ کے ساتھ پھر کھانے کے کمرے میں لوٹ گئی۔ لیزا گاؤن پہنے ہی اس کے سامنے چلی آئی تھی اور گاؤن کی بھی پیٹی کھلی تھی۔ اس سنسان بیابان میں رہتے ہوئے بیر کے علاوہ کچھ رہ نہیں گیا تھا جس سے انسان اپنی حالت، اپنے آپ کو بھول سکے۔

رچرڈ شام کو آٹھ بجے کے قریب لوٹا۔ لیزا نشے میں دھت صوفے پر ہی پڑی پڑی سو گئی تھی۔ تپائی پر بیر کی بوتل میں اب بھی کچھ گھونٹ بچ رہے تھے۔ صوفے کے ایک سرے پر لیزا کا سر لڑھک کر لٹک سا رہا تھا اور اس کے بال اس کے آدھے چہرے پر بکھر گئے تھے۔ گاؤن اوپر کھسک آیا تھا جس سے گھٹنے ننگے ہو رہے تھے۔

"ڈیم دِس کنٹری، ڈیم دِس لائف!" رچرڈ صوفے کے سامنے کھڑا کھڑا بدبدایا۔

اپنے گھر پہنچنے پر رچرڈ دوسری دنیا میں پہنچ جاتا تھا۔ گھر کے اندر انگلینڈ کی زندگی تھی، اس کی نجی زندگی اور اس کے مسائل جن کا باہر کی دنیا سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ باہر کی زندگی تو دھندا تھی۔ اصل زندگی تو گھر کے اندر تھی، جو اس کی نجی زندگی تھی، علاوہ اس مشق کے جس میں وہ گھر اور باہر دونوں کو بھول جاتا تھا۔

وہ صوفے کے ایک سرے پر بیٹھ گیا اور آگے بڑھ کر لیزا کا گال چوم لیا۔ اپنا فرض نبھاتے ہوئے محبت میں رات کو کبھی کبھی جس جوش کے ساتھ وہ اس جسم کو باہوں میں بھرا کرتا تھا، اس وقت وہی جسم تھس، گوشت کا لودہ اور غیر دلچسپ لگ رہا تھا۔ لیزا کا وزن پھر سے بڑھنے لگا تھا اور اس کی آنکھوں کے نیچے گومڑے بننے لگے تھے۔ بوریت کے سبب لیزا موٹی ہوتی جا رہی تھی۔ ہر بار گھر لوٹنے پر وہ لیزا کو ایسی حالت میں دیکھتا کہ اس کا دل کھٹا ہو جاتا۔

"لیزا!" اس نے آگے جھک کر لیزا کے کان میں کہا اور ہاتھ بڑھا کر اس کے ماتھے سے بال ہٹا دیے۔

لیزا نیند میں تھی۔ رچرڈ نے اسے کندھے سے ہلا دیا۔ پھر یہ دیکھ کر کہ لیزا اس حالت میں نہیں ہے کہ میز پر بیٹھ کر ڈنر کرے، اسے اس کے بستر میں لٹا دینا ہی مناسب ہو گا۔ اس نے دایاں ہاتھ لیزا کی گردن کے نیچے دیا اور بایاں ہاتھ گھٹنوں کے نیچے اور لیزا کو اٹھا کر بیڈ روم میں لے جانے کی

کوشش کرنے لگا۔ اسی وقت رچرڈ کو محسوس ہوا کہ جیسے لیزا کا گاؤن نیچے سے گیلا ہو رہا ہے۔ اس کی نظر صوفے پر پڑی۔ جس سمت لیزا کی ٹانگیں رہی تھیں، وہاں ایک دائرے میں صوفے کا حصّہ گیلا ہو رہا تھا۔ لیزا نے صوفے پر پیشاب کر دیا تھا۔

رچرڈ کو گھن سی آگئی۔ پیشاب کی تیز بدبو اس کی ناک میں گئی۔ رچرڈ نے کھڑے کھڑے ہی سر ہلا دیا۔ کہانی پھر سے دوہرائی جانے لگی ہے۔ ابھی لیزا اسال بھر گھر میں —— لندن میں —— گزار کر آئی تھی۔ وہ اس سے اوب کر ہندوستان سے بھاگ گئی تھی۔ وہ پھر بھاگ جائے گی یا مجھے اپنی تبدیلی دوسری جگہ کروانی پڑے گی۔

صوفے کی طرف دیکھ کر اسے اچانک ایک انوکھی سی بات یاد آگئی اور وہ مسکرا دیا۔ یہ صوفہ سیٹ اس نے یہاں تبدیل ہونے پر کمشنر لارنس سے لیا تھا۔ جو تبدیل ہو کر لکھنؤ جا رہا تھا۔ اور جب اس صوفے پر سے اس نے کپڑا اتارا تھا تو اس کے نیچے اسے ایسا ہی ایک نشان نظر آیا تھا جیسا اب دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ کمشنر کی بیوی بھی بوریت کا شکار تھی اور نشے میں یا تو روتے روتے یا ہنستے ہنستے صوفے کو گیلا کر دیا کرتی تھی۔ کمشنر بھی جگہ جگہ اپنی تبدیلیاں کرواتا رہتا تھا۔ آخر میں اس کی بیوی اسے چھوڑ گئی تھی اور فوج کے ایک نوجوان کپتان کے ساتھ شادی رچالی تھی۔ رچرڈ نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا، پھر صوفے کی طرف۔ اس گھر میں بھی ایسا ہی کچھ ہوگا۔ اور لیزا کو اٹھا کر بیڈ روم کی طرف لے چلا۔

بیڈ روم تک پہنچتے پہنچتے لیزا جاگ گئی تھی۔ نشہ بھی کچھ اترنے لگا تھا۔

"کیا ہے رچرڈ، مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"تمھارا گاؤن نیچے سے گیلا ہو رہا ہے، لیزا۔ میں تمھیں تمھارے کمرے میں لے جا رہا ہوں۔"

لیکن لیزا نے اس جملہ کے واضح معنی نہیں سمجھے۔

رچرڈ نے لیزا کو بیڈ روم کے پاس رکھی آرام کرسی پر بٹھا دیا۔

"کھانا کھاؤ گی لیزا۔"

"کھانا! کیسا کھانا؟"

رچرڈ کا دل چاہا کہ اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دے۔ وہ ہوش میں آجائے گی مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کیا اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اسے گھورتا رہا۔

لیزا نے بکھرے بالوں کے بیچ سر اٹھایا: "رچرڈ، تم ہندو ہو یا مسلمان؟"
یہ کہہ کر وہ ہلکے سے ہنس دی۔
"تم کب آئے، مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔" لیزا نے کہا: "تم دن کا کھانا کھانے آئے ہو یا رات کا؟"

ایک لمحہ کے لیے رچرڈ کو لگا کہ جیسے لیزا طنز کر رہی ہے اور وہ اتنی زیادہ نشے میں نہیں ہے جتنا بن رہی ہے۔ وہ اس کے سامنے پلنگ پر بیٹھ گیا اور اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولا: "آج کل مجھے بہت کام ہے۔ لیزا تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ مجھے بہت کام ہے۔ شہر میں اناج کی منڈی جل گئی ہے اور باہر ایک سو تین گاؤں جل گئے ہیں۔"

"ایک سو تین گاؤں جل گئے ہیں اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا؟ میں سوئی رہی اور مجھے پتہ نہیں چلا!" پھر شکایت کے لہجے میں کہا: "مجھے بتا تو دیا ہوتا رچرڈ؟ مجھے جگا کر ہی بتا دیا ہوتا۔ اتنی بڑی بڑی باتیں ہو گئیں اور مجھے تم نے بتایا ہی نہیں؟"

"سو جاؤ لیزا۔ کپڑے بدل کر سو جاؤ، تمھیں نیند آ رہی ہے۔"

"تم میرے پاس بیٹھو، میں اکیلی نہیں سو سکتی۔"

"تم سوؤ لیزا۔ ابھی مجھے بہت کام کرنا ہے۔"

"اتنے گاؤں تو جل گئے، رچرڈ، پھر بھی تمھیں کام ہے! اب اور کیا کام کرنا ہے؟"

رچرڈ ٹھٹھک گیا۔ کیا لیزا طنز کر رہی ہے؟ کیا اس کے دل میں میرے لیے نفرت پیدا ہونے لگی ہے، جو وہ اس طرح کی باتیں کر رہی ہے۔

نشے میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی طرح لیزا بھی جو منھ میں آتا، کہے جا رہی تھی۔ وہ کرسی پر سے اٹھی اور لڑکھڑاتی ہوئی جا کر بیڈ پر رچرڈ سے چپک کر بیٹھ گئی اور اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال کر اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ نہیں، یہ نفرت نہیں ہو سکتی۔ اس نے انجانے میں ہی یہ جملہ کہہ دیا ہوگا۔

"تم مجھے پیار نہیں کرتے میں جانتی ہوں، میں سب جانتی ہوں۔"

پھر رچرڈ کے بال سہلا کر بولی: "کتنے ہندو مرے، کتنے مسلمان مرے؟ رچرڈ تمھیں تو سب معلوم ہوگا۔ اناج منڈی کیا ہوتی ہے؟"

رچرڈ خاموش اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کسی کسی وقت رچرڈ کے

من میں کبھی کبھی لیزا کے لیے نفرت کا احساس اٹھتا۔ وہ جتنا زیادہ نشہ کرنے لگی تھی، اتنا ہی زیادہ وہ اس کے لیے بے کشش ہوتی جا رہی تھی، گوشت کا لوتھڑا بنتی جا رہی تھی۔ اس طرح کا رشتہ زیادہ دن نہیں چل سکتا۔ رچرڈ کی آنکھیں لیزا کے چہرے پر جمی رہیں۔ لیزا کے لیے اس کے جذبات بھی واضح نہیں تھے۔ اس لڑکی سے شادی استوار رکھے یا توڑ دے، یہ سوال بھی اپنے کیریر کے تعلق سے ہی سوچا جا سکتا تھا اس وقت اس کے کیریر میں ایک فیصلہ کن گھڑی آ پہنچی تھی، جس میں ایک نازک سا توازن برقرار رکھنا ضروری تھا۔ یہ دیکھنا ضروری تھا کہ عوام کا غصہ برٹش سرکار کے خلاف بھڑک نہ اٹھے۔ ابھی تک اس نے سارے کام بڑی سمجھ داری اور احتیاط سے انجام دیے تھے۔ لوگ اس کی ایمانداری سے متاثر ہوئے تھے۔ ہر بات ٹھیک بیٹھی تھی۔ اسی لیے اس وقت جیسے تیسے لیزا کا ساتھ بنائے رکھنا ضروری تھا۔

اس نے آگے جھک کر لیزا کا گال چوم لیا۔

"سنو لیزا،" رچرڈ نے جوش سے کہا: "مجھے کل سید پور جانا ہے۔ ایک کنوئیں میں ڈس انفیکٹنٹ ڈلوانا ہے جہاں کچھ عورتیں ڈوب مری تھیں۔ تم بھی ساتھ کیوں نہیں چلتیں؟ ادھر سے ہم موٹر میں ٹیکسلا کی طرف نکل جائیں گے۔ ٹیکسلا کا میوزیم دیکھ لیں گے۔ کیا کہتی ہو؟ وہ سارا علاقہ بہت خوبصورت ہے۔"

لیزا نے نیم وا آنکھوں سے رچرڈ کے چہرے کی طرف دیکھا: "مجھے کہاں گھمانے لے چلوگے رچرڈ؟ مجھے جلتے گاؤوں کی سیر کراؤ گے؟ میں کچھ بھی دیکھنا نہیں چاہتی، میں کہیں بھی جانا نہیں چاہتی۔"

"نہیں نہیں، گھر میں بیٹھے رہنے کی کیا تک ہے؟ اب حالت بدل گئی ہے۔ اب تم گھوم پھر سکتی ہو۔" رچرڈ نے اپنے لہجے کی خوشگواریت کو بنائے رکھا: "اب ہم ایک ساتھ گھوم پھر سکتے ہیں۔ یہاں کا دیہاتی علاقہ سچ مچ بہت خوبصورت ہے۔ اسی دن اس سید پور میں ہی پھلوں کے باغ کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے لارک (ایک پرندہ) کی آواز سنی تھی۔ اس موسم میں وہاں لارک ملتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس گرم ملک میں بھی یہ پرندہ رہتا ہوگا۔ میں حیران رہ گیا۔ یہاں اور بھی طرح طرح کے پرندے ملتے ہیں جنھیں تم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔"

"کیا یہ وہی جگہ ہے جہاں عورتیں ڈوب مری ہیں؟"

"ہاں وہی۔ کنوئیں کے ساتھ ہی ندی بہتی ہے۔ اور ندی کے پار ہی پھلوں کا باغ ہے۔۔"

ایک ہلکی سی مسکراہٹ لیزا کے ہونٹوں پر آئی اور وہ رچرڈ کے منھ کی طرف دیکھتی رہی: "تم کیسے انسان ہو رچرڈ' ایسی جگہوں پر بھی تم نئے پرندے دیکھ سکتے ہو' لارک کی آواز سن سکتے ہو؟"

"اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے لیزا۔ سول سروس ہمیں سخت بنا دیتی ہے ہم اگر حادثے کے لیے جذباتی ہونے لگیں تو انتظامیہ ایک دن بھی نہیں چل پائے گا۔"

"اگر ۱۰۳ گاؤں جل جائیں تب بھی نہیں؟"

"تو بھی نہیں۔" رچرڈ نے ذرا رک کر کہا، "یہ میرا ملک نہیں ہے۔ نہ ہی یہ میرے ملک کے لوگ ہیں۔"

لیزا رچرڈ کے منھ کو تکتی رہ گئی۔

"مگر تم تو ان لوگوں کے بارے میں کتاب لکھنے جا رہے تھے رچرڈ؟ ان کی نسل کے بارے میں۔ وہی نا؟"

"کتاب لکھنا اور بات ہے لیزا' اس کا انتظامیہ سے کیا تعلق؟"

لیزا کو پھر سے گم صم دیکھ کر رچرڈ بولا: "آج میں نے ہیلتھ آفیسر کی بیوی سے کہا ہے کہ رفیوجیوں کے لیے سامان اکٹھا کرے۔ یہاں پر گاؤں سے آنے والے رفیوجیوں کے لیے دو کیمپ کھولے جا رہے ہیں اور میں نے اسے یقین دلایا ہے کہ تم اس کام میں ہاتھ بٹاؤ گی۔"

اپنی تجویز کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے مزید کہا: "رفیوجیوں کے لیے کپڑا' کھانے پینے کی چیزیں' بچّوں کے لیے کھلونے تم اکٹھا کر سکتی ہو۔ اس سے تمھیں گھومنے پھرنے کا موقعہ ملے گا۔۔"

لیزا چپ رہی۔ رچرڈ نے پھر جھک کر لیزا کا گال چوم لیا اور دائیں ہاتھ سے اس کے بال سہلاتے ہوئے کہا: "میں نہیں رک سکتا لیزا' مجھے بہت کام ہے۔ اس وقت مجھے اپنے دفتر میں ہونا چاہیئے تھا۔"

اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"پھر ملوں گا' لیزا! میرا انتظار نہیں کرنا۔۔ اور دیہات میں چلنے کے لیے صبح تیار رہنا۔ ہم آٹھ بجے نکل جائیں گے۔" اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

لیزا بیٹھی دیر تک کھلے دروازے کی طرف دیکھتی رہی' اس کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ کمرہ پھر سائیں سائیں کرنے لگا۔

20

"ہمیں اعداد و شمار چاہئیں، صرف اعداد و شمار! آپ سمجھتے کیوں نہیں؟ آپ لمبی ہانکنے لگتے ہیں، ساری رام کہانی سنانے لگتے ہیں۔ مجھے رام کہانی نہیں چاہیئے۔ مجھے آنکڑے چاہئیں۔ کتنے مرے، کتنے زخمی ہوئے، کتنا مالی نقصان ہوا ..."

ریلیف کمیٹی کا عہدیدار رجسٹر کھولے جھلاکر کہتا لیکن رفیوجی تھے کہ سمجھتے نہیں تھے دن بھر بیٹھے رہو، رجسٹر کالا کرتے رہو، شام کے وقت لسٹ تیار کرنے لگو تو دو گاؤوں کی تفصیل بھی پوری نہیں ہو پاتی تھی۔ انھیں کون سمجھائے۔ ان سے روکھا بھی نہیں بولا جاسکتا تھا، دفتر سے باہر نہیں نکالا جاسکتا تھا، سبھی بڑھے چلے آتے ہیں۔ ایک ہی جگہ تین تین ایک ساتھ ہی بول رہے ہیں۔ اور اس کے کانوں میں اپنی اپنی کہانی چلا چلا کر سنائے جارہے ہیں۔ لیکن ان سے کوئی کیا کہے —— برباد ہو کر آئے ہیں، بے گھر، بے سروسامان۔ سب ہی اس کی میز پر جھک آتے ہیں۔ رفیوجی کہانی نہ چھیڑ دیں تو دو منٹ میں پورے گاؤں کی تفصیل معلوم ہوسکتی ہے۔ "مجھے یہ سب نہیں سناؤ، مجھے اعداد و شمار دو" مگر کرتار سنگھ ہاتھ باندھے کہے جارہا ہے:

"او، میں اس نوں پھر کہا، او امداد خاں، ہم ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے ہیں۔ تو مجھے بھول گیا ہے۔ صبح کا وقت ہے بابوجی، واہگرو جھوٹ نہ بلوائے، امداد خاں نے پہلے مجھ پر وار نہیں کیا ..."

بابو پریشان ہو اٹھتا۔ وہ آنکڑے مانگتا تھا، لوگ اسے زخم دکھا رہے تھے۔

"گنڈاسا سیدھا میرے ماتھے پر لگا، اس آنکھ پر لگا۔ کیوں بابوجی میری آنکھ بچ جائے گی؟ دادا کہنے لگا: بنتا سنگھ آنکھ پر سے پٹی مت کھولنا۔ میں نے پٹی نہیں کھولی۔"

یہ آنکڑے نہیں تھے۔ یہ کہانی تھی۔ اب ایک اور آدمی میز کے سامنے آبیٹھا تھا۔

اعداد و شمار والا بابو میز پر سے آنکھ اٹھائے بغیر سوال پوچھے جا رہا تھا اور جواب لکھے جا رہا تھا:

"نام؟"

"ہرنام سنگھ۔"

"ولدیت؟"

"سردار گروپال سنگھ۔"

"موضع؟"

"ڈھوک الٰہی بخش۔"

"تحصیل؟"

"نور پور۔"

"کتنے گھر ہندوؤں سکھوں کے تھے؟"

"صرف ایک گھر، میرا گھر جی۔"

بابو نے سر اوپر اٹھایا۔ بڑی عمر کا ایک سکھ سوالوں کا جواب دیے جا رہا تھا۔

"تم بچ کر کیسے آ گئے؟"

"کریم خاں کے ساتھ ہمارے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ شام کو جب...."

بابو نے انگلی سے اشارہ کر کے اسے بولنے سے منع کر دیا۔

"جانی نقصان؟"

"نہیں جی۔ میں اور میری گھر والی بچ کر آ گئے ہیں۔ بیٹا اقبال سنگھ نور پور میں تھا جی، اس کے بارے میں نہیں معلوم۔ بیٹی جسبیر کور سید پور میں تھی۔ وہ کنوئیں میں ڈوب مری ہے۔"

بابو نے پھر انگلی سے اشارہ کر کے خاموش کر دیا۔ "سیدھا کہو، جانی نقصان؟"

"ایک بیٹی ڈوب مری۔"

"مگر وہ تمھارے گاؤں میں تو نہیں مری؟"

"جی نہیں۔"

"یہ آنکڑے دوسرے گاؤں کے ہیں۔ آپ اپنے گاؤں کے بتائیے!"

"۔۔۔۔۔"

"مالی نقصان؟"

"دوکان جل گئی ہے۔ سارا سامان لوٹ لیا گیا۔ ایک ٹرنک تھا، وہ بھی چوری ہو گیا تھا۔ اس میں سے دو سونے کے کڑے۔۔۔ مگر وہ ٹرنک میں نے خود ہی احسان علی کو دے دیا تھا جی۔ اس کی گھر والی راجو، بڑی نیک بخت عورت ہے۔ اس نے۔۔۔"

بابو کی انگلی پھر کھڑی ہو گئی تھی اور ہرنام سنگھ چپ ہو گیا تھا۔

"دوکان کتنی مالیت کی ہو گی؟"

"کیوں بنتو؟ دوکان کتنی مالیت کی رہی ہو گی؟"

"کل لاگت بتائیے نا سامان سمیت۔۔۔ جلدی کیجیے۔ مجھے اور بھی بہت کام ہیں۔"

"یہی سات آٹھ ہزار کی، پیچھے زمین تھی، کچھ۔۔۔"

"دس ہزار لکھ لوں؟"

"جی لکھ لیجیے۔"

"کوئی مال برآمد کرنا ہے؟"

"جی ایک بندوق ہے، دونالی بندوق۔ وہ ادھیروییں جلال دین صوبے دار کے گھر میں رکھی ہے۔۔۔"

"تم تو ادھیرو کے نہیں ہو۔ تم تو ڈھوک الٰہی بخش کے ہو۔"

"جی ہم ڈھوک الٰہی بخش سے بھاگ گئے تھے۔ پہلی رات تو ہم ندی کے کنارے کنارے بھاگتے رہے۔ دن کے وقت ہم احسان علی کے گھر میں رہے، رات کو پھر چلتے رہے۔ دوسرے دن ادھیرو میں جلال دین نے ہمیں پناہ دی۔ وہ بہت بھلا آدمی ہے۔ اس نے ہمیں الگ سے برتن دیے کہ اپنی رسوئی آپ کر لو۔۔۔"

"بس بس چھوڑیے، اس صوبے دار کا نام اور پتہ بولیے۔"

ہرنام سنگھ اپنی داستان سنانا چاہتا تھا، اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھ تاچھ کروانا چاہتا تھا مگر بابو نے ایک نہیں سنی۔ سارا وقت ہونٹوں پر انگلی رکھے رہا اور پھر اسے چلتا کر دیا۔

"اب آپ تشریف لے جائیے۔"

آنکڑے (اعداد و شمار) والے بابو نے اپنے مطلب کی چیز لکھ لی تھی۔ اناج کے دانے نکال لیے تھے، باقی سب بھوسی تھی۔ بھوسی ہی بھوسی۔ مگر کبھی کبھی بابو بپتا سننے لگتا تو سنتا ہی چلا جاتا۔ کوئی کوئی آپ بیتی اسے باندھ لیتی۔ اس کا دل اور دماغ جکڑ لیتی۔

"کیوں بابو جی، کیا معلوم، میری سکھونت نے کنوئیں میں چھلانگ نہیں لگائی ہو! کیا معلوم بیٹی کو لے کر گاؤں میں ہی کہیں چھپی بیٹھی ہو؟ میں گلی میں بھاگتا ہوا اپنے گھر گیا تھا جی، کھاٹ لینے کے لیے، کیوں کہ آسا سنگھ زخمی ہو گیا تھا۔ تب ہی میں نے بہت سی عورتوں کو گردوارے سے نکلتے دیکھا تھا۔ سکھونت بھی ان کے ساتھ تھی۔ مجھے کیا معلوم جی، کہاں جا رہی ہیں۔ اس کے ہاتھ اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ گلے میں پلّہ ڈال رکھا تھا۔ جب میں کھاٹ لے کر آیا تو سکھونت گلی میں کھڑی ہو گئی تھی۔ پہلے وہ عورتوں کے پیچھے جا رہی تھی، پھر وہ پیچھے کھڑی ہو گئی تھی۔ ہمارا بیٹا گرمیت گردوارے کے چبوترے پر کھڑا تھا۔ اس وقت پیچھے اسکول جلنے لگا تھا جی۔ آگ کی لپٹیں کبھی اوپر کو اٹھتیں تو روشنی تیز ہو جاتی اور کبھی بیٹھ جاتیں تو گلی میں دھوپ چھاؤں جیسی ہونے لگتی۔ اس دھوپ چھاؤں میں، میں نے دیکھا سکھونت گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ لوٹ آئی، بیٹے کے پاس لوٹ آئی، پھر گلی میں کھڑی ہو گئی۔ جب آگ بھڑکی تو میں نے دیکھا، وہ گلی کے بیچ و بیچ کانپتی سی کھڑی تھی۔ "سکھو، کیا کر رہی ہے؟" میں نے کہا۔ مگر اس وقت سوچنے کہنے کا وقت ہی کہاں تھا! اگر اس وقت سکھونت کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو گرمیت کو کہیں نہ کہیں لے جاتی وہ۔ ایک بار پھر وہ بیٹے کے پاس گئی اور پھر چلتے چلتے رک گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا جی، وہ کیا کرنے جا رہی ہے، کیا سوچ رہی ہے؟ تب ہی گاؤں کے باہر شور ہونے لگا تھا۔ 'یا علی'، 'یا علی' کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو سکھونت لپک کر گرمیت کے پاس آئی اور گرمیت کو گود میں اٹھا کر بھاگتی ہوئی، عورتوں کے پیچھے پیچھے جانے لگی۔ آخری بار جب میں نے اسے دیکھا تو سکھونت بھاگی جا رہی تھی اور اس کا ہرے رنگ کا دوپٹہ اڑ رہا تھا۔ اس کے بعد گلی کا موڑ آ گیا اور وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔۔ میں یہ کہتا ہوں جی، کیا معلوم سکھونت نے کنوئیں میں چھلانگ نہ لگائی ہو۔ کیا معلوم جی، گرمیت کو ساتھ میں نہ لے گئی ہو، کیا معلوم گرمیت نہ ڈوبا ہو، وہیں کہیں کنوئیں کے پاس گھوم رہا ہو، کیوں جی؟ کیوں بابو جی؟ اس کا پتہ نہیں لگایا جا سکتا۔۔۔؟" لیکن یہ آنکڑے نہیں تھے اور برآمد کا کام اس کا نہیں ہے۔ وہ دیوراج جی کرتے ہیں۔ برآمد کا سارا کام، گڑا ہوا سونا

نکالنے، کپڑا لتا نکالنے، ایسے سبھی کام وہ سنبھالے ہوئے ہیں، سردار جی بیٹے کا پتہ لگانے کے لیے آپ ان کے پاس جائیے۔ میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ تیسری بار میرے پاس آچکے ہیں۔ بار بار یہی قصّہ دوہرتے ہیں۔ یہ سننا میرا کام نہیں ہے۔۔۔"

لیکن سردار پھر بھی سامنے بیٹھا ہوا بابو کی طرف دیکھے جا رہا ہے۔ یہ کس امید پر میرے پاس آتا ہے۔ میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مگر آخر میں بابو دھیمی آواز میں کہتا ہے:

"منگل وار کو شاید ایک بس آپ کے گاؤں میں جائے گی۔ میں دیوراج جی سے کہوں گا کہ اس میں آپ کو بھی بھیج دیں۔ مگر آپ کسی کو بتایئے گا نہیں، ورنہ سارا گاؤں میرے پاس دوڑا چلا آئے گا۔۔۔"

مگر اس جملے کا سردار پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے وہ آپ ہی کہتا ہے۔ "اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا اچھا ہوتا ہے۔ سب کچھ ٹھوک بجا کر دیکھ لینا چاہیئے۔ بیٹا کہیں چھپا بیٹھا ہوگا تو مجھے دیکھ کر اپنے آپ باہر آجائے گا۔ بھاگتا ہوا باہر آجائے گا یا وہیں سے بیٹھے بیٹھے چلانے لگے گا: 'مجھے ڈھونڈلو، مجھے ڈھونڈلو!' گھر میں بھی روز چھپتا پھرتا تھا۔ کبھی ایک دروازے کے پیچھے، کبھی دوسرے دروازے کے پیچھے۔۔۔"

بابو آہستہ سے کرسی پر اٹھا اور کمرے کے باہر نکل گیا۔

باہر پچھے پر آکر دیکھو تو پتہ چلتا تھا کہ کتنے لوگوں کی دفتر میں بھیڑ جمع ہے۔ نیچے آنگن میں جگہ جگہ گاؤں دیہاتوں سے آئے ہوئے لوگوں کی ٹولیاں بیٹھی ہیں۔ پیچھے اونچا لمبا چبوترہ کھڑا ہے جس پر بیٹھ کر شاستری جی دھرم کی عظمت کا بیان کیا کرتے تھے۔ ادھر سیڑھیوں پر بھی لوگ آکر بیٹھ گئے ہیں۔

"گنڈا سنگھ نہ رو" اس کے کانوں میں آواز آئی۔ کوئی نیک بخت ایک آدمی کو سمجھا رہا تھا۔ "نہ رو گنڈا سنگھ، جو چلے گئے، اوہ گرو مہاراج نو پیارے ہو گئے۔ پنتھ کی خاطر اہناں جاناں وار دیتا، ہمیشہ لئی اوہ امر ہو گئے۔"

"واہے گرو، واہے گرو! ستنام، سچے پادشاہ!"

سیڑھیوں پر بیٹھے تین چار سکھوں کی آواز آئی۔

آنکڑا بابو پچھے پر کھڑا ہی تھا جب ایک اور سردار اس کے پاس آیا۔ اسے دیکھتے ہی آنکڑا بابو

مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ موٹی موٹی آنکھیں، ادھیڑ ڈھیلا ڈھالا جسم، وہ بھی بار بار بابو کے پاس پہنچ جاتا تھا اور ہمیشہ بابو کے کان کے پاس منھ لے جاکر بات کرتا تھا:

"کوئی انتظام ہوا ہے جی، گاؤں جائے گا؟ بس جائے گی؟ کب جائے گی؟"

"جس دن بس جائے گی، میں آپ کو خبر دوں گا۔ ویسے یہ کام میرا نہیں ہے۔ لالہ دیوراج۔۔۔۔"

"ہمارا کام ہو جائے گا نا!" پھر اپنا منھ بابو کے کان کے اور نزدیک لے جاکر بولا: "میں تمھارا منھ بھی میٹھا کرا دوں گا۔"

اس پر بابو نے ذرا جھنجھلا کر کہا: "او سردار جی، کوئی عقل کی بات کیا کرو۔ کنوئیں میں کم سے کم 27 عورتیں ڈوب مری ہیں۔ ان میں تم کیسے پہچان لوگے کہ تمھاری گھر والی کونسی ہے؟"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو ویر جی۔ میں کڑے دیکھ کر ہی پہچان لوں گا پانچ پانچ تولے کا ایک ایک کڑا ہے۔ گلے میں سونے کی زنجیر ہے۔ اب گھر والی ڈوب مری، جو سب کے ساتھ ہوئی ہے وہی میرے ساتھ بھی ہوئی ہے۔ مگر یہ کڑے اور زنجیر میں کیسے چھوڑ دوں؟ کیوں ویر جی؟"

پھر منھ کان کے پاس لے جاکر بولا: "جو اتروا دو، تو تمھیں بھی حصّہ دے دوں گا۔ ایسی بات نہیں ہے۔۔۔۔ اس نیک بخت نے یہ بھی نہیں سوچا کہ بھئی میں تو ڈوبنے لگی ہوں۔ میں اپنے کڑے تو اتار کر دیتی جاؤں! کیوں ویر جی؟ مگر ہم تمھارا منھ میٹھا کرا دیں گے۔ آپ ہمارا یہ کام کروا دو۔"

پھر ذرا ہٹ کر بابو کے منھ کی طرف دیکھتا رہا۔ "اور کسی کو پتہ نہیں چلے، میں اور آپ! بس میں اور کسی کو لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"او سردار جی، لاشیں پھول کر اوپر تک آگئی ہیں۔ پھولی ہوئی لاشوں کی کلائی پر سے آپ کڑے اتار سکتے ہیں؟ کوئی عقل کی بات کیا کرو۔ کیا سرکار آپ کو اتارنے دے گی؟"

"کیوں جی، بی بی میری ہے، مال میرا ہے۔ کڑے اپنے پیسوں سے بنوائے تھے، کسی کے چوری نہیں کیے۔ چھینی ہتھوڑی ساتھ میں لے کر چلیں گے۔ کہو گے کسی سنار کا چھوکرا بھی ساتھ لے لیں گے۔ منٹوں میں کام ہو جائے گا۔ کام کرنے کی نیت ہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

"او سردار جی، کچھ سوچ سمجھ کر بات کرو۔ میں صرف اعداد و شمار اکٹھے کرتا ہوں۔ مالی

نقصان کی فہرست میں، میں نے آپ کی بیوی کے کڑے اور زنجیر درج کر لی ہے۔ مال برآمد کرنے کا کام میرا نہیں ہے ۔۔۔۔"

اس پر سردار نے بابو کا ہاتھ پکڑ لیا:" ناراض نہیں ہوو، ناراض نہیں ہوتے بابو جی، دنیا کے کام چلتے ہی رہتے ہیں۔" پھر بابو کے ساتھ سٹ کر کھڑا ہو گیا اور بابو کے دائیں ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی تین انگلیوں کو الگ الگ گنتے ہوئے بولا: "کیوں ؟ ٹھیک ہے ؟ منظور ہے نا؟" (تین انگلیاں پکڑنے کا مطلب تھا، تین بیسی یعنی ساٹھ روپے)

" سردار جی، کیوں اپنا وقت ضایع کر رہے ہو ؟ میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

اس پر سردار بابو کی انگلیاں چھوڑ اس کے چہرے کو دیر تک گھورتا رہا۔ پھر اپنی چادر کندھے پر سنبھالتا ہوا سیڑھیوں کی طرف مڑ گیا۔ سیڑھیوں کے پاس پہنچ کر پھر کھڑا ہو گیا۔

" او بابو! کیوں ؟" اور ہاتھ اوپر اٹھا کر اس نے چار انگلیاں دکھائیں۔" کیوں منظور ہے؟"

بابو نے منھ پھیر لیا۔ تھوڑی دیر بعد سردار کی آواز آئی: " کچھ تو رحم کرو ہم لوگوں پر، ہم برباد ہو کر آئے ہیں۔"

بابو نے پلٹ کر دیکھا تو وہ سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد بابو خود سیڑھیاں اتر کر آنگن میں آ گیا۔ میز پر زیادہ دیر تک بیٹھے رہنا اس کے لیے ناممکن ہو جاتا تھا۔ شام تک دفتر میں رہنا ضروری ہوتا تھا، کیوں کہ دن بھر کی تفصیل کا شام کے وقت جوڑ لگایا جاتا تھا اور پھر ان کی ایک نقل اخبار کے نمائندے کو بھیجی جاتی ایک کانگرس کے دفتر میں اور ایک فائل میں۔ موت کے آنکڑوں میں انیس بیس کا فرق ہوتا۔ کہیں دو مسلمان زیادہ تو کہیں دو ہندو کم۔ مالی نقصان ہندوؤں اور سکھوں کا ہوا تھا۔ کل شام دیو دت آیا تھا۔ پوچھنے لگا: " آج کیا جوڑ نکلا ؟"

" آج تحصیل نور پور کے کچھ آنکڑے ملے ہیں۔ مرنے والوں کی تعداد میں زیادہ فرق نہیں۔ جتنے ہندو سکھ، لگ بھگ اتنے ہی مسلمان۔"

دیو دت رجسٹر ہاتھ میں لے کر اس کے ورق پلٹتا رہا۔ پھر اسے لوٹاتے ہوئے بولا: "صفحوں پر ایک خانہ اور بڑھا لو۔ غریب کتنے مرے اور کھاتے پیتے کتنے مرے۔"

" اس میں کیا تک ہے؟ تم ہر بات میں امیر غریب کو گھسیٹ لاتے ہو۔"

"یہ بھی ایک پہلو ہے اعداد و شمار اکٹھے کرنے کا دونوں طرف سے غریب کتنے مرے۔ امیر کتنے مرے۔ اس سے بھی تمھیں کئی باتوں کا پتہ چلے گا۔"

آنگن پار کرتے وقت آنکڑا بابو کی آنکھیں کئی لوگوں کو پہچاننے لگی ہیں۔ سیڑھیاں اترتے ہی دائیں ہاتھ وہ لڑکی روز کی طرح پھر رہی تھی جس کے منگیتر کا پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔ وہ تینوں اسپتالوں کے چکر کاٹ آئی تھی مگر کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ تھوڑا آگے، وہی ہرنام سنگھ دونالی بندوق والا، اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آنکڑا بابو نے منھ پھیر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ نگاہیں ملتے ہی وہ پھر اپنی بندوق کے لیے مغز پچی کرنے لگے گا۔

چبوترے پر ایک طرف کچھ کانگریسی کارکن بیٹھے آپس میں بحث کر رہے تھے۔ کشمیری لال کہہ رہا تھا: "تم میرے سوال کا سیدھا جواب دو۔ اگر مجھ پر کوئی حملہ کرے تو میں اس وقت کیا کروں؟ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دوں کہ مجھے مار ڈالے، کیوں کہ میں تو اہنسا میں یقین رکھتا ہوں؟"

"چڑیا جتنی تو تیری جان ہے۔ تجھ پر حملہ کر کے کسی نے کیا لینا ہے؟" شنکر نے مذاق کیا۔

"کیوں؟ حملہ کیا پہلوان پر کیا جاتا ہے؟ حملہ ہمیشہ کمزور لوگوں پر کیا جاتا ہے۔" جیت سنگھ نے کہا۔

"یہ مذاق نہیں ہے۔" کشمیری لال نے پھر کہا "میں جاننا چاہتا ہوں کہ ایسے وقت میں اہنسا کیا کہتی ہے۔ میں کیا کروں؟"

اس نے بخشی جی کو مخاطب کر کے کہا مگر بخشی جی اس کے سوال کی طرف کوئی دھیان نہیں دے رہے تھے۔

"میں آپ سے پوچھ رہا ہوں، بخشی جی، بات کو ٹالیے نہیں۔"

"کیا ہے؟ پوچھ، کیا پوچھنا ہے؟"

"باپو نے کہا کہ ہنسا (تشدّد) نہ کرو۔ اب فساد کے دوران مجھ پر کوئی حملہ کر دے تو میں کیا کروں؟ کیا اس وقت میں حملہ آور کے سامنے ہاتھ جوڑ دوں۔ ـــــ مار لے بھائی، گردن جھکا دوں، کاٹ لے بھائی گردن۔ کیا کروں؟" شنکر بیچ میں بول پڑا، "گاندھی جی نے کہا ہے، خود تشدد نہ کرو۔ گاندھی جی نے یہ کہیں نہیں کہا کہ کوئی تم پر حملہ کرے تو تم اس کا جواب بھی نہیں دو۔"

"پھر میں کیا کروں؟"

"اگر کوئی تم پر حملہ کرے تو تو اس سے کہنا، ٹھہر، میں کانگریس کے دفتر سے پوچھ آؤں کہ مجھے اپنا بچاؤ کرنا ہے یا نہیں۔" جیت سنگھ بولا

"باپو نے ہنسا کرنے سے منع کیا ہے۔ اس وقت تم اسے سمجھاؤ کہ وہ کچھ کر رہا ہے، بہت بُرا کر رہا ہے۔"

"میں کہتا ہوں، ڈٹ کر مقابلہ کرو۔" ماسٹر رام داس بولا۔

"ڈٹ کر مقابلہ کس چیز سے کروں؟ میرے گھر میں تو بس چرخہ ہی ہے۔"

"اور تو خود سب سے بڑا چرخہ ہے، جو فسادوں کے بعد اس معاملے کو لے کر بیٹھا ہے۔"

"تم مذاق میں ٹال رہے ہو۔ مگر بات بڑی سنجیدہ ہے۔" جیت سنگھ نے کہا۔

"سنو برخوردار۔" بخشی جی کافی دیر تک سنتے رہنے کے بعد دھیمی آواز میں بولے۔ ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "جرنیل کو اس قسم کا کوئی تذبذب نہیں تھا۔ اسے اپنے بچاؤ کے لیے کبھی پریشانی نہیں ہوئی۔ جرنیل سنکی تھا، ان پڑھ تھا، لیکن اسے اس بات نے کبھی پریشان نہیں کیا کہ اگر کسی نے اس پر حملہ کیا تو وہ کیا کرے گا؟ ..."

سبھی چپ ہو گئے۔ جرنیل کے چلے جانے سے سب کے دل کو ٹھیس پہنچی تھی۔

"مگر یہ سب جذباتی باتیں ہیں۔" کشمیری لال تھوڑی دیر کے بعد بولا۔ "سنو"، بخشی جی پھر بولے۔ "تو خود تشدد نہ کر، نمبر ایک۔ تو تشدد کرنے والے کو سمجھا بھی اگر سمجھانے کا موقعہ ہے تو، نمبر دو۔ اور اگر وہ نہیں مانتا تو ڈٹ کر مقابلہ کر۔ یہ ہے نمبر تین۔"

"بات ہوئی نا! اسے کہتے ہیں جواب۔ تسلی ہو گئی نا کشمیری لال اب چپ ہو جا۔"

مگر کشمیری لال بولے جا رہا تھا: "کس کے ساتھ مقابلہ کروں؟ چرخے سے!"

"چرخے سے کیوں! تلوار سے!"، جیت سنگھ بولا۔

"تلوار رکھنے کی اجازت ہے نا مجھے! کیوں بخشی جی؟"

بخشی جی چپ!

"اور پستول رکھنے کی بھی؟"

"پستول میں تشدد بہت ہے۔" شنکر نے ٹکڑا لگایا۔

"تلوار میں کم ہے۔"

"ہاں، تلوار میں تو اپنی طاقت لگتی ہے نا۔ پستولوں میں تو بس گھوڑا دباتے جاؤ اور

مارتے جاؤ۔"

"پھر میں تلوار رکھ لوں نا؟ کیوں بخشی جی؟"

بخشی جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بولتے تو شاید پھر جرنیل ہی کی مثال دیتے۔ آنکڑا بابو آگے بڑھ گیا۔ فسادوں کے بعد یہ بحث سچ مچ بڑی بے تکی لگ رہی تھی۔

دنگے اور فساد کا جوار بھاٹا بہت کچھ ختم ہو چکا تھا اور نیچے سے کچھیاں، چیتھڑے اور ہڈیاں ابھر کر سامنے آنے لگی تھیں۔

برآمدے کی طرف نکلنے والے دروازے کے پاس دس بارہ آدمیوں کے ایک گروپ میں ہنسی مذاق چل رہا تھا۔ بابو رک گیا۔ اس گروپ کے بیچ و بیچ بڑی عمر اور ناٹے قد کا ایک سکھ لیٹا ہوا تھا۔ کھچڑی گھنی مونچھیں داڑھی میں اس کی ہنستی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ کسی بات پر وہ ہنس رہا تھا اور بچے کی طرح اپنی ٹانگیں جھٹکتے اور ایڑیاں زمین پر ٹکراتے ہوئے ہنس رہا تھا۔ آس پاس کھڑے لوگ بھی جو اس کے دوست اور رشتہ دار تھے، ہنس رہے تھے۔

"اپنے گاؤں چلوگے ننھا سنگھ؟"

اس پر زمین پر لیٹے ننھا سنگھ نے اپنی ٹانگیں دوہری کر لیں اور کروٹ بدل کر ایک پہلو ہو گیا اور اپنے دونوں ہاتھ رانوں کے بیچ میں دبا لیے۔

"نی جانا۔" (نہیں جاؤں گا۔)

"کیوں نہیں جانا؟"

"نی جانا۔" اس نے بچوں کی طرح سر جھٹک کر کہا۔

اس نے اپنی جھانگوں میں اپنے ہاتھ اور کس کر باندھ لیے اور گھٹنے جوڑ لیے۔ آس پاس بیٹھے لوگ ہنسنے لگے۔ بابو کو لگا، جیسے یہ سوال اس کے سامنے بار بار دوہرایا جا چکا ہے۔ اب وہ ایک طرح کا کھیل بن چکا ہے۔

"کیوں نہیں جانا؟"

"نی جانا۔" اس نے کہا اور اپنی رانیں اور کس لیں اور بچوں کی طرح دائیں بائیں سر ہلانے لگا۔

"پر کیوں نہیں جانا؟ کوئی وجہ؟"

" اتھے سنتی کرے ایں۔" (وہاں سنت (ختنہ) کرتے ہیں۔)

اور وہ خود ہنسنے لگا اور جانگھوں کو زیادہ سیکڑ کر کروٹ بدل لی سبھی کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

برآمدے کے پار، آنگن کے ایک طرف اسکول کے چپراسی کا کمرہ پڑتا تھا۔ روز کی طرح آج بھی چپراسی کا رشتہ دار اپنی پنڈتانی کے ساتھ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ پہلے دن چپراسی اسے ساتھ لے کر بابو کے پاس آیا تھا۔ اس کی بیٹی لاپتہ ہو گئی تھی۔ وہ اور اس کی بیوی بہت روئے تھے اور اس کو ڈھونڈنے کے لیے ہاتھ جوڑ جوڑ کر گزارش کرتے رہے تھے۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا گاؤں میں ایک گاڑی بان نے اس لڑکی کو گھر میں بٹھا لیا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ اس کے پاس نہیں آئے۔

آنکڑا بابو چلتا ہوا پنڈت کے پاس پہنچ کر رک گیا۔

"کل صبح ایک بس نور پور جائے گی۔ ساتھ میں مسلح پولیس ہو گی۔ بیٹی کا پتہ لگانے کے لیے جانا ہو تو کل صبح چلے جانا۔ سرکاری آدمی ساتھ میں ہو گا۔"

پنڈت نے سر اٹھا کر اپنی گدلی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے بابو کی طرف دیکھا، پھر مایوسی سے سر ہلا دیا۔

"اب نہیں ملے گی جی، اب پر کا شو کہاں ملے گی!"

"مگر تم کہتے تھے کہ گاؤں کے کسی آدمی نے اسے گھر میں بٹھا لیا ہے۔"

"بھگوان جانے، کیا ہوا ہے اس کے ساتھ۔"

"کل اور لوگ بھی دوسرے گاؤں میں جائیں گے۔ پنڈتانی کیا کہتی ہو؟" پنڈتانی نے سر اٹھایا، پھر جیسے خلا میں دیکھتی ہوئی بولی "میں کیا کہوں گی بابوجی، وہ جہاں رہے سکھی رہے۔"

بابو کو اس جواب کی امید نہیں تھی۔ اس نے سمجھا، شاید ماں باپ گاؤں میں جانے سے ڈر رہے ہیں۔

"تم مجھے اتا پتا دو۔ میں پولیس والوں سے کہہ کر دریافت کرا لوں گا۔"

اس پر پنڈتانی نے کہا: "اب ہمارے پاس آکر وہ کیا کرے گی جی، گندی شے تو انھوں نے اس کے منھ میں پہلے ہی ڈلوا دی ہو گی۔"

پنڈت نے کہا: "ہم سے اپنی جان نہیں سنبھالی جاتی بابوجی۔ دو پیسے جیب میں نہیں ہیں، اسے کہاں سے کھلائیں گے، خود کیا کھائیں گے۔"

آنکڑے بابو اس قسم کے حالات سے آشنا ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ وہاں ٹھٹکا کھڑا رہا۔ پھر آگے بڑھ گیا۔

پر کاشو کو سچ مچ اللہ رکھا نے گھر میں بٹھا لیا تھا۔ گاؤں میں فساد ہونے پر ماں بیٹی پہاڑی کی تلہٹی میں لکڑیاں چن رہی تھیں۔ اللہ رکھا پہلے ہی سے دو تین آدمیوں کے ساتھ گھات لگائے بیٹھا تھا۔ موقعہ دیکھ کر وہ بھاگتے ہوئے آئے اور اللہ رکھا روتی چلاتی پر کاشو کو اٹھا کر لے گیا تھا۔
پہلی رات تو پر کاشو اندھیری کوٹھری میں پڑی رہی مگر دوسرے دن اللہ رکھا نے اس کے ساتھ نکاح کر لیا اور ایک نیا جوڑا بھی اس کے لیے گھیوں سے لے آیا۔ دو دن تک پر کاشو بھوکی پیاسی پڑی روتی رہی اور پتھرائی آنکھوں سے اس گھر کی دیواروں کو تکتی رہی تھی مگر تیسرے دن اس نے لسی کا کٹورا پی لیا تھا اور منھ بھی دھویا تھا۔ اسے بھوک بھی لگ آئی تھی۔ اس کے ماں باپ اب بھی سارا وقت اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتے رہتے تھے لیکن پر کاشو جانتی تھی کہ اللہ رکھا کے مقابلے میں وہ بہت ہی دبلے اور بہت ہی کمزور لوگ ہیں۔ اس کی آنکھیں دھیرے دھیرے اللہ رکھا کے گھر میں رکھی چیزوں پر جانے لگی تھیں۔ کوٹھری کے باہر آنگن میں گھوڑا بندھا تھا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر جھرجھری اٹھتی تھی، لہریاں سی اٹھتی تھیں۔ گھر کے باہر پیڑ کے نیچے اللہ رکھا کا ٹانگہ کھڑا رہتا تھا۔ پر کاشو نے پہلے بھی کئی بار اس ٹانگے کو دیکھا تھا۔ اصل میں اللہ رکھا کی نظر پر کاشو پر بہت دنوں سے تھی اور پر کاشو کو بھی اس کا احساس تھا۔ گاؤں میں آتے جاتے، جھرنے پر پانی بھرتے، کپڑے دھوتے اللہ رکھا اس پر آوازیں کسا کرتا تھا اور چھپ چھپا کر اس پر کنکر بھی مارا کرتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اللہ رکھا کنکر پھینکتا ہے مگر پر کاشو اپنے باپ سے شکایت نہیں کرتی تھی، کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ کچھ نہیں کر سکے گا۔ وہ اللہ رکھا سے بھی ڈرتی تھی اور اپنے باپ سے بھی ڈرتی تھی۔
اور پھر فسادوں میں اللہ رکھا چھٹپٹاتی روتی پر کاشو کو اٹھا کر اپنے گھر لانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس وقت جب ریلیف دفتر میں پر کاشو کی ماں رو رو کر اسے یاد کر رہی تھی اور اسے اپنے پاس لوٹا لانے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی، اسی وقت پر کاشو اللہ رکھا کے ڈر کے مارے نیا جوڑا پہنے اللہ رکھا کی کوٹھری میں چارپائی پر بیٹھی تھی۔ تبھی اللہ رکھا اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا تھا اور رومال میں بندھی پوٹلی کو اس کے سامنے چارپائی پر کھول کر کہا تھا:
"کھا!"
پر کاشو بس چارپائی کے پائینتانے کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ نہ ہوں، نہ ہاں۔ اس نے آنکھ اٹھا کر نہ تو اللہ رکھا کی طرف دیکھا تھا اور نہ رومال کی طرف۔
"کھا، مٹھائی ہے۔ سورنی دی بچیے کمی مٹھائی لیا واں تیرے واسطے۔"

(۔۔ سور کی بچی، کھا، تیرے لیے مٹھائی لایا ہوں ۔)

اس بار پرکاشو نے آنکھ اٹھا کر مٹھائی کو دیکھا، اللہ رکھا کی طرف دیکھنے کی اب بھی اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"کھا!" اللہ رکھا نے اچانک چلا کر کہا۔ پرکاشو سر سے پیر تک کانپ گئی۔

"مٹھا اے، سورے نیئے دھی اے، زہر نئیں۔"

(مٹھائی ہے سور کی بچی، زہر نہیں ہے۔)

اور اللہ رکھا نے سفید برفی کا ٹکڑا ہاتھ میں اٹھایا اور آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ سے پرکاشو کے گال پکڑ کر بھینچے جس سے پرکاشو کا منھ کھل گیا اور اس نے برفی کا ٹکڑا اس میں ٹھونس دیا۔

پرکاشو کو اللہ رکھا اس چیخ پکار کے پس پشت، لگاؤ کی بھنک مل گئی تھی مگر وہ ابھی بھی ڈری سہمی بیٹھی تھی۔ مسلمان کے ہاتھ سے وہ مٹھائی کیسے کھا لیتی؟

"ہندو حلوائی کی دوکان کی ہے سور نیے بچیے کھا!"

دھیرے دھیرے ڈر کی ماری پرکاشو مٹھائی کا ٹکڑا منھ میں چبانے لگی تھی۔ اسے منھ چلاتا دیکھ کر اللہ رکھا ہنس پڑا۔ بولا: "زہر ہے کہ مٹھائی؟"

پرکاشو کبھی مٹھائی چبانے لگتی اور کبھی منھ بند کر لیتی۔

"کھا!" ایسے وقت اللہ رکھا زور سے کہتا اور پرکاشو کا جبڑا پھر سے چلنے لگتا۔ پرکاشو کے بدن کی بو اللہ رکھا کو بے چین کرنے لگی تھی۔

"اپنے ہاتھ سے کھا!" اب اللہ رکھا کی آواز دھیمی پڑ گئی، "نہیں کھائے گی تو لٹا کر ساری مٹھائی تیرے منھ میں ٹھونس دوں گا۔ کھا!"

پرکاشو نے اس کی طرف دیکھا۔ اللہ رکھا کو اس نے پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا لیکن اتنے نزدیک سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی پتلی پتلی کالی مونچھیں اسے نظر آئیں۔ اللہ رکھا نے آنکھوں میں سرمہ بھی لگا رکھا تھا اور کپڑے بھی اجلے پہن رکھے تھے۔ بالوں میں تیل پڑا ہوا تھا۔

پرکاشو کا ڈر کچھ کم ہوا مگر باہر سے وہ اسی طرح ڈری سہمی بیٹھی رہی۔

"کھائے گی یا لٹا کر کھلاؤں؟" اللہ رکھا نے کہا اور اس کا بایاں ہاتھ پھر پرکاشو کی ٹھوڑی اور گالوں کو پکڑنے کے لیے اٹھا۔

دھیرے دھیرے پرکاشو کو لگا جیسے اس کے جسم میں سے اللہ رکھا کا خوف چھٹنے لگا ہے،

چھنتا جارہا ہے، چھنتا جارہا ہے۔ برفی کا ٹکڑا چباتے ہوئے اس نے پھر ایک بار اللہ رکھا کی طرف دیکھا۔ اس مرتبہ اس کی نظر اس کی گردن میں پڑے کالے دھاگے پر پڑی جس میں ایک تعویذ بندھا تھا۔ گلے کا ایک بٹن کھلا تھا۔ اس کی نظر اس کی دھاری دار قمیص پر بھی پڑی۔ اللہ رکھا بڑا صاف ستھرا بنا بیٹھا تھا۔

اللہ رکھا ہاتھ میں برفی کا ایک اور ٹکڑا اٹھائے ہوئے تھا، اس انتظار میں کہ پرکاشو کا منھ خالی ہو اور وہ ایک اور ٹکڑا اس کے منھ میں ڈال دے۔ پرکاشو کی آنکھیں بھی اس کے ہاتھ پر لگی تھیں۔ اچانک پرکاشو نے دھیمی آواز میں کہا: "تو کھا!"

اس جملے کا اثر اللہ رکھا پر جیسے بجلی کا سا ہوا۔

"بولی تو آخر!... کھا!"

"نہیں۔"

"کھا۔"

پرکاشو نے سر ہلایا۔ اللہ رکھا کو لگا کہ جیسے چاندنی سی مسکراہٹ پرکاشو کے ہونٹوں پر دوڑ گئی ہو۔ پرکاشو نے آنکھیں اٹھا کر اللہ رکھا کی طرف دیکھا۔

"تو کھلائے گی تو کھاؤں گا۔"

پرکاشو کی آنکھیں لمحہ بھر کے لیے اللہ رکھا کے چہرے پر ٹھٹکی رہیں، پھر اس نے ڈھیر سے مٹھائی کا ٹکڑا اٹھایا۔ ٹکڑے کو ہاتھ میں پکڑ لینے پر بھی وہ اس سے اٹھ نہیں رہا تھا۔ پرکاشو کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور ہاتھ کانپنے لگا تھا جیسے اسے اچانک احساس ہوا ہو کہ وہ کیا کر رہی ہے اور اس کے ماں باپ کو پتہ چلا تو وہ کیا کہیں گے۔ لیکن اس وقت امید بھری تقاضہ کرتی اللہ رکھا کی آنکھوں نے اسے دیکھا اور پرکاشو کا ہاتھ اللہ رکھا کے منھ تک جا پہنچا۔

دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کھلنے لگے تھے۔ اللہ رکھا نے آگے بڑھ کر اسے باہوں میں بھر لیا۔ ڈری سہمی رہتے ہوئے بھی، پرکاشو اس انوکھے تجربے میں حصہ لینے لگی تھی، اسے اپنانے لگی تھی۔ اسے لگتا جیسے ماضی پیچھے چھوٹتا جارہا ہے اور حال باہیں پھیلائے اسے آغوش میں بھرنے کے لیے بے قرار ہو رہا ہے۔ حالت اتنی بدل گئی تھی! اس کے زیر اثر ماں باپ گم ہوتے جارہے تھے۔

وہ دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ پڑے رہے۔ پرکاشو دیر تک چپ رہی۔ پھر جب اللہ رکھا

کی طرف اس کی پیٹھ تھی اور اس کی آنکھیں کوٹھری کی دیوار پر لگی تھیں تو وہ دھیرے سے بولی: "میں پانی لینے جاتی تھی تو مجھے کنکر کیوں مارتا تھا؟"

جواب میں اللہ رکھا نے اپنا ہاتھ اٹھا کر پرکاشو کی کمر پر رکھ دیا۔

"کنکر مارتا تھا کیوں کہ تو مجھ سے بولتی نہیں تھی۔"

"میں کیوں بولوں گی؟"

"اب بولتی ہے کہ نہیں؟"

پرکاشو چپ رہی، پھر دھیرے سے بولی: "میری ماں کہاں ہے؟"

"مجھے کیا معلوم تیری ماں کہاں ہے۔ گھر میں نہیں ہے!"

پرکاشو چپ رہی۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھی اور آنکھیں بھرنے لگیں۔ اسے یقین ہونے لگا کہ ماں باپ کہیں چھوٹ گئے ہیں اور اب کہیں بھی نہیں ملیں گے۔

"ہماری کوٹھری کو آگ لگائی تھی؟"

"نہیں۔ لوگ آگ لگانے لگے تھے مگر میں نے روک دیا۔ میں نے ادھر تالا لگا دیا ہے۔"

پرکاشو کو اس کا جواب اچھا لگا۔ اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ اٹھا کر کمر پر رکھے اللہ رکھا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

ریلیف آفس کے آنگن میں گھومتا ہر شخص اپنا خاص تجربہ لے کر آیا تھا۔ لیکن اس تجربے کو جانچنے، پرکھنے، اس میں سے ست نکالنے کی صلاحیت کسی میں نہیں تھی۔ خلا میں تاکنے اور سر ہلا ہلا کر کسی کی بات سنتے رہنے کے علاوہ کسی کو کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ ایک افواہ پھیلتی تو آنگن میں لوگ اٹھ اٹھ کر اسے سننے کے لیے جمع ہو جاتے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ کدھر جانا ہے۔ آگے کیا ہوگا۔ اس کی دھندلی سی لکیر بھی کسی کی آنکھوں کے سامنے نہیں تھی۔ لگتا، جیسے کوئی غیر قدرتی عمل چل رہا ہو جس پر کسی کا کوئی بس نہیں، نہ کسی کے ہاتھ میں انصاف ہے، نہ انتظام کی اہلیت۔ کٹھ پتلیوں کی طرح سب ہی گھوم رہے تھے۔ بھوک لگتی تو اٹھ کر اِدھر اُدھر سے کچھ کھا لیتے۔ یاد آتی تو رو دیتے اور کان لگائے صبح سے شام تک، لوگوں کی باتیں سنتے رہتے۔

21

امن کمیٹی کی میٹنگ کے لیے لوگ ہال میں اکٹھے ہو رہے تھے۔ یہی ایک جگہ چنی گئی تھی جس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا تھا، کیوں کہ کالج نہ ہندوؤں کا تھا نہ مسلمانوں کا تھا۔ کالج عیسائیوں کا تھا۔ پرنسپل بھی ہندوستانی نہیں تھا، امریکی پادری تھا۔ بڑا ملنسار، بڑا امن پسند۔ میٹنگ شروع ہونے میں ابھی دیر تھی۔ شہر کی سب ہی منتخب جماعتوں کے چیدہ چیدہ لوگ آنے والے تھے۔ جو لوگ پہنچ چکے تھے، وہ لمبے برآمدے میں دو دو تین تین کی ٹولیوں میں ٹہلتے ہوئے باتیں کر رہے تھے یا ہال کے اندر کھڑے اظہار خیال کر رہے تھے۔

ٹھگنا ٹھیکیدار شیخ نور الٰہی سے کہہ رہا تھا: "اگر خریدنے کا ارادہ ہے تو یہی وقت ہے۔ بعد میں قیمتیں چڑھ جائیں گی۔ مجھ سے پوچھ شیخ جی! میں ٹھیک کہتا ہوں۔ اگر خیال ہو تو بات کر دوں؟"

"کیا معلوم ابھی قیمتیں اور گریں؟" شیخ جی نے قیاس آرائی کی۔

"اس سے زیادہ اور کیا گریں گی؟" اسی علاقے میں، میں ۵۰۰ روپے احاطہ زمین، میں خود بیچ چکا ہوں۔ اب وہی احاطہ سات سو میں مل رہا ہے۔" پھر کہنی پکڑ کر منھ اونچا کر کے کہا: "شیخ جی، امن امان ہو جانے پر قیمتیں بڑھ جائیں گی یا کم ہوں گی؟"

"سوچوں گا۔"

"سوچیے، سوچیے مگر سوچتے ہی نہ رہ جائیے۔ پہلے بھی آپ اچھے اچھے سودے ہاتھ سے گنوا چکے ہیں۔"

شہر میں فساد ہونے کے بعد ایک لہر سی چل پڑی تھی کہ جس علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں سے ہندو سکھ نکلنے لگے تھے اور جن علاقوں میں ہندو سکھوں کی اکثریت تھی، وہاں سے

مسلمان گھر بار بیچ کر نکل جانا چاہتے تھے۔

"آپ اپنا دل پکا کریں، میں سو پچاس اور کم کرا دوں گا۔ یہاں سودا اچھا ہے، پھر نہیں ملے گا۔ آپ یہی چاہتے ہیں، مسلمانی علاقہ ہو اور مکان لب سڑک ہو؟"

"اچھی بات ہے جلدی خبر کروں گا۔"

اگر شیخ نور الٰہی دو منٹ اور وہاں کھڑا رہتا تو سودا پکا ہو جاتا۔ مگر وہ جیسے تیسے باز وچھڑا کر ٹھیکیدار منشی رام کے پنجے سے نکل گیا اور میونسپل کے کچھ ممبروں کے ساتھ جا ملا۔ منشی رام کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے سرکتا ہوا بابو پرکھمی چند کے پاس جا پہنچا:

"آپ کے ساتھ والا مکان بکاؤ ہے؟"

"وہ مکان کہاں ہے، کچا ڈربا ہے۔"

"ڈربا ہے، تو بھی ہیں کہوں گا لے لو۔ کوڑیوں کے مول مل رہا ہے۔ ساتھ ملا لوگے تو مکان خوب کشادہ ہو جائے گا۔"

"اور اگر پاکستان بن گیا تو؟"

"چھوڑو بادشاہ، یہ سیاست دانوں کے چونچلے ہیں۔ بن بھی گیا تو کیا ہوگا۔ لوگ تو یہیں رہیں گے۔ کہیں بھاگے تو جا نہیں رہے۔۔۔"

منشی رام نہیں چاہتا تھا کہ آج کا دن کسی سودے سے خالی جائے۔ ایک جگہ پر اتنی دولت اور پیسے والے لوگ کہاں ملتے ہیں۔

بابو پرکھمی چند نے پیشین گوئی کرتے ہوئے کہا: "امن امان ہو گیا تو اپنا محلہ چھوڑ کر کوئی نہیں جائے گا۔"

"کیا باتیں کرتے ہو بابو جی۔ اب یہ خیال ہی دماغ سے نکال دو۔ اب ہندوؤں کے محلے میں نہ تو کوئی مسلمان رہے گا اور نہ مسلمانوں کے محلے میں کوئی ہندو۔ اسے پتھر پر لکیر سمجھو۔ پاکستان بنے یا نہ بنے، محلے اب الگ الگ ہوں گے، صاف بات ہے۔"

لالہ لکشمی نارائن دور سے آتے دکھائی دیے تو شیخ نور الٰہی نے چٹکی لی: "آ گیا ہے کراڑ!"

آس پاس کھڑے لوگ ہنس دیے۔ شیخ نور الٰہی اور لالہ لکشمی نارائن کے بیچ بے تکلفی تھی۔ دونوں نے شہر کے مشن اسکول میں ایک ساتھ پڑھا تھا۔ دونوں کپڑے کی تجارت

کرتے تھے۔

"کراڑ کا کوئی بھروسہ نہیں، کیوں کراڑا؟"

انھیں اتنے پیار سے ملتے دیکھ، ایک طرف کھڑا سردار موہن سنگھ اپنے ہی ساتھی سے بولا: "ہم سب کو یہیں رہنا ہے۔ جنون سر پر چڑھ جائے لیکن سچ بات یہی ہے کہ ہم سب کو یہیں رہنا ہے۔ معمولی لڑائی جھگڑوں کی کوئی بات نہیں۔ یوں تو گھر کے برتن بھی ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں، ہم سایوں کے آپس میں جھگڑے ہوتے رہتے ہیں لیکن رہنا تو ہم سب کو یہیں پر ہے۔ ہم سایہ تو اپنا دایاں بازو ہوتا ہے۔"

شیخ اور نارائن دونوں بغل گیر ہو گئے۔ اندر ہی اندر دونوں کٹر مذہبی تھے مگر ایک ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے تھے اس لیے دوستی بھی تھی، میل ملاپ بھی تھا، ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں تھوڑا بہت شریک بھی ہوتے تھے۔ شیخ نور الٰہی کے جملے میں مذاق کہاں تک تھا اور ہندوؤں کے لیے نفرت کہاں تک بھری ہوئی تھی، کہنا مشکل تھا۔

شیخ پھر دھیرے سے لکشمی نارائن سے بولا: "تیری گانٹھیں میں نے گودام میں سے اٹھوا دی تھیں۔"

لکشمی نارائن مسکرا دیا۔ شیخ نور الٰہی اپنے مذاقیہ انداز میں بولا: "پہلے تو میں نے کہا، جلنے دو کراڑ کا مال، پھر دل میں آیا نہیں یار، آخر تو دوست ہے میرا۔۔۔"

آس پاس کھڑے لوگوں کو دوستوں کا یہ ملنا بھلا لگ رہا تھا۔ نور الٰہی کہے جا رہا تھا: "پہلے تو بیٹے کو مزدور ہی نہیں ملے۔ اس رات کہاں سے ملتے؟ میں نے اس سے کہا، جیسے بھی ہو گانٹھیں اٹھوا دو، نہیں تو لالہ مجھے جینے نہیں دے گا۔ پکڑ لایا پھر کہیں سے وہ دو مزدور۔"

اس پر دونوں ہنس دیے۔

یہ ہنسی مذاق اپنی جگہ ٹھیک تھا۔ اس کے ساتھ نظر کا لحاظ تھا۔ لیکن سچے گہرے جذبات نہیں تھے۔ ایک طرح کا دکھاوا تھا جو بڑی عمر کے مطلبی لوگوں میں آجاتا ہے۔ اندر ہی اندر کھچاؤ بھی تھا، نفرت بھی تھی لیکن دونوں تاجر تھے، خوش اخلاق تھے، اپنے لیے ایک دوسرے کی ضرورت کو سمجھتے تھے۔

کھمبے کے نیچے کھڑا حیات بخش کسی شہر کی خوبصورتی کا ذکر کر رہا تھا:

"ایسا خوبصورت شہر سردار جی، جیسے دلہن کھڑی ہو۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "شام کو جب روشنی ہو تو چاروں

طرف جگ مگ، سمندر کا کنارہ، ایسا خوبصورت، اس کی سج دھج آپ کو کیا بتاؤں، صاف ستھری سڑکیں دیکھتے آنکھیں نہیں بھرتی تھیں۔"

"کس شہر کی تعریف ہو رہی ہے، حیات بخش؟"

"رنگون، رنگون۔ بہت بڑھیا شہر ہے۔ لام کے دنوں میں، میں وہاں گیا تھا۔ واہ، کیا بتاؤں تمھیں؟"

آپس میں ملنے والے مختلف طبقوں کے لوگ جان بوجھ کر فسادوں کا تذکرہ نہیں کر رہے تھے ورنہ جلتے گاؤں، جلتی اناج منڈی کی سرزمین پر کسی دلہن جیسی سندر نگری کا تذکرہ کوئی کیوں کرتا!

دوسری طرف لالہ پرتھمی چند اپنے گروپ میں اپنی تیکھی تیلی آواز میں کہہ رہا تھا: "میں نے انھیں سمجھایا۔ میں نے کہا، اوئے بے وقوفو، گلی کے منھ پر لوہے کا پھاٹک بنا دینے سے کیا تم بچ جاؤ گے؟ اوئے کوئی عقل کی بات کرو۔ باہر کا آدمی اندر نہیں آسکے گا تو اندر کا باہر بھی تو نہیں جاسکے گا۔ گیٹ بنا کر تم خود کو قید کر لو گے۔"

ایک طرف کانگرس کے ممبر لالہ شیام لال آنکڑا بابو کو دھکیلتے ہوئے ایک طرف لے جا رہے تھے: "ایک بات کا خیال تمھیں کرنا ہے، بیٹا، آؤ، ادھر بنچ پر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

دونوں بیٹھ گئے۔ لالہ جی اپنا منھ آنکڑا بابو کے کان کے پاس لے جا کر بولے: "میونسپل کمیٹی کے چناؤ میں ہمارے وارڈ میں سے کانگرس کے ٹکٹ پر کون کھڑا ہو رہا ہے؟"

"مجھے تو معلوم نہیں لالہ جی۔ ابھی تو سب ہی لوگ ریلیف کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔"

"سبھی لوگ تو نہیں، خیر تم ریلیف کے کام میں ضرور لگے رہو۔ پھر بھی تم نے کچھ سنا تو ہو گا؟"

"میں نے تو کچھ نہیں سنا لالہ جی، لیکن ان حالات میں کمیٹی کے چناؤ ہوں گے بھی یا نہیں، مجھے شک ہے۔"

"دنیا کے کام، بیٹا، کبھی بند ہوئے ہیں؟ میں ڈپٹی کمشنر سے مل چکا ہوں۔ دو مہینے بعد چناؤ ہوں گے۔ نام داخل کرنے کی تاریخ پندرہ جون رکھی گئی ہے۔ اسی لیے اب زیادہ وقت نہیں رہ گیا ہے۔"

"مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں لالہ جی۔"

"دنیا میں آنکھیں کھول کر چلتے ہیں بیٹا۔ اب ہم لوگ تو زیادہ وقت بیٹھے نہیں رہیں گے۔ تم

نوجوانوں کو ہی دنیا کے کام سنبھالنے ہیں۔" پھر آنکڑا بابو کے کان کے پاس منھ لے جاکر کہا:

"میں چناؤ لڑ رہا ہوں۔"

بابو نے لالہ جی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"میں نے سنا ہے کانگرس منگل سین کو ٹکٹ دے رہی ہے۔" لالہ جی نے کہا۔

"مگر لالہ جی، آپ کو کانگرس ٹکٹ کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

لیکن سوال پوچھتے ہی آنکڑا بابو حالات کو سمجھ گیا۔ اگر کوئی ہندو اب چناؤ کے لیے کھڑا ہوگا تو اسے کانگرس کی سپورٹ کی ضرورت ہوگی اور اگر کوئی مسلمان کھڑا ہوگا تو اسے مسلم لیگ کی سرپرستی چاہیئے ہوگی۔ لوگوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ کانگرس ہندوؤں کی جماعت ہے۔ لالہ شیام لال کا تعلق کانگرس سے اتنا ہی تھا کہ وہ ایسا کپڑا پہنتے تھے جو دور سے کھادی نظر آتا تھا۔

"کانگرس ایسے لوگوں کو ٹکٹ دے گی تو بدنام نہیں ہوگی؟" پھر بابو کے کان کے پاس منھ لے جاکر بولے: "جوئے کے اڈّے چلاتا ہے۔ دو اڈّے ہیں اس کے۔ پولیس والوں کے ساتھ مل کر اڈّے چلاتا ہے۔ اب شہر میں گاندھی جی آئیں، نہرو جی آئیں اور ان کے آگے وہ ناچتا پھرے، تو اس سے وہ کانگریسی ہو جاتا ہے؟ کھادی وہ نہیں پہنتا۔۔۔"

"پہنتا ہے۔" آنکڑا بابو بیچ میں بول اٹھا۔

"اب پہننے لگا ہے، پچھلے دو سال سے۔ پہلے کہاں پہنتا تھا؟ اس کے گھر میں کون کھادی پہنتا ہے؟"

بابو جی کی ہمدردانہ رجحان دیکھ کر لالہ جی بولے جا رہے تھے: "بیر پیتا ہے۔ اگر اعتبار نہ ہو تو کمپنی باغ کے کلب میں جاکر دیکھ لو۔ اس کا باپ بھی عیبی تھا، وہ بھی عیبی ہے۔" پھر لالہ شیام لال نے ناک چڑھا کر کہا: "اسے بھگندر ہو گیا تھا۔ وہ بھگندر سے مرا تھا۔ یہ بھی بھگندر سے ہی مرے گا۔"

آنکڑا بابو نہیں جانتا تھا کہ بھگندر کیا بلا ہوتی ہے، مگر وہ حیران تھا کہ لالہ جی منگل سین پر کیوں اتنا غصّہ نکال رہے ہیں۔

"میں اس کی پول کھولنے لگوں تو ایک دن میں ننگا ہو جائے۔ مگر میں کہتا ہوں، سبھا سوسائٹی میں سب ہی کو جینا ہے۔ وہ جانے اور اس کا کام۔ مگر فریب اور جھوٹ کے ساتھ اسے دھوکا تو نہ دے۔"

"مگر لالہ جی، منگل سین ضلع کمیٹی کا ممبر ہے جبکہ آپ کانگرس کے چونی ممبر نہیں ہیں۔ آپ کو ٹکٹ کیسے مل سکتا ہے؟"

"ٹکٹ مانگتا ہی کون ہے؟ میں تو صرف اتنا ہی چاہتا ہوں کہ اس وارڈ کے لیے کانگرس کسی کو بھی ٹکٹ نہ دے۔ آزادانہ طور پر کوئی بھی کھڑا ہو جائے۔۔۔"

ادھر لالہ لکشمی نارائن، حیات بخش سے کسی دوا کے بارے میں پوچھ تاچھ کر رہا تھا۔ حیات بخش کو بہت سے جڑی بوٹیوں کے نام معلوم تھے۔ پتھری کے لیے وہ خود دوا تیار کرتا تھا اور مفت بانٹتا تھا۔ البتہ نسخہ نہیں بتاتا تھا کیوں کہ اس سے دوا کی تاثیر جاتی رہتی ہے۔

رن ویر کو بھاگتے وقت چوٹ آ گئی تھی۔ نالی میں پیر پڑ جانے سے بری طرح سے موچ آ گئی تھی اور گھٹنے بھی چھل گئے تھے۔ حیات بخش سر ہلا ہلا کر سنتا رہا، پھر بولا: "نا نا تیل کی مالش نہیں، اس کی تاثیر ٹھنڈی ہوتی ہے۔ میرے پاس ایک تیل ہے، اشرف لاہور سے لایا تھا۔ اس سے نسیں ڈھیلی پڑیں گی، جلدی آرام آئے گا۔ یقینی بات ہے۔ میں بھیج دوں گا۔"

پھر آواز دھیمی کر کے بولا: "کیسے موچ آ گئی بیٹے کو؟" آواز کو اور دھیمی کر کے مزید کہا: "میں نے سنا ہے کسی دل بل میں بھی حصہ لیتا ہے۔ میری مانو، اسے کچھ دن کے لیے باہر بھیج دو۔ پکڑ دھکڑ کا ڈر ہے۔"

لالہ لکشمی نارائن کے کان کھڑے ہو گئے، مگر انھوں نے گھبراہٹ ظاہر نہیں ہونے دی۔

"پندرہ سال کا تو لڑکا ہے، وہ کیا حصہ لے گا؟"

لیکن دل ہی دل میں انھیں تجویز پسند آئی تھی۔ رن ویر کو کچھ دن کے لیے باہر بھیج دیں، یہی ٹھیک ہوگا۔

کالج کے دو چپراسی گیٹ کے پاس ایک بنچ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا: "ہم جاہل لوگ لڑتے ہیں، سمجھ دار، خاندانی لوگ نہیں لڑتے۔ یہاں سب ہی آئے ہیں، ہندو بھی، سکھ بھی، مسلمان بھی اور دیکھو کیسے پیار محبت سے باتیں کر رہے ہیں۔"

سیاسی لوگوں میں تقریباً سب ہی پہنچ چکے تھے۔ شاید بخشی جی کا انتظار تھا۔ سبھی مقامی لیڈروں کو دیو دت گھر گھر جا کر بلا لایا تھا۔ وہ بھی میٹنگ میں پہنچ چکا تھا اور اس بات کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوش تھا کہ لیگ اور کانگرس کے رہنماؤں کے ایک جگہ اکٹھا کرنے میں وہ پھر کامیاب ہو گیا ہے۔ اس کی فطری سمجھ بوجھ اس بات سے ظاہر ہوتی تھی کہ میٹنگ شروع ہوتے ہی

جلسے کی صدارت کے لیے اسی کالج کے پرنسپل لوکس صاحب کا نام تجویز کر دیا۔ لوکس امریکی تھے، عمر رسیدہ تھے، شہر کے لڑکوں کی تین پیڑھیوں کو پڑھا چکے تھے۔ انگریز بھی نہیں تھے، ناہی ہندو یا مسلمان تھے۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے بیچ وہ صدارت کی کرسی پر آکر بیٹھ گئے۔ سب ہی لوگ برآمدوں وغیرہ سے آ آکر ہال میں بیٹھنے لگے تھے۔ تبھی مسلم لیگ کے ایک نوجوان کارکن اور ایک کانگریسی کے درمیان بحث ہونے لگی۔ لیگی اچھل کر کھڑا ہو گیا:

"لے کے رہیں گے پاکستان! بخشی جی یہ فریب آپ چھوڑ دیں۔ ایک بار مان جائیے کہ کانگرس ہندوؤں کی جماعت ہے۔ اس کے بعد میں انھیں گلے لگا لوں گا۔ کانگرس مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کر سکتی۔"

فسادات سے پہلے بھی یہی جملے بار بار سننے کو ملتے تھے۔ اچانک نعرہ بلند ہوا:

"پاکستان —— زندہ باد۔"

اسی وقت دس آوازیں جگہ جگہ سے اٹھیں: "خاموش! خاموش!"

لوکس صاحب کہنے لگے: "میں سوچتا ہوں، اس وقت ہم سب مل کر، جیسے بھی ہو، شہر کی فضا کو بہتر بنائیں۔ یہاں شہر کے سب ہی بڑے بڑے لوگ موجود ہیں، ان کی آوازیں بڑا اثر ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ ایک امن کمیٹی بنائی جائے اور یہ امن کمیٹی ہر محلے میں، ہر گلی میں امن کی تشہیر کرے۔ اس میں سبھی سیاسی جماعتوں کے نمائندے شامل ہوں۔ اس کام کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ اگر ایک بس کا انتظام ہو سکے، جس پر لاؤڈ اسپیکر اور مائکروفون لگا دیے جائیں، اور کانگرس مسلم لیگ اور دوسری سیاسی جماعتوں کے نمائندے بیٹھ کر جگہ جگہ بس میں سے امن کی اپیل کریں تو اس کا بڑا اثر ہو گا۔"

تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے اس تجویز کا استقبال کیا گیا۔

اچانک ایک آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہ نواز تھا:

"بس کا انتظام میں کروں گا۔"

تالیوں کی پھر گڑگڑاہٹ ہوئی۔ دیودت نے سامنے آکر کہا: "ہمیں اطلاع ملی ہے کہ بس کا انتظام سرکار کی طرف سے کیا جا رہا ہے۔"

تالیوں کی پھر گڑگڑاہٹ ہوئی۔ شاہ نواز ابھی کھڑا تھا: "پٹرول کا سارا خرچ میں دوں گا۔"

" آفریں، آفریں، واہ وا!"

اس پر ایک شخص نے اٹھ کر کہا: " صاحبان! پروگرام طے کرنے سے پہلے کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم باقاعدہ امن کمیٹی قایم کر لیں، اس کے عہدیدار چُن لیں اور باضابطہ طور پر کام کریں۔"

یہاں چناؤ کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دیودت نے فوراً آگے بڑھ کر کہا: " میں تجویز کرتا ہوں کہ اس امن کمیٹی کے تین وائس پریزیڈنٹ منتخب کیے جائیں۔ میں جناب حیات بخش ..... "

" ٹھیریے، پہلے اس بات کا فیصلہ کر لیجیے کہ وائس پریزیڈنٹ تین ہوں یا کم یا زیادہ۔ میری تجویز ہے کہ وائس پریزیڈنٹ پانچ ہونے چاہییں۔ جتنے زیادہ وائس پریزیڈنٹ ہوں گے اتنی ہی امن کمیٹی زیادہ نمائندہ جماعت بنے گی۔"

اس پر ایک سردار جی بولے: "میں درخواست کروں گا کہ وائس پریزیڈنٹ آپ تین ہی رکھیں، ایک ہندو، ایک مسلمان بھائی، ایک سکھ۔ ایکزیکٹیو کو آپ بے شک بڑا کر لیں اور اس میں سب ہی کھل کر نمائندگی دیں۔"

" یہاں ہندو مسلمان کا سوال نہ لائیں، یہ امن کمیٹی ہے۔" دیودت پھر آگے بڑھ آیا: "میں درخواست کروں گا کہ سب ہی سیاسی پارٹیوں کے رکن اس میں شامل ہوں۔ میری تجویز ہے کہ جناب حیات بخش صاحب مسلم لیگ کی طرف سے، بخشی جی کانگرس کی طرف سے اور بھائی جودھ سنگھ گردوارہ پربندھک کمیٹی کی طرف سے وائس پریزیڈنٹ چنے جائیں۔"

ایک صاحب اٹھ کھڑے ہوئے: " اگر سیاسی پارٹیوں کے نمائندے منتخب کرنے ہیں تو پھر تینوں پارٹیوں کے صدر چنے جائیں۔ دوسرے نام نہ گنائے جائیں۔"

لالہ لکشمی نارائن اٹھ کر بولے: " مجھے یہ دیکھ کر از حد رنج ہو رہا ہے کہ آپ نے تین سیاسی پارٹیوں کے نام تو گنائے لیکن ہندو سبھا کو بالکل بھول گئے۔ کیا وہ سیاسی پارٹی نہیں ہے۔"

" نہیں، وہ سیاسی پارٹی نہیں ہے۔"

" اگر وہ سیاسی پارٹی نہیں ہے تو گردوارہ پربندھک کمیٹی بھی سیاسی پارٹی نہیں ہے۔"

پانچ سات لوگ ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے: "یہ سکھ قوم کی توہین ہے۔ گردوارہ پربندھک کمیٹی ہی سکھوں کی نمائندگی کرتی ہے۔"

دیودت لپک کر پھر سامنے آیا: "صاجان! اس طرح ہم کوئی کام نہیں کر سکیں گے۔ فرقہ وارانہ عناصر کے خلاف ہمیں لڑنا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر کسی کو نمائندگی ملے۔ ضروری یہ ہے کہ امن کمیٹی سب ہی فرقوں کی ایک مشترکہ جماعت بنے، تاکہ ہم ہندو مسلمان، سکھ عیسائی مل کر ایک پلیٹ فارم سے امن کی اپیل کر سکیں۔ اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں تجویز کرتا ہوں کہ جناب حیات بخش، بخشی جی اور گیانی جودھ سنگھ کو امن کمیٹی کے وائس پریزیڈنٹ چنا جائے۔"

"منظور ہے، ٹھیک ہے، چلو آگے۔" ایک آواز آئی۔ اس پر کسی نے تالی بجائی تو بہت سے لوگوں نے تالیاں بجادیں اور تجویز کی مخالفت کرنے والوں کو موقعہ نہیں ملا۔ تجویز متفقہ طور پر پاس کر دی گئی۔

اس پر ماسٹر رام داس نے اٹھ کر کہا: "جنرل سکریٹری کے لیے میں کامریڈ دیودت کا نام تجویز کرتا ہوں۔ ایک تو یہ اَن تھک محنت کر سکتے ہیں اور پھر ہم ان ہی کی کوششوں سے آج یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ اگلے کچھ دن نازک ہوں گے۔ امن کمیٹی کو بڑی ہوشیاری اور محنت سے کام کرنا ہوگا۔ اس کام کے لیے کامریڈ دیودت بڑے موزوں آدمی ہیں۔۔۔"

"کیا شہر میں سب نوجوان مر گئے ہیں؟" یہ منوہر لال تھا، آج بھی ایک طرف دیوار کے ساتھ چھاتی پر بازو باندھے پیچھے کھڑا تھا: "میں پوچھتا ہوں، کیا سرکار کے دم چھلے، قوم کے غدار کمیونسٹ ہی اس کام کے لیے رہ گئے ہیں؟ اور سب نوجوان مر گئے ہیں؟ یہ چناؤ ڈھونگ ہے۔ میں اس میٹنگ سے واک آؤٹ کرتا ہوں۔"

اور وہ مڑ کر باہر جانے لگا۔

"ٹھیر و یار، منوہر لال، کوئی کام ہونے دیا کرو۔"

منوہر لال اب بھی بگڑا ہوا تھا: "چھوڑو یار، ہم نے بہت دیکھے ہیں۔ منوہر لال سیدھا منھ پر کہتا ہے۔ وہ سگے باپ سے بھی نہیں ڈرتا۔۔۔"

کانگرس کے کچھ نوجوان ممبروں نے اسے روک لیا۔ ایک آدمی اسے کمر سے پکڑ کر میٹنگ میں لوٹا لایا۔

"سبھی سرکار کے پٹھو اکٹھے ہوئے ہیں۔ میں ان سب کو جانتا ہوں۔۔۔"

"خاموش! خاموش!"

"میں کامریڈ دیودت کے نام کی تائید کرتا ہوں۔"

"میں تائید مزید کرتا ہوں۔"

تالیوں کی گڑگڑاہٹ۔ کام پھر خوش اسلوبی سے چلنے لگا تھا۔ لیکن ایگزیکیٹو کمیٹی کے ممبروں کے چناؤ کے وقت ہر طرح کے نام تجویز کیے جانے لگے۔ لکشمی نارائن، مریاداس، شاہ نواز... تب بہت سے مسلمان ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ آگے آگے مولابخش جارہا تھا۔

"اس کمیٹی میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ ہم اس کمیٹی میں شامل نہیں ہوسکتے۔ ہمیں پہلے ہی معلوم تھا کہ یہ ہندوؤں کا ہتھکنڈا ہے..."

دس آدمی، دیودت سمیت، انھیں روکنے کے لیے گئے۔ دروازے پہ دیر تک ہنگامہ ہوتا رہا۔ آخر ایک فارمولے کی بنیاد پر ایگزیکیٹو کے انتخاب کا فیصلہ ہوا کہ اس میں کل پندرہ ممبر ہوں، سات مسلمان، پانچ ہندو، اور تین سکھ۔ دیر تک بحث ہوئی۔ بحث کے دوران لوگ تھکنے لگے تھے مگر آخر میں یہ فارمولا منظور ہوگیا اور اس میں لالہ لکشمی نارائن بھی شامل ہوگئے، لالہ منگل سین بھی، شاہ نواز بھی اور کتنے ہی اور لوگ۔ بے چارے شیام لال کا نام کسی نے نہیں لیا۔ وہ دیر تک آنکڑا بابو کا کوٹ کھینچتا رہا۔ آخر شیام لال خود اٹھ کھڑے ہوئے:

"میں درخواست کروں گا کہ مجھے بھی اس کمیٹی میں خدمت کرنے کا موقعہ دیا جائے۔"

"سیٹیں پوری کی جاچکی ہیں۔ بیٹھ جائیے۔" منگل سین نے کہا۔ پھر ایک اور صاحب اٹھے:

"میں سمجھتا ہوں، کوئی حرج نہیں ہے۔ ایک ہندو، ایک مسلمان اور ایک سکھ کمیٹی میں بڑھادیے جائیں۔"

"یہ نہیں ہوسکتا۔ اس طرح آپ کتنے لوگوں کو شامل کرتے جائیں گے۔" منگل سین پھر بولا۔

معاملہ ابھی طے نہیں ہوا تھا کہ بھونپو بجنے کی آواز آئی۔ دیودت صدر کی کرسی کے پاس جاکر بولا: "صاحبان! امن کی بس آگئی ہے۔ ہم اپنے پہلے دورے پر یہیں سے روانہ ہوں گے۔ میں گزارش کروں گا کہ اس میں پریزیڈنٹ اور وائس پریزیڈنٹ صاحبان اور ان کے ساتھ جتنے ساتھی اور چل سکتے ہوں، سبھی چلیں۔ بس میں لاؤڈ اسپیکر لگادیا گیا ہے۔ بس جگہ جگہ رکتی جائے گی اور باری باری سے ہمارے محترم بزرگ، شہر میں لوگوں کو امن قائم کرنے کی تاکید

کرتے جائیں گے۔"

لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر آنے لگے۔ گلابی اور سفید دھاریوں والی بس تھی، امن کی بس! آگے چھت پر دونوں کونوں میں کانگرس اور مسلم لیگ کے جھنڈے لگے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر کا ایک بھونپو آگے اور ایک پیچھے لگا تھا۔

"اس پر یونین جیک (انگریزوں کا جھنڈا) بھی لگا دیجیے۔" منوہر لال نے طنز سے کہا۔

لوگوں کے باہر آنے پر بس میں سے نعرے گونجنے لگے۔

"ہندو مسلم —— ایک ہو!"

"ہندو مسلم اتحاد —— زندہ باد!"

"امن کمیٹی —— زندہ باد!"

لوگوں نے جھانک جھانک کر بس کے اندر دیکھا۔ کون آدمی تھا جو پہلے سے بس میں بیٹھ کر آیا تھا اور لاؤڈ اسپیکر پر نعرے لگا رہا تھا۔ ڈرائیور کی پاس والی سیٹ پر ایک آدمی ہاتھ میں مائیکروفون پکڑے بیٹھا تھا۔ بہت لوگوں نے اسے نہیں پہچانا۔ کچھ نے پہچان بھی لیا۔ نتھو مر چکا تھا۔ اگر نتھو یہاں ہوتا تو اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگتی۔ مراد علی تھا۔ کالے چہرے اور کٹیلی مونچھوں والا مراد علی۔ اس کی پتلی سی چھڑی اس کی ٹانگوں کے بیچ پڑی تھی اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں دائیں بائیں دیکھے جا رہی تھیں۔ لاؤڈ اسپیکر میں سے نعرے گونج رہے تھے۔

امن کے مشن پر نکلنے سے پہلے چھوٹی سی بحث ہوئی۔ کون کس سیٹ پر بیٹھے۔ آگے کون اور پیچھے کون۔ پہلے کون بولے اور کون کون نعرے لگائے جائیں۔

آگے پیچھے نہیں، مسلم لیگ اور کانگرس کے صدر ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھے۔

کچھ دیر تک گڑبڑی رہی۔ بس کھچا کھچ بھر گئی کیوں کہ کچھ لوگ راستے میں اپنے اپنے گھر کے سامنے اتر جانا چاہتے تھے۔ منوہر لال آخر تک بگڑا ہی رہا! "اس بس میں یا تو میں بیٹھوں گا یا کمیونسٹ بیٹھے گا۔ میں ملک کے غدار کے ساتھ ہرگز نہیں بیٹھ سکتا۔"

بس کے پائیدان پر کھڑا دیو دت بولا: "منوہر لال صاحب، پردے کے پیچھے ہم کوئی بات نہیں کرتے۔ ہم کانگرس کی دُم نہیں ہیں۔ ہم پیشہ ور انقلابی ہیں۔ شہر میں امن قایم کرنا ضروری ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ سب ہی پارٹیوں کے لیڈروں کو اکٹھا کیا جائے۔ آپ کی پارٹی کے بھی، جس کے لیڈر بھی آپ ہی ہیں اور جنتا بھی آپ ہی ہیں۔ ہم بھی جانتے ہیں کون رجعت پسند ہے

مگر اس وقت شہر میں امن کے لیے انھیں ایک پلیٹ فارم پر لانا ضروری ہے۔"
"امن اب کیا کرواؤ گے؟" منوہر لال نے چڑ کر کہا، "امن تو تمھارے صاحب نے کروا دیا ہے۔ فساد کروانے کے بعد اب امن کروا رہا ہے۔"
شیام لال برآمدے میں کھڑے میونسپل چناؤ میں اپنی امیدواری کا ذکر ایک ایک سے کرتے رہے۔ اس دوران منگل سین بس میں کود کر بیٹھ گیا۔ بیٹھ ہی نہیں گیا، کافی آگے کی سیٹ پر جا بیٹھا اور اچانک اس پر نظر پڑنے پر شیام لال آگ بگولا ہو گیا اور بھاگتا ہوا آگے بڑھ آیا:
"مجھے کوئی نہیں بتاتا، مجھے کوئی نہیں بتاتا" کہتا اور لوگوں کو دھکیلتا، ہانپتا ہوا بس کے اندر چڑھ گیا۔
مسلم لیگ کے صدر کے ساتھ بیٹھے ہوئے بخشی جی سامنے کی طرف دیکھے جا رہے تھے مگر گہری اداسی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ "چیلیں اڑیں گی، ابھی اور اڑیں گی!" انھوں نے دل ہی دل میں کہا۔
تبھی ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے مراد علی نے پھر نعرے لگانے شروع کر دیے اور گونجتے نعروں کے بیچ امن کی بس اپنے امن مشن پر نکل پڑی۔

بنگلے میں، کھانے کے کمرے میں، ہلکی روشنی میں، میز پر آمنے سامنے بیٹھے رچرڈ اور لیزا اپنے اپنے خیالات میں گم تھے۔ لیزا پھر سے سنبھل گئی تھی، رچرڈ کو بھی آج زیادہ کام نہیں تھا شہر کی زندگی پٹری پر آ رہی تھی۔ چھوٹے افسروں نے کام سنبھال لیا تھا۔
"میں چاہتا تھا کہ یہاں کچھ دیر کے لیے رہتا۔ ٹیکسلا کے میوزیم میں تھوڑا کام کرتا، یہاں کے لوگوں کا مطالعہ کرتا لیکن معلوم ہوتا ہے، یہاں زیادہ دیر رہنا نہیں ہو سکے گا۔"
یہ بات سن کر لیزا کو دل ہی دل خوشی ہوئی: "تو تمھارا تبادلہ ہوگا؟ تمھاری ترقی ہوگی؟" رچرڈ مسکرا دیا۔ منھ سے کچھ نہ بولا۔
"تم بتاتے کیوں نہیں ہو؟ کیا سچ مچ تمھاری ترقی ہونے جا رہی ہے؟"
"ترقی کی بات نہیں ہے لیزا، جس جگہ دنگا فساد ہو جائے، وہاں سے عام طور پر سرکار افسروں کو تبدیل کر دیتی ہے۔ نئے افسر آ جاتے ہیں......"
"کیا جلدی ہی چلے جانا ہوگا؟"

"شاید! میں ٹھیک طرح سے نہیں جانتا۔"
"مگر تم تو یہاں رہنا چاہتے تھے نا۔ ٹیکسلا میوزیم میں کام کرنا چاہتے تھے۔ اپنی کتاب۔ لکھنا چاہتے تھے......؟"
رچرڈ نے کندھا ہلا دیا۔ پھر اس نے پائپ سلگایا اور میز کے نیچے ٹانگیں سرکا کر، تفریح کے موڈ میں مسکرا کر بولا "کہاں سے شروع کروں؟"
"کیا کہاں سے شروع کرو۔ رچرڈ؟" لیزا نے بھویں اٹھا کر پوچھا۔
"تم یہی جاننا چاہتی تھیں نا کہ یہاں پر کیا کچھ ہوا ہے!"
اب کی بار لیزا نے لاپرواہی سے شانے ہلا دیے، جیسے کہہ رہی ہو، سناؤ یا نہ سناؤ، کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

بھیشم ساہنی، جو ہندی کے مشہور و معروف ادیب ہیں، ان کا یہ تیسرا ناول ہے۔
اس سے پہلے ان کے دو ناول "جھروکے" اور "کڑیاں" شائع ہو چکے ہیں۔ یہ دونوں ہی
ناول سماجی، حقیقت نگاری اور نفسیاتی عکاسی کے امتزاج کو بڑی خوبی سے نمایاں کرتے
ہیں۔ بھیشم ساہنی، پریم چند کی قائم کردہ روایت کے امین ہیں اور "تمس" (تاریکیاں)
اسی روایت پر مبنی ایک اہم تخلیق ہے۔ "تمس" ان دونوں ناولوں سے مختلف اور وسیع تر
ہے۔ اس میں مصنف وقت اور زمانہ کے لحاظ سے کچھ پیچھے کی طرف مڑا ہے، اس میں حصولِ
آزادی سے کچھ پہلے کے زمانے کا انتخاب کیا گیا ہے اور اس کے بطن میں کلبلاتے
فرقہ وارانہ تعصب کے خوفناک واقعات اور ان کے راست اور بالواسطہ اثرات کی
نشان دہی کی گئی ہے۔ یہ ناول بنیادی طور پر سیاسی شعور کا ناول ہے لیکن سیاست کے
تانے بانے کے اندر بھی مصنف نے سماجی زندگی کے حقائق کی تہیں کھولی ہیں۔

بھیشم ساہنی خاص کہانی کار ہیں۔ وہ کہانی بہت سلیقے سے کہتے ہیں جس میں انوکھی
سادگی ہوتی ہے۔

"تمس" کے لیے بھیشم ساہنی کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔

Rs. 27-00

نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا